

اگست 2014

حکایت  
ماہنامہ



WWW.PAKSOCIETY.COM

سالانہ چندہ

رجسٹرڈ انٹرنیٹ

حکایت

ماہنامہ

پاکستان 800 روپے

7000 روپے

1

سعودی عرب، کویت، اردن، ایران، سری لنکا، ابو ظہبی، بحرین،  
دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور  
دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے،  
سویڈن، فرانس، ملائیشیا، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

7000 روپے

2

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ،  
نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

✎ غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے "وقاص شاہد" کے نام کا ڈرافٹ ہوا کریں۔  
✎ پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔  
✎ کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔  
✎ خط و کتابت اور بدل اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلی پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دینے کی۔

26- پیٹالہ گراؤنڈ، لنک میٹروڈ روڈ، لاہور۔ فون: 37356541-042

# نورِ مبین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کچھ شک نہیں تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند ستاروں کو پیدا کیا۔ سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو! سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے) یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔

(سورۃ الاعراف: آیت 54)

# حکایت

جلد: 43 اگست 2014ء شمارہ: 12

بانی  
عنایت اللہ  
شاہد بن عنایت اللہ  
مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد  
مدیر: عارف محمود  
منتظم: سعد شاہد

قانونی مشیر  
وقاص شاہد ایڈووکیٹ  
شعبہ تعلقات عامہ  
میاں محمد ابراہیم طاہر

سرکولیشن منیجر + شعبہ اشتہارات  
فضل رزاق + خرم اقبال  
عرفان جاوید + محمد اشفاق مومن  
کمپوزنگ  
محمد پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مجلس مشاورت  
ابدال بیلا  
عظمت فاروق  
میم الف  
ڈاکٹر شبیر حسین  
ڈاکٹر نصیر اے شیخ  
ڈاکٹر نعمت علی  
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

عارف محمود 0323-4329344  
وقاص شاہد 0321-4616461  
فضل رزاق 0343-4300564  
عرفان جاوید 0322-4847677

80 روپے

ہیڈ آفس

26- پیالہ گراؤنڈ لنگ میٹرو روڈ لاہور 042-37356541

Monthy\_hikayat@gmail.com  
primecomputer.biz@gmail.com

# اسرار شمارت میر

15	ساقی چیمہ	خصوصی فیچر لہو لہو امت مسلمہ جنگ بیتی
25	عمر افضل رحمانی	5: قطہ داستان ایک عامل کی جرم و سزا
43	عاشق حسین	ڈاکو اور ڈپٹی کمشنر
65	ونگیر شہزاد	ڈکیتی کے بعد
161	محمد رضوان قیوم	رنکا ڈاکو سلسلہ وار خول
49	رزاق شاہد کوہلر	6: قطہ دیروز ندائیں
209	امجد جویہ	8: قطہ دھوپ کے پگھلتے تک دلچسپ و عجیب
61	رانا محمد شاہد	ادھر ادھر سے علم و تحقیق
70	سکندر خان بلوچ	باعثِ ذلت
81	مجاہد ادیب شیخ	دینی اور تاریخی مغالطے لمحہ منکوبہ
75	ڈاکٹر مبشر حسن ملک	وردی کا تقدس معاشرت اور قانون
91	ایس امتیاز احمد	مجھے طلاق چاہیے فاطیما فدا موش
97	ٹی آئی سامر	جنات کا دربار

# اسرار شادیت میر

109	محمد رفیع ہاشمی	شخصیات خوش تر اوصاف شخصیت
113	حفیظہ بشر	چار دیواری کی دنیا کچے دھامگے
123	محمد نذیر ملک	جب بیٹی ماں کی بہو بنی
129	مہاں محمد ابراہیم طاہر	تکلیفیں انتقام
149	شفاعت احمد	انتخاب صدیوں کی سل
159	رحمن شاہ	ایک ناکور ایک کھانسی ترباتی
183	دقار احمد ملک	جنگلہ
174	ڈاکٹر رانا محمد اقبال	طب و صحت دست شفاء
177	صیب اشرف صوفی	عجیب و غریب جراثیم دیتے ہیں دھوکا یہ
189	بشیر احمد بھٹی	کچھ بلدیں کچھ بلتیں انوکھا طریقہ ثواب
193	منظر حسن ملک	ایک حقیقت ایک افسانہ روپ بہروپ
203	گلزار اختر کاشمیری	مسئلہ کشمیر بھارتی دزیرا عظیم کا دورہ.....

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مہنامہ کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ پیریم کوالٹی، مارل کوالٹی، کمپریٹڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1





## کیا ہم جشن منانے کے حق دار ہیں؟

اگست شہیدوں کا مہینہ ہے۔ ان شہدیوں کا جنہوں نے اپنی جان، اپنی عصمت، اپنے مال اور معصوم بچوں کی قربانی دے کر پاکستان حاصل کیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم نے آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی نہیں دی۔ ہے کوئی مثال؟

کیا آپ کو وہ شہید یاد ہیں؟

وہ ہزاروں بیٹیاں یاد ہیں جنہیں ہندو سکھ اٹھالے گئے؟

وہ معصوم بچے یاد ہیں جنہیں نیزوں میں پرویا گیا؟

وہ باپ اور بھائی یاد ہیں جن کی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت ورگی کی گئی؟

آپ خاموش کیوں ہیں؟ یہ خاموشی مجرمانہ ہے۔

تو جوان کہیں گے 66 برس پرانی باتیں کیسے یاد رہ سکتی ہیں؟ 66 برس پہلے جو کچھ ہوا، اب اس کا ماتم کرنا چھوڑو۔

دنیا بدل گئی ہے، اب تو بھارت ہمارے ساتھ امن کی آشا اور پیار کی بھاشا کی بات کر رہا ہے۔

بے شک دنیا بہت بدل گئی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل گیا، رہن سہن بدل گیا، ہر چیز بدل گئی مگر ایک چیز نہیں بدلی.....

وہ ہے ہندو کی ذہنیت، مسلم دشمنی۔ ہندو کبھی مسلمان کا دوست نہیں بن سکتا۔ ہندو اور زہریلا سانپ ایک ہی فصلت

رکھتے ہیں۔ سانپ کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، وہ موقع ملتے ہی ڈس لے گا۔ یہی حال ہندو کا ہے۔

اگر آپ بھول گئے ہیں تو میں یاد دلادیتا ہوں کہ یہ وہی ہندو ہے جس نے 65ء میں پاکستان کو نیست و نابود کرنے

کے لئے اپنی بہت ناک جنگی قوت سے حملہ کیا تھا۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے 65ء کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے 71ء

میں آدھا پاکستان کاٹ کر وہاں مسلمانوں کی قتل و غارت مسلمانوں کے ہاتھوں کرائی اور خود بھی پاکستانیوں کے خون

سے کھل کر ہولی کھیل۔ یہ وہی ہندو ہے جو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کئے بیٹھا ہے۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے اعلان کیا کہ

پاکستان کا پانی روک کر اسے صحرا بنا دیں گے تاکہ اس کا بچہ بچہ بھوکا پیاسا مر جائے۔ یہ وہی ہندو ہے جو بھارت میں

موجود مسلمانوں کے خون سے آئے دن ہولی کھیلتا رہتا ہے۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے حال ہی میں اپنی ہندو جنونی

حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اذان پر پابندی لگائی جائے۔  
ہندو اپنی لچر فلموں اور ڈراموں کی وجہ سے نوجوان نسل کو بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔ یاد رکھیں! سانپ بھی بڑا خوبصورت اور زخمیں ہوتا ہے۔ دونوں یکساں زہریلے ہوتے ہیں۔ یہ زہر بڑے ہی حسین اور عریاں جسموں کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں اٹھیل کر ان کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔ ہمارے نوجوانوں پر ہندو کا ظلم طاری ہے اور اسی ظلم کے زیر اثر وہ پاکستان دشمنی پر مبنی فلمیں اور ڈرامے شوق سے قبول کر رہے ہیں۔

اس میں سارا قصور نئی نسل کا ہی نہیں، بزرگوں کا بھی ہے جنہوں نے اپنے بچوں کو بتایا ہی نہیں کہ پاکستان کے قیام کا مقصد کیا تھا اور پاکستان حاصل کرنے کے لئے کتنی بڑی قربانیاں دی گئی تھیں۔  
جو پہلے کبھی باوقار "یوم آزادی" ہوا کرتا تھا، اس کو "جشن آزادی" کا نام دے کر فضول ہڑبازی اور مناج گانے کے پروگراموں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ کیا ہم جشن منانے کا حق رکھتے ہیں؟

کیا ہم نے قیام پاکستان کے مقاصد حاصل کر لئے ہیں؟

کیا ہم دنیا میں ایک باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ ہیں؟

کیا ہم نے ماضی کی غلطیوں کو تائبوں کا ازالہ کر دیا ہے؟

کیا ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہے اور غربت ختم ہو گئی ہے؟

کیا ہم نے آدھا ملک گموا کر کوئی سبق سیکھا؟

کیا ہم نے غیر ملکی قرضوں سے نجات حاصل کر لی؟

کیا عوام کو پینے کا صاف پانی ملنے لگا ہے؟

کیا لوڈ شیڈنگ پر قابو پالیا گیا ہے؟

کیا ہائیڈرو پائل، گیس اور پانی ارزاں نرخوں پر ملنے لگے ہیں؟

کیا دہشت گردی اور بدعت مانیا پر قابو پالیا گیا ہے؟

کیا مظلوموں کو انصاف ملنے لگا ہے؟

..... اور کیا واقعی ہم آزاد ہیں؟

یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ تو پھر ہم کس بات کا جشن منائیں؟ دراصل ہم کھیل تماشوں کی عادی قوم ہیں۔ ہر حکمران نے قوم کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے کھیل تماشوں میں الجھائے رکھا اور خود اوپر بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے۔ اب حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اسلام آباد میں پورے ایک ماہ تک جشن آزادی منایا جائے گا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس اعلان کے پس پردہ کیا مقاصد ہیں؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 30 دن کی تقریبات میں ملک و قوم کا کتنا سرمایہ اور وقت برباد ہوگا۔ کسی نے سوچا؟ حکمرانوں کو اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ وہ یہ سرمایہ عوام کی ہڈیوں سے نچوڑ کر نکالے لگی۔

یہ صرف جشن ہی ہوتا ہے، اس میں جذبہ بالکل نہیں ہوتا۔ جذبے سے خالی جشن، لوگ گھروں کی چھتوں پر، گاڑیوں پر، موٹر سائیکلوں پر، سائیکلوں پر، سبز چیلوں پر، گدھا گاڑیوں پر، ڈکانوں پر جھنڈے لہرائیں گے۔ ہر طرف سبز ہلالی پرچموں کی بہار آ جائے گی۔ رات کو بڑی سڑکوں پر، پارکوں میں، مینار پاکستان کے سائے تلے لوگوں کا جھوم ہوگا۔ مادر پدر آزادانہ جوان موٹر سائیکلوں کے سائیکلسر کال کرکانوں کے پرے پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ بھگائیں گے، دن ویلنگ کریں گے، قوم کی بیٹیوں کے دوپٹے کھینچیں گے اور بے ہودہ فقرے کہیں گے۔ انڈین گانوں پر بھنگڑے ڈالیں گے اور ان سارے کاموں میں ماورن لڑکیاں بھی پیچھے نہیں رہیں گی۔ خود ہی اندازہ کر لیں کہ اس قسم کے جشن کے پیچھے کس قسم کے جذبات کا زخم ماہوں گے؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گزشتہ برس 14 اگست کے "جشن" کے بعد جب میں اگلے دن دفتر جانے کے لئے لکھناتو سڑکوں پر جگہ جگہ کاغذ کی بنی ہوئی پاکستان کے پرچم والی جھنڈیاں اور جھنڈے بکھرے پڑے تھے جنہیں خاکروب جھاڑو سے اکٹھا کر رہا تھا۔ یہ گندگی کے لاغیر میں پھینک جاتی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ غیرت مند قوم میں اپنے پرچم کی حرمت کے لئے کٹہر بنی ہیں اور یہاں ہم اپنے پرچم کو بھروسے تلے روند رہے ہیں۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ کاغذ کا ایک جھنڈا ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا میرے قدموں میں سے آکر آیا۔ میں نے تڑپ کر اسے اٹھا کر گرد صاف کی اور بے اختیار سینے سے لگا لیا۔ عجیب جذباتی کیفیت ہو گئی۔ تحریک پاکستان کے شہداء یاد آ گئے، مہاجروں کے لئے پٹے قائلے یاد آ گئے جو جگہ جگہ بکھیرے آئے تھے، لاشوں سے بھری خون چٹائی لڑیں یاد آ گئیں، کرپانوں سے کٹے ہوئے نوزائیدہ بچے نظروں کے سامنے گھومنے لگے، عفت تاب بچیوں کی چھین کانوں میں گونجنے لگیں، ان کی عصمت کا خون ہر نو بکھر گیا، ہر طرف آگ و خون کا دریا، چیخ و پکار، بے بھرنگہ، ملی، ہر ہر مہادیو، بے کالی کی اور ست سری اکال جو یو لے سونہال کے نعرے کو بھنے لگے۔ میرا سارا وجود زلزلوں کی زلزلہ میں آکر کاٹنے لگا۔ یوں لگا جیسے اس کاغذ کے جھنڈے سے خون لپک رہا ہے۔ جھنڈا فریاد کناں ہے کہ میں تو تمہاری عزت، غیرت اور وقار کی علامت ہوں۔ میری حرمت کو یوں پامال تو نہ کرو۔ یاد کرو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمبردار کو جن کا بازو کٹ گیا تو پرچم گرنے نہیں دیا، ہائیں ہاتھ میں تمام لیا۔ دشمن نے پرچم گرانے کے لئے پایاں ہاتھ بھیا کاٹ دیا تو بھی پرچم اپنے کٹے ہوئے بازوؤں میں سنبھال لیا مگر نہ دیا حتیٰ کہ ایک اور مجاہد نے آکر پرچم تمام لیا۔ یہ سچے اور کھرے جذبے کا کمال تھا کہ اسلام کا پرچم آدمی سے زیادہ دنیا پر چھا گیا۔

یاد رکھو! یہ سبز ہلالی پرچم محض کپڑے کا یا کاغذ کا ایک ٹکڑا نہیں یہ تمہاری عزت، غیرت اور تمہی قومی وقار کی علامت ہے۔ اگر تم اس کی عزت نہیں کرو گے، اس کی حرمت کا خیال نہیں رکھو گے تو دنیا میں تم بھی بے عزت اور بے وقور ہو جاؤ گے۔ پرچم بلند رکھو!

عارف معرو

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سہولت کی سہولت
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



# محبوب عالم، صابر حسین راجپوت اور میم الف کی شہرہ آفاق کتب

مہنا طبعی شخصیت (مجلد 1) - 10  
عبدی، جمال علی، علی رضا  
(مجلد 2) - 10

لائن پر لاش - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

پیار کا پانی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

چادر اور چوڑیاں - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

حوالات میں طلاق - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

جن بیانیہاں - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

1857ء کی داستان خونچکان - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

پیار کا ٹیل صراط - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

جنات کے دربار میں - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

دلیہ یا بیوقوف - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

دوسری بیوی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

رقن کار کی روپا - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

جائیداد کا وارث - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

بھیریا، بدر روج اور بیوی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

لو گرم رکھنے کا ہے اک بھاشہ - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

قبر کا بھید - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

ایک لڑکی دو منگیترا - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

سائپ سا دھوا اور بچے کی کہانی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

مالوی کیوں؟ - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

مہنا طبعی شخصیت (مجلد 2) - 10  
عبدی، جمال علی، علی رضا

داستان ایک داماد کی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

کار شلوار اور پوشہ - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

بال ایک چیل کے - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

جب مجھے اغوا کیا گیا - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

ایک رات کی شادی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

لاش، لڑکی اور گف کے گنگار - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

دام میں صیلا آ گیا - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

وہ رات اُس رات کی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

آشرم سے اُس بازارت تک - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

لائن پر لاش - 10  
نور محمد، جمال علی، علی رضا

## خود فریبی سے گریز کریں!

ہمارے پڑھے لکھے لوگ دانشوراوردہ جو خود کو عقل مآل کہتے ہیں، کیوں اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیوں پاکستان افغانستان، یمن، شام، لیبیا، عراق، مصر، تونس، سوڈان، صومالیہ، ناہجیرا وغیرہ مسلم ممالک کے حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں



☆.....Email:saqqicheema07@hotmail.com.....ساتھی چیمہ

ہے۔ جنگ کا مقصد دشمن کو اپنی مرضی پر چلانا ہوتا ہے اور جنگ جیتنے کا اہم حربہ دشمن کی سپلائی لائن کاٹنا اور اس کو (جنگ) کو مسلسل جاری رکھنا ہے۔ پہلے یہ نظریہ متبادل عام تھا کہ ریگولر فوج گوریلوں سے نہیں لڑ سکتی لیکن جدید دور کے اس آزمائے ہوئے نظریے کو پہلے اسرائیلی فوج نے ملط ثابت کیا اور اپنے مخالف نے اسے گوریلوں نے شکست دی پھر ابھی حال ہی میں سری لنکا کی فوج نے

سے دنیا معرض وجود میں آئی ہے اور حضرت جب انسان کا قدم یہاں پڑا ہے جنگیں ہو رہی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ادیب اور صحافی، دانشور وغیرہ جنگ بار... کیا کہتے ہیں (یہ لوگ تھکی چکا ہے سب خیر نفس مہا اہ آرائی افسانہ طرازی کرتے ہیں) جنگی ماہرین کہتے ہیں کہ جنگ ایک پرتشدد خونریزی کا عمل ہے جس کے جواب میں زیادہ تشدد اور خون ریزی ہوتی

ملک کو کروڑوں ڈالر ملتے تھے، بند اور تباہ ہے۔ ملک میں فرقہ پرستی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جہالت اتنی بلند سطح پر تاریخ میں کسی ملک میں نہ تھی اور یہ سب گزشتہ 35 سال میں ہوا ہے اور اس کا آغاز ضیائی عہد میں ہوا تھا اور بعد میں اس کے جانشینوں نے یہی پالیسی جاری رکھی اور یہ سوچ کر خطے میں عدم استحکام پیدا کرنے والے عناصر پالتے رہے کہ یہ ہمارے پالتو ہیں، کام آئیں گے اور وہ فالتو ہو کر اپنے کام لگ گئے۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے اس کام سے ہاتھ نہ ہٹایا اور جب پانی سر سے گزر گیا تو پھر بھی اپنی سیدھی حرکتیں اور منصوبے بنا رہے ہیں اور اس سارے عمل میں معصوم عوام کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے، ان کی جائیدادیں ریت کے گھر وندوں کی طرح تباہ ہو رہی ہیں۔ تاریخ کے بدترین آمر کے لگائے ہوئے پودے تباہ و رخت بن کر جمجمہ رہے ہیں۔ اسی آمر نے اس ملک کی جڑوں میں جو زہر بھرا جو ہارودی قلیتے لگائے ان میں موجودہ کئی سیاست دان بھی شامل ہیں۔

اب شیردانی اور واسکٹ والوں کی بات ہو جائے، میں نے دس دفعہ لکھا ہے کہ یہ لوگ یہ جتنا ملک کا نظام چلانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کا کردار کس قدر گھٹیا ہو سکتا ہے دنیا کی چھٹی بڑی ایٹمی فوج والے ملک کا حکمران کس قدر بزدل ہو سکتا ہے۔ آپ اندازہ لگائیں اس ملک کی فوج کے ہیڈ کوارٹر جی ایچ کیو پر حملہ ہوا تھا، دہشت گردوں نے وہاں قبضہ کر لیا تھا اور ان میں سے ایک اہم مجرم گرفتار ہوا تھا اس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ گزشتہ ہفتے اس کو پھانسی ہونا تھی اور پھر پیغامات ملے کہ اس کو پھانسی دی گئی تو تمہاری خیر نہیں اور تمہارے جتنے کی بھی خیر نہیں اور اب اس دہشت گرد کی پھانسی ملتوی ہو چکی ہے۔

اب آپ کو دو تاریخی افراد کے دو تاریخی فقرے بتاتا ہوں جو ہمارے ریڈیوٹی وی پریس میں ریکارڈ پڑے

سالوں پرانی جنگ میں دہشت گرد گوریلوں کو ختم کر کے یہ نظریہ کافی حد تک غلط ثابت کیا۔

قارئین! پاکستان میں دہشت گرد طالبان دس سال سے زیادہ عرصہ سے لڑ رہے ہیں، اس کے علاوہ سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی اور بلوچ علیحدگی پسند بھی شامل ہیں۔ کوئی بھی جنگ مسلسل سپلائی اور امداد کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی۔ جنگ میں انسانی ایندھن استعمال ہوتا ہے جس کو بھڑکانے کے لئے ہارود اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دہشت گردوں کی مدد کون کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ جو لوگ اس ملک کی سلامتی کے ذمہ دار ہیں اور ریڈیوٹی وی پہ اپنے ترانے چلاتے ہیں، نصابی کتب میں ہیرو ہیں اور اپنے خفیہ اداروں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، کیا وہ اس جدید دنیا میں نہیں رہتے؟ کیا ان کو نہیں پتہ کہ ان کی ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے؟ میں فوج کے خلاف بات نہیں کر رہا، صرف ایک پوراخت کی طرف توجہ دلا رہا ہوں کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ مسائل کے ذمہ دار ہیں ان کے بارے میں بات نہ کریں تو گلی میں پنے بیچنے والے کو ذمہ دار قرار دیں۔ مول خود پاک نوج کا حامی ہوں اور گزشتہ مضامین میں یہ بات واضح کر چکا ہوں۔

سب سے زیادہ بحث سب سے زیادہ اختیار اور پالیسی سازی کے عمل میں سب سے بڑا بوٹ کس کا ہے؟ تو پھر اگر گزشتہ دہائی سے زائد میں ایک لاکھ کے قریب سوئین (اس میں سیکورٹی والے ادارے شامل نہیں ہیں) ہلاک ہو چکے ہیں اور اربوں کی پراپرٹی تباہ ہو چکی ہے، اربوں کا سرمایہ ملک سے جا چکا ہے، اربوں روپے کی سرمایہ کاری رُک چکی ہے اور اس کا لفظ نتیجہ بد امنی، عدم تحفظ کا احساس، ملک سے لگاؤ میں کمی، مہنگائی، عوام کی مفلوک الحالی، سرمائے کا ملک سے فرار، عوام کی لمبی لائنیں کہ بیرون ملک چلے جائیں، سیاحت کا کاروبار جس سے

باروے، فن لینڈ، آکس لینڈ، سویڈن، فیجیم، ڈنمارک اور  
نکسبرگ پہلے دس نمبروں پر تھے حتیٰ کہ امریکہ دسویں نمبر  
کے بعد تھا، اس کے الٹ سروے میں یہ دیکھا گیا کہ کن  
ممالک میں معاشروں میں لوگ گھٹیا کردار بد اخلاقی اور  
معاملات میں سب سے بُرے ہیں تو افغانستان،  
پاکستان، سعودی عرب اور ایران پہلے چار نمبروں پر تھے۔  
یہ ہے ہماری اوقات۔ امت مسلمہ کا شور مچانے والو،  
کتوں اور گدھوں کا گوشت کتے نبی کی انتہیوں سے نکلی  
چربی ڈال کر چوری کی گیس سے ہانڈی پکا کر محروم افطار  
کرنے والو! اس دنیا میں ہمارا یہ کردار ہے، ہماری یہ  
حیثیت ہے کہ خود قرآن کے مطابق ہم بدترین ذلیل  
معاشرہ ہیں۔

اس سے پہلے اس موضوع پر لکھا تھا تو دینی جماعت  
کے پڑھے لکھے رکن نے کہا کہ کتوں کا گوشت پھینا، ہال  
مغا پاؤڈر سے دودھ بنانا، ہلدی میں ملاوٹ کرنا، مریچوں  
میں اینٹوں کا پاؤڈر ڈالنا، دودھ میں گندہ پانی ڈالنا تاکہ  
گاڑھا ہو جائے، میٹر ریڈر کا رشوت لینا اور بیوہ کا خود کشی  
کرنا الغرض اس نے تمام جرائم کے متعلق کہا کہ یہ انفرادی  
جرائم ہیں۔ ان صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ  
انفرادی جرائم وہ ہوتے ہیں جن میں ایک بندہ ایک ہی  
بندے کو لوٹتا ہے۔ فون بوٹا ہے، کار چھینتا ہے، چوری کرتا  
ہے اور ایسے انفرادی مجرموں سے جلیس بھری ہیں، جو  
معاملہ میں نے لکا ہے وہ سب اجتماعی کردار کی بات ہے۔  
بات حکمرانوں کی ہو رہی تھی اور بات یہ کرنی تھی  
کہ گزشتہ دس سال سے زائد عرصہ میں ایک لاکھ سے زائد  
پاکستانی دہشت گردوں کے حملوں میں ہلاک ہو چکے ہیں  
جن میں غالب تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ اربوں کی  
ملاک تباہ ہوئی ہیں، ایک ایک حملے میں 150 سے زائد  
افراد ہلاک ہوتے رہے۔ 200 تک بھی ہوئے اور آج  
لشطن میں صرف چھ سات سو افراد ہلاک ہوئے ہیں تو

ہیں۔ نمبر ایک مارشل لاء لگنے سے دو دن قبل وزیراعظم  
بھونے کرانی میں ایک بیان میں جس کرسی پر بیٹھا تھا  
اس پر نیلے مار کر کہا۔ ”یہ کرسی بہت مضبوط ہے“۔ دو دن  
بعد فوج کی تحویل میں تھا۔ نمبر دو اپنا جہاز کریش ہونے  
سے دو دن پہلے ضیاء الحق نے نشری تقریر میں کہا۔ ”میں  
جانے والا نہیں ہوں“۔ اور دو دن بعد راکھ بن کر ہوا میں  
اڑ گیا۔

ہر دور میں حکمرانوں نے جس دھناتی سے اس  
ملک میں کرپشن کو فروغ دیا ہے اس کی مثال کم ہی ملتی  
ہے۔ قارئین! جس ملک میں ایک جعلی پٹر ایک لڑکی سے  
زیادتی کرے یا پھر جہالت کی انتہا ہے کہ لڑکی اپنا مقصد  
حاصل کرنے کو اس کے چنگل میں پھنس جائے اور پھر  
ایک بڑائی دی جیٹل اس لڑکی اور ملزم کو لے کر تھانے جاتا  
ہے، وہاں پر چھ درج کراتے ہیں، ملزم نے لڑکی کی نگہی  
تصادف بنائی ہوئی ہیں موبائل فون میں وہ بھی مال مقدمہ  
اور بطور ثبوت پولیس کو دیتے ہیں اور ٹی وی والوں کے  
جانے کے لمحہ پھر بعد حلقہ اے ایس آئی لڑکی کے بھائی  
کو فون کرتا ہے کہ یہ تصویریں مارکیٹ میں فروخت ہو  
جائیں گی ورنہ پچاس ہزار رو۔ وہ بے چارہ پھر ٹی وی  
والوں کو لے کر آیا اور جب انہوں نے پوچھا تو وہ قنایدار  
چپ رہا بڑے قنایدار نے کہا۔ کیا طوقان آگیا ہے، آؤ  
بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ معاشرہ  
اپنے کردار کے لحاظ سے ذلت کی آخری حد پر پہنچ گیا  
ہے۔

گزشتہ دلوں ایک پاکستانی اور ایک ایرانی پرو فیسر  
نے جو امریکہ میں رہتے ہیں، تمام جدید وسائل اور  
طریقوں سے ایک سروے کیا کہ دنیا کے کن ملکوں  
معاشرہ کے لوگ اعلیٰ ترین انسانی کردار اور بہترین  
اخلاق اور دوسروں سے بہترین سلوک کرنے والے ہیں  
جیسا کہ قرآن میں اعلیٰ انسانی کردار کی خوبیاں ہیں تو سنو

دہشت گردی اور کرپٹ سیاستدان ہیں یہ دونوں ہی ملک کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اس ملک کے عوام کے تمام دکھوں کے ذمہ دار ہیں اور ان کو عوام پر مسلط کرنے والے وہ لوگ ہیں جو بادشاہ گر ہیں اور جو سرمایہ دار امریکہ کے غلام ہیں۔ قارئین! مشرق وسطیٰ میں اس وقت جو ہو رہا ہے اس کی صحیح تصویر دیکھیں تو آپ ہلاک اور چنگیز خان کو بھول جائیں گے۔ ”داعش“ دہشت گرد خارجی ہر اس انسان بچے بوڑھے جوان عورت کو قتل کر رہے ہیں جو ان کے راستہ میں آتا ہے۔ گزشتہ دنوں موصل میں ملا بغدادی نے حکم دیا کہ سرکاری ملازمین غیر مسلم آبادی کو کھانا پانی کوئی شے فراہم نہ کریں اور ہر جگہ ان لوگوں نے غیر مسلموں کا قتل عام کیا ہے اور خود کو اس نئی کاہنہ دکار کہتے ہیں جنہوں نے جنگ میں ہنزورخت کاٹنا بھی حرام قرار دیا تھا اور جنگ کا یہ اصول خاص طور پر نافذ بھی تھا کہ صرف ہتھیار اٹھانے والوں سے ہی جنگ کی جائے گی، وہ بھی جب تک وہ ہتھیار نہ ڈال دیں۔ یہ لوگ ہتھیار ڈالنے والوں کو بھی قتل کر رہے ہیں اور کل عالم میں اسلام کو بدنام کر رہے ہیں اور ان کا واحد مقصد امریکی ایجنڈے کی تکمیل ہے کہ مشرق وسطیٰ میں تیسرا نیو ورلڈ آرڈر نافذ کر کے اس کی تشکیل نو کی جائے۔ اس وجہ سے دنیا کی کوئی تنظیم اس طرف توجہ نہ دے رہی ہے کہ وہاں غیر مسلموں سے کیا ہو رہا ہے۔

بہر حال آزاد کردستان کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اس میں شامی اور عراقی علاقے شامل ہیں، ترکی نے اپنے زیر قبضہ علاقے دینے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے اور ایران نے انکار کر دیا ہے۔ اب بہت جلد عراقی اور شامی علاقوں کے بعد شدید جنگ ایرانی علاقے میں شروع ہو جائے گی اور اس جنگ میں ایرانی کروڑوں کی لاشوں کے ذخیرہ گاہ ان کو اس طرح نہ دھائیں گے جس طرح کہ انہوں نے بلوچوں (ایرانی صوبہ سیستان) کے ساتھ کیا اور ان کو ظلم

اس امت مسلمہ کے پیٹ میں بڑا درد اٹھ رہا ہے۔ جلوسوں سے عوامی زندگی عذاب کرنے والے اور موکی کیڑوں کی طرح بلوں سے نکل آنے والی جماعتوں اور ملاؤں کو ڈکھ ہو رہا ہے۔ گزشتہ 14 سال سے ہم جنوبی دہشت گردوں کا نشانہ ہیں امت مسلمہ اور فلسطینیوں نے کس دن ہمارے لئے ایک گھنہ کی بھی ہڑتال کی تھی؟ گزشتہ چودہ برسوں میں مرنے والے ایک لاکھ شہری اور تیس ہزار فوجی کیا اتنے ہی گئے گزرے تھے؟ یہ کیا معاشرہ ہے، یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسے مذہبی رہنما ہیں؟ اس وقت آج چین میں جن لوگوں کو روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے اس کی خاص وجہ انہوں نے برسوں کے تجربہ سے بتائی ہے کہ پھر یہ لوگ کام نہیں کرتے، کوئی استاد طالب علم، مزدور اور سرکاری ملازم ہو اس سے پوچھو کام کیوں نہیں کر رہے وہ کتنا ہے تنگ کیا ہوں، میرا روزہ ہے یعنی روزانہ 8 گھنٹے کام کے اوقات میں وہ دو تین گھنٹے کام کرتے ہیں۔ اس لئے وہاں سرکار نے پابندی لگا دی مگر عام آدمی پر یہ پابندی نہ ہے اور خاص بات یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلوس نکالنے اور توڑ پھوڑ کرنے والوں کی غیرت برف میں لگ گئی ہے۔ کیوں چینی سفارت خانہ کو آگ نہیں لگائی ہے۔ کیوں جلوس نکال کر امن و امان تباہ نہیں کیا ہے؟ ہم کیسی متعلق قوم ہیں؟ اور سچ تو یہ ہے کہ چینی سچے ہیں۔ اس ملک میں ہم دیکھتے ہیں کہ روزوں میں کام کے اوقات آدھے رہ جاتے ہیں حتیٰ کہ جو ڈکان دار صبح نو بجے ڈکان کھولتا تھا وہ بھی بارہ بجے آتا ہے اور کہتا ہے صبح آٹے کا فائدہ نہیں لگا کہ تو آتے نہیں میرا تو کام آدھا رہ گیا ہے، اس رحمت کے مہینے میں۔ ہاں اس رحمت کے مہینے میں جو ناجائز منافع خوری اور لوٹ مار تاجر طبقہ نے چائی ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

قارئین! اس ملک کا سب سے اہم مسئلہ اس وقت

گردوں کو اردن میں خفیہ کیمپوں میں خصوصی تربیت دیتے رہے ہیں اور ڈیڑھ ارب ڈالر کی ہاسہ تو ہو چکی ہے اور اس کے بعد مزید ڈالر بھی آئے ہیں جن کی کرامت سے دس لاکھ قبائلی بے گھر بے درؤکھوں کا شکار ہیں۔ ایک ماہ کے آپریشن کے بعد محض ایک سیکنڈ کلاس دہشت گرد پکڑا گیا ہے۔ ویسے آپریشن کا علاقہ مکمل میل بند ہے اور فروج کے علاوہ دنیا کے کسی فرد کو یہ معلوم نہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں دہشت گرد طالبان کا خاتمہ کر رہے ہیں۔

ہمارے پڑھے لکھے لوگ دانشور اور وہ جو خود کو عقل کل کہتے ہیں، کیوں اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیوں پاکستان افغانستان، یمن، شام، لیبیا، عراق، مصر، تونس، سوڈان، صومالیہ، نائیجیریا وغیرہ مسلم ممالک کے حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں جبکہ اسی فکلت خوردہ ذلیل سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے بھی دوسرے

کی بجلی میں ہیں کر خاموش کر دیا تھا۔ آپ ایمانیوں کے لئے ایک نئی مصیبت بن کر نکلتی ہے چونکہ امریکہ خود یہ سب کر دار رہا ہے اس لئے اس درد کی دوا کوئی نہ ہے۔ اسرائیل نے آزاد کردستان کو تسلیم کر لیا ہے، آبادی کی اکثریت سنی مسلمان ہے۔

تارمین ا میں بار بار یہ بات کہتا ہوں کہ سرمایہ دارانہ نظام دنیا کا ذلیل ترین نظام ہے اور اس نظام، اس سوچ کے حامل افراد نے جنگ کو بھی کاروبار بنا دیا ہے۔ ان کے اسلحہ ساز کارخانے کمریوں کا اسلحہ بناتے ہیں جو یہ جنگ میں مصروف یا متوقع جنگ کے شکار گرد ہوں اور ممالک کو فروخت کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا شیطانی چکر ہے کہ اس کو ایک دلدہ شروع کرنے کے بعد اب وہ گھڑ بیٹھے کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اسلحہ بناتے ہیں، آگے خریدار کی مرضی وہ بے پانہ لے۔ ایک اہم خبر یہ ہے کہ امریکی سی آئی اے کے لوگ داعش کے دہشت

## حقیقت نگار قلم کار میاں محمد ابراہیم طاہر کی شاہکار کتابیں

(ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن)

1947ء کی داستان خونچکاں

قیمت: 250 روپے

## آزادی کی قیمت

حصول پاکستان کی راہ میں سکھ ریاست کی پور تحصیل اور پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی دلخراش داستانیں

قیمت: 250 روپے

## گنگا سے طاہر

صفحات: 256

جذبات کو جنم دینے والی ناقابل فراموش داستان  
ایک ہندو خاتون گنگا کی جی داستان جس نے دیوی  
دیوتاؤں کو چھو کر مار کر تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔

مسلم ممالک ترکی اور ملائیشیا کی ترقی اور امن قابل رشک ہے۔ اسی ذلیل شکست خوردہ سرمایہ دارانہ نظام کے امداد رو کر ماروسے، سویڈن، ڈنمارک، فن لینڈ، آئس لینڈ اور سوئٹزر لینڈ ترقی میں سب سے آگے ہیں۔

محترم قارئین! یہ مضمون شروع کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کا ناسور پھر مرنے لگا اور پھر جلد ہی ایک دلدہ فلسطینی اور اسرائیلی دست و گریباں ہو گئے۔ اس مسئلے ہمارے دنیا بھر میں عام مسلمان عمومی معلومات رکھتے ہیں 1947ء میں سعودی عرب کے شاہ عزیز فیصل نے اپنی مہر سے برطانوی حکومت کو دھچکا کر کے تحریر دی کہ اس کے زیر قبضہ فلسطینی علاقہ اسرائیل کو دینے پر اسے کوئی اعتراض نہ ہے (دستاویز منظر عام پر ہے)۔ اس کے بعد سب کو پتہ ہے کہ وہاں ایک جنگ شروع ہو گئی اور پھر 50 سال سے زائد عرصہ کے بعد اس میں معاہدہ اوسلو کی شکل میں ایک نیا موڑ آیا جب اسرائیل فلسطینی ریاست کے قیام اور اس کی امداد پر تیار ہو گیا۔ پی ایل او کے صدر یاسر عرفات نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس نے جس جنگ میں عمر گنوا دی ہے وہ لا حاصل ہے اور اپنی قوم کے لئے مرنے سے قبل کچھ حاصل کر لوں۔

قارئین! اس موقع پر فلسطینیوں میں ایک احتجاج پسند گروہ پیدا ہو گیا جو کہ امن معاہدے کے خلاف تھا اور اسرائیل نے یاسر عرفات پر زور دینا شروع کر دیا کہ اس گروہ کے خلاف کارروائی کرو جو وہ بوجہ نہ کر سکا تا کہ آپس میں لڑائی نہ ہو۔ امن کا عمل سنست پڑ گیا اور یاسر عرفات اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ فلسطینی اتھارٹی کا انتظام اس کی جماعت نے سنبھال لیا اور پھر جلد ہی احتجاج پسند گروہ حماس کے نام سے سامنے آ گیا اور مجوزہ فلسطینی ریاست میں اس گروہ نے یاسر عرفات کی کی جماعت ”فتح“ سے مسلح تصادم شروع کر دیے اور اس مقدمہ پر قبضہ کرنے کا مطالبہ کیا جو محض ایک جلد بانی شہر

کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تصادم میں معصوم بچے اور راہ گیر زیادہ مرے اور فریقین کا نقصان کم ہوا۔ اس کے بعد احتجاجات میں اس شدت پسند گروہ کو بھی اکثریت حاصل ہو گئی۔ قبل ازیں تو یہ خفیہ مقامات سے اسرائیل پر راکٹ فائر کرتے تھے، مقدار میں غالب حصہ ملنے کے بعد ان لوگوں نے مزاحمت اور جنگ کے اس راستے کو بھی ترجیح دی جس سے فوج کر جس کو چھوڑ کر یاسر عرفات اس قوم کے لئے اس دنیا میں ایک زمین کا پڑا من نکلا حاصل کر رہا تھا۔ قارئین! فلسطینی واقعی ایک بد قسمت قوم ہے مگر اس میں ان کے کردار کا بھی ہاتھ ہے۔ 1970ء میں ہزاروں فلسطینی شام اور اردن میں امن و سکون سے رہ رہے تھے پھر ان لوگوں نے وہاں سے اسرائیل کے خلاف پرتشدد کارروائیاں شروع کر دیں۔ ایسی کارروائیوں سے جنگ آ کر اسرائیل نے شام اور اردن سے ذیل کی کہ ان کو نکالو، ان لوگوں نے نکلنے کی بجائے اپنے میزبانوں سے بھی لڑائی شروع کر دی۔ پاکستانی فوج کا بریگیڈ یئر ضیاء الحق (جو بعد میں اس ملک کا صدر بھی رہا) وہاں اردن میں فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ فلسطینیوں کے خلاف آپریشن شروع کیا گیا کہ ان کو لبنان میں دھکیل دیا جائے چنانچہ 20 ہزار سے زائد فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ دیگر افواج نے مشکل سے 5 ہزار مارے ہوں گے اور ان کو لبنان میں دھکیل دیا تب لبنان جنت نظیر تھا مگر ان لوگوں نے وہاں جاتے ہی پھر اپنا کام شروع کر دیا اور اسرائیل سے جنگ میں لبنان کھنڈر بن گیا پھر وہاں سے بھی نکال دیئے گئے اور کئی ملکوں میں پھیر دیئے گئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جب سے شدت پسند گروہ حماس کا عمل دخل اور اثر و رسوخ فلسطین میں بڑھا ہے۔ فلسطین کا مسئلہ جنگ ہو گیا ہے۔ جب بھی امن کے راستے پر ایک قدم اٹھتا ہے بغیر کسی وجہ کے بغیر کسی اشتعال کے حماس کے لوگ اسرائیل پر راکٹ

برسانا شروع کر دیتے ہیں۔  
اب آپ ذرا غور سے سمجھیں کہ یہ راکٹ کیا ہیں۔  
یہ ایک خود ساختہ ہتھیار ہے جو کہ مروجہ جنگی میزائل کی  
دستی نقل ہے اور بہت چھوٹا ہے اس کی مار بھی کم ہے اور  
اس سے نقصان بھی واجب ہوتا ہے۔ حماس کے لوگ یہ  
راکٹ خود بناتے ہیں اور کچھ پرانے زائد البیادر اکت  
ایران ان کو دیتا ہے۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ پاکستان میں  
شادی بیاہ پر جو گولے چلاتے تھے جو اوپر جا کر پھٹتے ہیں  
یہ ان کی ذرا بھتر قسم ہے اور ہوتا کیا ہے اس کے جواب  
میں اسرائیل اپنی بھرپور قوت اور غضب کے ساتھ حملہ آور  
ہو جاتا ہے جو ترقی گزشتہ پانچ سال سال میں علاقے  
میں ہو چکی ہوتی ہے اور غزہ و مغربی کنارے کے لوگوں  
کے دل میں امن کی امید پھر سے روشن ہو چکی ہوتی ہے  
اسرائیل کے تباہ کن حملوں سے وہ سب ختم ہو جاتا ہے۔  
ایسا گزشتہ دس بارہ سال میں تیسری دفعہ ہوا ہے اور ہر  
دفعہ یہ کھیل ایک ہی انداز سے دہرایا جاتا ہے۔ اسرائیل  
کہتے ہیں ایک اسرائیلی کے بدلے 50 فلسطینی مارنے  
ہیں اور وہ مارتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کہ حماس کے  
جنگل جنونی اپنے بچوں کو اسرائیلی بموں سے مرنے کے  
لئے پیدا کرتے ہیں۔ قارئین! بچوں کی مسخ شدہ لاشیں  
ایک نظر بھی دیکھی نہیں جاسکتی ہیں اور اس دفعہ اسرائیلیوں  
کا یہ دعویٰ بھی سچ ثابت ہو گیا ہے کہ حماس سکولوں اور  
ہسپتالوں کی عمارتوں سے راکٹ فائر کرتے ہیں۔ اقوام  
متحدہ کی ایجنسی برائے غزہ نے اس کی تصدیق کی ہے اور  
میں نے حماس کا ایک ہدایت نامہ دیکھا کہ میڈیا پر یہ مت  
دکھاؤ کہ اسرائیلی طیارے بمباری کر رہے ہیں بلکہ زیادہ  
سے زیادہ بچوں کی لاشیں دکھاؤ اور اب دنیا نے یہ بھی  
دیکھ لیا ہے کہ چار گھنٹے کی جنگ بندی جو انسانی بنیادوں پر  
ہوتی تھی، اس کے صرف دو گھنٹے بعد حماس نے راکٹ  
چلانے شروع کر دیے۔

قارئین! یہ جنگ ایسے ہے جیسے کہ ایک بندے  
کے پاس چھوٹے والی اڑکن ہو جس سے پرندے  
مارتے ہیں اور دوسرے کے پاس مشین گن اور بم ہوں  
اور چھوٹے کی گن والا بار بار فائر کرنے سے ہار نہ آئے  
جبکہ ایک بچے کو بھی پتہ ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا ہے۔  
اس دفعہ مسئلہ گزشتہ ماہ شروع ہوا جب تین اسرائیلی  
لڑکوں کو بدظلم کے علاقے سے اغوا کر کے قتل کر دیا گیا  
اور تحقیق و تفتیش سے ملزم ثابت ہونے والے فلسطینی فرار  
ہو گئے اور دو دن بعد ایک مسلم لڑکے کو اغوا کر کے زندہ  
جلا دیا گیا۔ اس پر اسرائیلی حکومت نے خود اپنے مفاد  
کے لئے قاتل اگلے دن گرفتار کر کے مقدمہ درج کر لیا  
مگر اس کے چند دن بعد اچانک ہی جیسا کہ پہلے ہوتا رہا  
ہے حماس نے راکٹ باری شروع کر دی اور اسرائیل  
نے ایک دو دن کے توقف سے تباہی کا کھیل شروع کر  
دیا۔ اس ساری صورت حال سے یوں لگتا ہے کہ جیسے  
حماس کی اعلیٰ قیادت میں اسرائیل کے ایجنٹ ہیں اور  
جو بھی امن کی بات کسی موڑ پر پہنچتی ہے تو وہ بغیر وجہ اور  
اشتعال کے راکٹ باری شروع کر دیتے ہیں اور اس  
طرح سے اسرائیل کو گزشتہ سات آٹھ برس میں جو ترقی  
ہوئی ہوتی ہے، جو امن کی امید جاگی ہوتی ہے اسے تباہ  
کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ قارئین! یہ میرا دعویٰ  
ہے کہ اس عمل (حماس سے راکٹ باری کرانا اور شدت  
پسندی کو ہوا دینا) میں اسرائیل خود کسی نہ کسی طرح سے  
ملوث ہے اور ایک دن یہ بات واضح ہو کر سامنے آ  
جائے گی اور رہی بات امت مسلمہ کی تو وہ نجانے کس  
چڑیا کا نام ہے۔ دنیا بھر کے ہر ملک کے اہم شہروں میں  
جو روز باغیر لوگ ریلیاں نکالتے ہیں جلوس نکالتے ہیں  
کہ غزہ پر ظلم بند کرو مگر امت مسلم کے سب سے بڑے  
ٹھیکیدار سعودیہ کی طرف سے ایک سطر کا بیان بھی نہیں آتا  
ہے اور نہ ہی شعلوں کو ہوا دینے والے زائد البیادر اکت

معزز قارئین! جب غزہ کے لاکھوں افراد امن  
امن پکارتے ہیں، جب اسرائیل کے اندر پندرہ لاکھ  
فلسطینی اور ہزاروں قادیانی باعزت پرسکون زندگی  
گزارتے ہیں (وہ کسی کے غلام نہیں ایک ریاست کے  
شہری ہیں) جب کراچی سے 2500 پاکستانوں نے  
اسرائیلی شہریت اختیار کر لی ان میں سے صرف دو ہزار  
یہودی تھے بقیہ مسلم تھے اور جب دنیا بار بار فریقین کو  
امن کے راستے کی طرف لے کر چلتی ہے، مذاکرات  
ہوتے ہیں، خاموشی لی اور دی جاتی ہیں تو پھر حماس کا  
موقف کیا ہے بلا جواز جنگ شروع کرنے کا وہ بھی خالی  
ہاتھ۔ اب غزہ کے ہزاروں نہیں لاکھوں افراد نے عندیہ  
دیا ہے کہ یہ ہمارا دیس نہیں بہت پیارا ہے مگر اب اگر  
درا سا بھی موقع ملے اس کو چھوڑ دیں گے۔ میں  
فلسطینیوں کو مظلوم اور بد قسمت قوم تسلیم کرتا ہوں لیکن  
خدا را! آپ سے التماس ہے کہ حماس اور فلسطین کو الگ  
الگ کر کے دیکھیں۔ حماس کو دوت دینے والے اب  
بچتا رہے ہیں۔ غزہ میں حماس نے بد معاشی سے اپنی  
حکومت قائم کر رکھی ہے اور جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ یہ  
بار بار جو جنگ شروع کر دیتے ہیں تو اس کے درپردہ  
اسرائیل کا ہاتھ ہونا ممکن ہے مگر یہ سوال اپنی جگہ پر  
ہے کہ اسرائیل کو اس سے کیا فائدہ؟ اور یہ بھی ممکن ہے  
کہ اسرائیل کسی خاص طویل المیعاد منصوبے پر عمل کر  
رہے ہوں جس کے خاتمہ پر وہ ایسی فلسطینی ریاست  
تفکیل دیں جو ان کی مددگار ہو۔ ظاہر ہے جتنے بھی حملے  
کر لیں وہ فلسطینیوں کو ختم تو کر نہیں سکتے اس کا ان کو بھی  
پتہ ہے اور اب آخری بات جیسا کہ میں اکثر ملاؤں کے  
ہارے لکھتا ہوں تو اس دفعہ بھی ملا اور ملائیت زدہ لوگوں  
کے منہ سے ایک ہی فقرہ بار بار سن رہا ہوں یا اللہ غزوہ کی  
مدد کر۔ اس فقرے کا سیاق و سباق یہ ہے کہ ملا جمعہ یا  
عیدین پر ایک لمبی دعا کرتا ہے اور کہتا ہے یا اللہ کشمیر کو

دینے والے ایران کا منہ کھلتا ہے۔ کیا یہ بے بسی کی سب  
سے بڑی بات نہیں کہ غزہ کی امداد کے لئے صرف ایک  
مسلم ملک ترکی کے علاوہ بقیہ ساری امداد غیر مسلم ممالک  
سے آتی ہے اور غزہ کے مظلوموں کے زخموں پر دعی  
مرہم رکھتے ہیں۔ یہ ایک مفروضہ ہے کہ وہ اسرائیل کی  
امداد کرتے ہیں۔

"حکایت" کے قارئین کو میاں طاہر صاحب کے  
تراجم سے واضح معلوم ہو گیا ہو گا اور راقم نے 1988ء  
میں یہ تحقیق مکمل کر لی تھی کہ اسرائیل نے کسی سے بھی  
بھیک نہیں لی ہے، اپنی عقل اور محنت سے وہ اس مقام پر  
پہنچے ہیں۔ ان کی قیادت میں وہ لوگ ہیں جو اپنے عوام  
سے جنون کی حد تک پیار کرتے ہیں اور اپنے ملک کی بقاء  
کے لئے پیشہ وارانہ انداز سے کام کرتے اور انٹلکٹ محنت  
کرتے ہیں۔ آدمی رات کے گیدڑوں کی طرح سے  
سیاسی حکومتوں کے خلاف سازش نہیں کرتے ہیں نہ ہی  
سیاسی جماعتوں اور ملاؤں میں رقوم تقسیم کرتے ہیں پھر  
بے شری سے سرعام اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

قارئین! بات غزہ کی ہو رہی تھی تو اسرائیل میں  
پندرہ لاکھ فلسطینی عرب رہتے ہیں ان کے پاس وہاں کے  
آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ ہیں۔ یہ اسرائیلی شہری ہیں  
اور سو فیصد مکمل حقوق رکھتے ہیں جو کسی بھی اسرائیلی شہری کو  
حاصل ہیں حتیٰ کہ غزہ کے حق میں ریلی بھی نکالتے ہیں۔  
آپ کو بتا دوں کہ خود اسرائیل میں ہائیں بازو کی  
جماعتوں اور لبرل گروہوں نے غزہ پر حملہ کے خلاف  
جلوس نکالے ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ مشرق وسطیٰ کا سنگم ہوا  
مسئلہ ہے جو بار بار بھڑکتا ہے اور اس کا واحد حل حقائق کو  
تسلیم کر لینے میں ہے۔ جتنی جلدی فریقین خصوصاً حماس  
ذمہ دار حقائق اور صورت حال کو تسلیم کرے گی، مسئلہ کا حل  
نزدیک آ جائے گا۔ میرا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا  
نہیں ہے۔

# گوئی مرض لاعلاج نہیں سوائے موت کے

ماہنامہ "حکایت" کے شعبہ "دست شفاء" کے مستند و ماہر ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) کی جدید تحقیقات اور ماہرانہ خدمات سے مستفید ہوں اور پرانے، ضدی اور لاعلاج امراض، خصوصاً درج ذیل امراض کے تیز ترین اور بے ضرر علاج کے لئے رجوع فرمائیں:

- پولیو
- الرجی
- ذہنی معذور بچے
- بادداشت کی خرابیاں
- ہاتھوں کی جلد کی خرابیاں
- ہائی بند پریش
- ناک و گلے کے غدرد کا بڑھ جانا
- اعضاء کی بے حس یا کنٹرول نہ ہونا
- پچھڑوں کے امراض
- احساس کتری، جھک
- مردانہ، زنانہ امراض
- اعضاء کا پیدائشی (یا بعد میں) ٹیڑھا پن

رابطہ کے لئے

0321-7612717

0312-6625086

0323-4329344

ڈاکٹر رانا محمد اقبال  
(گولڈ میڈلسٹ)

عارف محمود

بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔

دست شفاء حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکاوڈ روڈ لاہور

شدت پسند ملک ہے تو پھر حماس کے بد معاشوں نے کس وجہ سے کس فائدے یا جنوں کی خاطر قتل و غارت کا یہ بازار گرم کر رکھا ہے۔ مرنے والوں میں حماس کے 50 لوگ بھی شاید ہوں بقیہ سب سولین اور بچے ہیں۔ اس سے پہلے غزہ کے اندر اسلحہ سے لڑائی میں حماس کے بد معاشوں نے درجنوں بچے اور عام لوگ مار دیئے تھے۔ ان حقائق پر نظر رکھیں اور یہ ضرور یاد رکھیں کہ اسرائیل کو امن کی زیادہ ضرورت ہے اور وہ اس معاملہ سے بہت تنگ ہیں۔

اب تک خود اسرائیل نے دو دفعہ جنگ بندی کی پیشکش کی ہے اور حماس نے اس کے علاوہ دنیا بھر سے ہر طرف سے آنے والی جنگ بندی کی پیشکش ٹھکرا دی ہے اور اس جنگ میں ہو کیا رہا ہے اسرائیلی فوج کے حملوں سے سولینی افراد کی جائیدادیں تباہ ہو رہی ہیں۔ عورتیں اور بچے مرنے لگے ہیں اس لئے کہ نام نہاد مجاہدین تو محفوظ جگہ چھٹک جاتے ہیں۔

قارئین سے اپیل ہے کہ فلسطینیوں سے محبت اور اسرائیل سے نفرت دو انگ نکل ہیں، ان کو سمجھیں اور اسرائیل کے خلاف زیادہ تر غیر مسلم ہیں جن کے اپنے خاص مفادات ہیں اور آج ہر جگہ ریگی ٹکالنے والے اہل مددوں کو پاکستان میں ایک لاکھ معصوم لوگ جن میں عورتوں بچوں کی اکثریت ہے اور 50 ہزار سے زائد سکوری اداروں کے افراد کی لاشیں نظر نہیں آتی ہیں۔

نوٹ:- میرے ساتھ اختلاف کرنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ کال کر کے اپنی بات کیا کریں، مگر نام ایس ایم ایس نہ کریں۔ اچھے طریقے سے کال کر کے اپنا تعارف کرا کے بات کریں۔ آمندہ کسی ایس ایم ایس کا جواب نہیں دوں گا۔



آزادی دے، فلسطین کو آزادی دے آمین اور پھر کہتا ہے کہ چندے کے پیسے مسجد اور مدرسے کی صندوقچی میں ڈالنا مت بھولیں۔ تو جناب جب تک امت مسلمہ دعائیں کرتی رہے گی اور لوگ محض ریلیاں نکالتے رہیں گے تو کچھ نہ ہوگا اگر ہم ایک طاقتور باوقار قوم ہوں تو ہماری بات بھی کوئی سنے گا اس پر دھیان دے گا۔

صرف فلسطینیوں کے علاوہ ساری عرب دنیا کھلے عام یا اندر خانے اسرائیل سے دوستی کر چکی ہے حتیٰ کہ سعودی عرب تک اس سے کاروبار کر رہے ہیں تو پھر ہمارے پاکستانیوں کو کیا مسئلہ ہے، کیا دشمنی ہے اسرائیل سے؟ ہم اسرائیل سے دوستی کر کے فلسطینیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کر سکتے ہیں اور بھارت کا پریش بھی کم کر سکتے ہیں۔

حماس نے غزہ کو بری حال بنا رکھا ہے اور غزہ میں تمام خون ریزی کی ذمہ داری حماس پر ہے۔ یہ لوگ جان بوجھ کر امن کی بات نہیں کرتے اور نہ ہی امن کے راستے پر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ خون ریزی کا راستہ اپناتے ہیں ان کی حیثیت وہاں وہی ہے جو پاکستانی قبائلی علاقوں میں طالبان کی ہے جنہوں نے عوام کو بری حال بنا رکھا ہے اور خون ریزی کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ایک ایک دھماکے میں 250 لوگ مرتے رہے کبھی حماس نے ایک فقرہ بھی افسوس کا کہا؟ دنیا بھر میں درجنوں جگہوں پر مسلمانوں پر ظلم کی انتہا ہوئی حماس نے کوئی لفظ بولا؟ آج ساؤتھ افریقہ اور ملائیشیا سے بحریس لندن تک جو جلوس اور ریلیاں غزہ کے حق میں نکل رہی ہیں۔ یہ غزہ کے حق میں نہیں ہے اسرائیل کے خلاف ہیں۔ غزہ سے چار کی ریلی نہیں یہ اسرائیل سے نفرت کی ریلی ہے۔ اسرائیل میں محض 50 فیصد انتخاب پسند ہیں بقیہ لبرل اور ہائیم بازو کے لوگ ہیں جو غزہ کو آزادی دینے کے حق میں ہیں۔ پاکستان اسرائیل سے زیادہ مذہبی

## داستان ایک عامل کی

محمد افضل رحمانی

قسط: 5



سائیں کی حق تلفی ہوتی ہے پھر ٹو تو میرے دل سے اسی وقت گل گیا تھا جب ٹو نے ہری سنگھ کی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔ بتاتے کیا حاصل ہوا؟ اگر ٹو شیطان کے بہکادے میں نہ آتا تو ہو سکتا ہے ٹو شاد کے سر کا سائیں ہوتا۔ ٹو دنیا میں جتنی چاہے عیاشی کر لے لیکن جو لطف ہدی بچوں کے درمیان رہ کر آتا ہے اس کا تو اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ مگر جب اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں دیکھتا ہے تو اس کا کلیجہ ٹھہر جاتا ہے۔ ایک دن مجھے کہنے لگا شادو تیرا حق مجھ سے کبھی ادا نہیں ہو گا ٹو نے شیریں جیسے آٹھ بچے جن کی میری زندگی میں عجیب قسم کا رنگ بھردیا ہے ان کی موجودگی میں میرا کوئی شریک میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔

”اچھا شادو! منے کے ساتھ حیری شادی کیسے ہوئی، کیا اس نے کسی پہلوان کو ہرایا تھا؟“

”نہیں، ایک وجہ تو تیری بے وفائی تھی۔ ٹو ایک غیر مذہب کی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ٹو صرف پانی ہی نہیں بلکہ بے غیرت بھی ہے۔ ٹو نے ما بے دہر کی عزت وقار کو ہلکا دیا اور بیٹھیاں کو اس کے سر کے سائیں کے سامنے ذلیل کیا، ما بے کو تھانے اور کچھری چڑھایا۔ اس کو چھڑی لگوائی، تنک حرام ٹو نے ما بے کو کیا صلہ دیا؟ اس کی مچھلیاں اور محنت پر پانی پھیر دیا۔ ٹو اگر اس کیس سے بری بھی ہو جاتا تب بھی میں تم پر تھوکتا بھی پسند نہ کرتی۔ جس مرد کو غیر عورتوں کا چسکا پڑ جائے وہ انسان نہیں رہتا، سوار بن جاتا ہے۔ مجھے مرے ہوئے ما بے کی شرافت کی قسم، میری زندگی میں صرف مٹا پہلوان ہی داخل ہوا تھا اور یہی قسم میں منے کے بارے میں بھی اٹھا سکتی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں تم سے شادی کی خواہش مند تھی لیکن ساروں کو سمجھو میں نہیں ملا کرتیں۔ جس طرح غیرت مند مرد گندی عورت کو پسند نہیں کرتا اسی طرح غیرت مند عورت بھی گندے مرد کو پسند نہیں کرتی۔ مٹا خوبصورت، طاقتور، اور

”دیکھ رکھنے ٹو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔“ شادو نے کہا۔ ”تجھے زندہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ کیا ٹو تصور کر سکتا ہے کہ کوئی آدمی جس کو مردہ سمجھ لیا گیا ہو اچانک اس سے ملاقات ہو جائے تو انسان کتنی حیرت انگیز کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بول رکھنے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“

”ہاں، شادو! ٹو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں رکھائی ہوں لیکن اس راز کو راز ہی رکھنا ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ میرے دشمن مجھے قتل بھی کر سکتے ہیں یا پھر میں گرفتار ہو سکتا ہوں۔“

”ہاں، رکھنے! مجھے احساس ہے، میں اتنی کم محنت نہیں ہوں تیری اجازت ہو تو منے کو بتا دوں، منے پر مجھے مکمل اعتماد ہے۔ ویسے بھی مشکل وقت میں وہ تیرا بددعا گار ہو گا۔“

”جیسے تیری مرضی لیکن میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے، میں کسی بھی وقت یہاں سے دور بہت دور جا سکتا ہوں۔ اچھا، چھوڑ ان باتوں کو، کچھ اپنے بارے میں بتا۔“

”مجھ پر اللہ کا بہت فضل ہے۔“ شادو نے کہا۔ ”مٹا پہلوان میرے سر کا سائیں ہے، تیری بے وفائی اور پھر گمشدگی کے بعد میں نے منے سے شادی کر لی تھی اللہ نے مجھے آٹھ بیٹے عطا کئے ہیں۔ اگر ٹو ان کو دیکھے تو حیران رہ جائے گا اتنے خوبصورت اور طاقتور نوجوان ٹو نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔ منے اور میں نے مل کر انہیں اس انداز سے پالا ہے جس طرح شیر اور شیرنی اپنے بچوں کو پالتے ہیں۔“

”شادو! بتانا کبھی میرا خیال بھی آیا؟“

”ہاں کیوں نہیں، تیرا خیال آتا تھا لیکن اس انداز سے نہیں کیونکہ شادی کے بعد مٹائی میری محبتوں کا محور بن گیا تھا۔ ویسے بھی غیر مرد کا خیال رکھنے سے اپنے سر کے

ساتھ نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ شام تک ہم جتنا سڑک سکتے تھے کرتے رہے اندھیرا گہرا ہو گیا ہمیں کسی ہستی کی تلاش تھی کہ وہاں صدا کر کے پیٹ کا جہنم بھرتے۔ دور سے ہمیں مدھم سی روشنی کے آثار نظر آئے، ہم اس کی طرف چل پڑے۔ جب ہم روشنی کے قریب آئے تو خطرناک کتوں نے ہمارا استقبال کیا لیکن یہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ کتے کے بھونکنے سے گداگر کا رزق تو کم نہیں ہوتا۔ پھر ایک زمانہ آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ وہ کتوں کو اپنے مخصوص انداز سے واپس بلا رہی تھی۔ کتے شاید اس کی زبان کو سمجھتے تھے، فوراً ہی واپس چلے گئے۔ اتنے میں ہم اس مکان کے قریب پہنچ چکے تھے کہ اسی عورت نے بلند آواز سے پوچھا۔

”اللہ لو کو! تم کون ہو؟“

”ہم مسافر ہیں اور بھوکے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں، سونے کو جگہ بھی مل جائے گی اور کھانا بھی، اندر آ جاؤ۔“

جب ہم اندر داخل ہوئے تو ایک کالی کلوٹی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ وہ ایک خانقاہ تھی اور قبر کے سرہانے دیا چل رہا تھا جبکہ ساتھ دالے حجرے میں چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں اور تازہ حقہ جس کی چلم میں ابھی ابھی آگ بجری گئی تھی۔ ہم چار پائیوں پر بیٹھ گئے اور میں نے حقے کے کش لگانے شروع کئے۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی، عورت نے بلند آواز سے کہا۔

”ظہر جا، میں آ رہی ہوں۔“ اور پھر ایک منگ دھڑنگ ہاتھ میں لٹخا دوسرے ہاتھ میں بالٹی اور موٹے سے پر ریشوں والا کھنکول لئے اندر داخل ہوا۔ عورت نے اُسے ہادی آدھ کی خبر دی۔ وہ سیدھا کمرے میں آیا، اس نے لٹخا دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور بالٹی

میرے جواز کا آدمی تھا اور پھر میں اس کی پسندیدہ لڑکی تھی۔ اس نے مجھے برا کر مجھے جیتا تھا اور شادو کو ہرانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ٹو فلفل راستے کا انتخاب کر کے شادو کے بے پناہ پیار سے محروم ہو گیا اور اب در بدر کی ٹھوکریں کھانا تیرا مقدر بن چکا ہے۔ تجھے کوئی اہا کہنے والا نہیں، ٹو کسی کی محبت کا محروم نہیں، تیرا کوئی گھر نہیں، ٹو جب مرے گا تجھے کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔ مٹا ایک دفعہ ہائے کرے میں اور میرے بیٹے اس کی دل جوئی کے لئے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔“

”بس کر شادو!“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔ ”مجھے والد، پھوپھا اور پچھو کی جدائی نے نیم پاگل کر دیا ہے، اوپر سے تیرا ایک ایک لفظ برچھنے کی مانند میرے جگر کو کاٹ رہا ہے۔“

”لھیک ہے رکھنے! میں اب ہلتی ہوں، بہتر ہے ٹو جلد از جلد اس علاقے سے نکل جا۔ ہری سنگھ کے بیٹے تیری تاک میں ہیں اگر ٹو پہچانا گیا تو بہت بُرا ہوگا۔ ویسے ادھر یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ رکھنے کو ہری سنگھ نے قتل کر دیا ہے۔“

شادو جب جانے کے لئے مڑی تو میں نے اس کی جائیداد چال کو دیکھا، اس پر ابھی پڑھا پا اثر انداز نہیں ہوا تھا پھر مٹا پہلوان اُس سے آ ملا۔ شادو کو مٹنے کے ساتھ دیکھ کر میرا دل جیسے بیٹھ گیا ہو، پرانی درویش جاگ اٹھیں تھیں لیکن شادو نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ نڈر ٹو نے بھی غور کیا جب دل کے جانی بے رخی اختیار کر جائیں تو انسان کی کیا حالت ہوتی ہے؟“

”ہاں، رکھنے! انسان ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اس کی کیفیت اس شخص کی مانند ہوجاتی ہے جو پانی میں ڈوب رہا ہو اور اسے جھکے کا سہارا بھی میسر نہ آئے۔“

”نڈر! ٹو نے بالکل لھیک کہا ہے، میری بھی یہی حالت ہوگئی تھی۔ اب کیا ہو سکتا تھا، میں اپنے استاد کے

واپس آیا تو مجھے پتہ چلا کہ ملک مقتولہ عورت کو کہیں سے بھاگ کر لایا تھا۔ عورت کا تعلق کسی خانہ بدوش خاندان سے تھا، انہی لوگوں نے تلاشِ بسیار کے بعد دونوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میرے استاد کے دماغ نے پلٹا کھایا اور اس کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا۔ رکھنے اس جہنم میں میں نے جتنے بُرے کام کئے ہیں اگلے جہنم میں میری روح سکون نہیں پاسکے گی۔ میں بڑی آتما (یعنی خدا) کے ساتھ ملنا چاہتا ہوں اور ہمارے بار کے جہنم سے خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

### آداگون یا تباخ

یاد رہے کہ نجات کا تصور تقریباً ہر مذہب میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا پس منظر ہر مذہب میں مختلف ہے۔ چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے لہذا اس پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ صرف ہندو مذہب کے بارے میں چند لائنوں میں تھوڑی سی وضاحت کروں گا تاکہ آپ کے علم میں اضافہ بھی ہو اور کہانی بھی دلچسپ نہ ہو اور یہ بھی اس لئے کہ چونکہ کہانی کا تعلق اس سے بنتا ہے کیونکہ کہانی کا ایک کردار ایک ہندو جوگی ہے یاد رہے کہ ہندوؤں کے ہاں آخرت اور جنت و جہنم کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں اس کے برعکس آداگون یا تباخ کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح کو دوبارہ کوئی اور جسم دے کر اس دنیا میں لوٹا دیا جاتا ہے اور ہزاروں مرتبہ ایسا ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ایک جہنم میں بُرے کام کرے تو اگلے جہنم میں اسے سزا دی جاتی ہے اور اس سزا کے نتیجے میں اسے کتے، گدھے یا کسی اور جانور وغیرہ کی شکل میں جہنم ملتا ہے حتیٰ کہ جب تک ایک انسان انتہائی درجہ کی ریاضتیں، عبادتیں اور مشقتیں برداشت نہیں کر لیتا تب تک وہ اس آداگونی چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

زمین پر رکھی جو دودھ سے لہاب بھری ہوئی تھی۔ پھر موڈ سے سے کھنکول اٹا کر اور باری باری ہم سے معاملہ کیا۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہ تو اپنے ہی ”ٹھکے“ کا آدمی تھا۔ قریبی ہستی سے کھانا اور دودھ مانگ کر لایا تھا۔ ہم نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور حسب ضرورت دودھ پیا۔ اس نے اپنا مختصر تعارف کرایا، وہ اس خانقاہ میں بحیثیت مختلم محافظ اور متولی رہتا تھا۔ اس خانقاہ میں دکن بزرگ کے متعلق بھی اس قسم کے جموئے اور منالہ آمیز قصے مشہور تھے جو تقریباً ہر خانقاہ میں دکن بزرگ کے لئے مشہور ہوتے ہیں اور جن کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہم بہت ٹھکے ہوئے تھے لہذا جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے اور پھر ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب دو آدمی ملک پر گنڈاسوں سے پے در پے وار کر رہے تھے اور ملک کی دلدوز چٹخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ اس سے خوشتر کہ ہم حالات کو سمجھتے یا ملک کی مدد کو پہنچتے قاتل اپنا کام کر کے تیزی سے بھاگ گئے، ملک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہم باہر لٹکے تو دونوں کتے گھن میں مردہ پڑے ہوئے تھے اور عورت کی چار پائی کے لیے کافی مقدار میں خون جمع تھا لیکن وہ ابھی تیز تیز چھوٹے چھوٹے سانس لے رہی تھی۔

رکھنے ایہ دو ہرے قتل کا کیس ہے، خوشتر اس کے کہ صبح کی روشنی پھیلے اور یہ خبر قریبی گاؤں میں پہنچے ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔ میرے ہندو استاد نے کہا۔

”ہاں استاد! یہاں سے بھاگنے میں ہی عالیت ہے۔“ اور پھر ہم وہاں سے لٹکے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نامعلوم راستے پر چل پڑے۔ پتہ پھٹنے تک ہم کافی دور نکل گئے تھے لیکن اس الموسناک واقعے نے ہم پر گہرا اثر ڈالا تھا ہمیں اس واقعے کی تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن جب میرا استاد مر گیا اور میں اس علاقے میں

العتیدہ مسلمانوں کو ان کے گناہوں کے ازالے کے لئے سرور کونین کی شفاعت نصیب ہوگی۔ علماء کرام، حفاظ عظام، شہداء امت بھی گناہگاروں کے لئے سفارش کریں گے لیکن شفاعت کی اجازت رب العزت خود دیں گے۔ جو خوش قسمت جنت میں پہنچ جائیں گے پھر ابدالاً بآباد جنت میں ہی رہیں گے لیکن کچھ لوگ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جہنم سے آزاد ہو جائیں گے۔ کفار و مشرکین جہنم میں رہیں گے اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں ان کا ٹھکانہ ہو گا۔ ہندوؤں کے ہاں چونکہ یہ عقائد نہیں ہیں ان کی نجات کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان اپنے آپ کو انتہائی مشقتوں میں ڈال کر آتما یعنی خدا سے مل جائے۔ بس اس کی نجات ہوگی یعنی وہ ثانی اللہ ہو گیا۔ اب اسے ایک جہنم سے دوسرے جہنم میں آ کر سزا بھگتنے سے نجات مل گئی۔ جب تک وہ اپنے آپ کو اس قسم کی مشقتوں میں نہیں ڈالے گا۔ بار بار جہنم لیتا رہے گا اگر کسی جہنم میں اس نے نیک کام کئے تو اگلے جہنم میں اس کی مدح کی آرام اور پیش و عشرت کرنے والے جسم میں ڈال دی جائے گی اور اس نے برے کام کئے تو اس کی مدح اگلے جہنم میں کئے، گدھے، خنزیر وغیرہ میں ڈال دی جائے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اس سے میرا مطلب ہندو مذہب پر تنقید نہیں کیونکہ ہر شخص اپنے عقائد و خیالات میں بالکل آزاد ہے اور ہدایت دینا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا کہ یہ ایک مستقبل موضوع ہے یہاں میں مختلف مذاہب کا تقابلی نہیں کر رہا نہ میں یہاں دلائل عرض کر رہا ہوں کہ کون سا مذہب حق پر ہے البتہ یہ میرا ایمان ہے کہ نجات کے متعلق اسلام کا نظریہ برحق اور حقیقت پر مبنی ہے جسے عقل سلیم مانتی ہے۔

## نروان کی تلاش

پہو پھا اور پھوکی وفات اور ملک اور اس کی داشتہ

اپنے آپ کو انتہائی مشقت میں ڈال کر اور سخت ترین ریاضتیں کر کے اس آزاد کوئی چکر سے نکل کر نروان (نجات) کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آبادیوں سے دور جنگلوں اور غاروں میں رہنا، گرمی، سردی، بارش وغیرہ میں ننگے بدن رہنا۔ انہوں نے اپنی ریاضتوں کا مقدس عمل سمجھا۔ اپنے آپ کو دیوانہ وار تکلیفیں پہنچا کر انگاروں پر لیٹ کر، درختوں کی شاخوں پر گھنٹوں لٹک کر اور اپنے ہاتھوں کو بے حرکت بنا کر یا سر سے اونچالے جا کر اتنے طویل عرصے تک رکھنا کہ وہ بے حس ہو جائیں اور سوکھ کر کاٹا بن جائیں۔ تیز دھار لو کیلے پتھر سے ایک گال سے دوسرے گال تک اور ناک کے دونوں حصوں تک اور دونوں ہونٹوں کے آدھار پتھر اتار دینا اور اس طرح گھنٹوں کھڑے رہنا، تارہ کانٹوں اور نوکیلی کیلوں کے بستر پر لیٹے رہنا یا رات بھر ایک پاؤں پر کھڑے رہنا۔

(مقدمہ آرتھ شاستر صفحہ 99 بحوالہ کتاب التوحید، جنات کا پوسٹ مارٹم صفحہ 239)

اس سے ملتا جلتا تصور بدھ مت اور جین مت کے پروکاروں کا بھی ہے۔

نجات کے متعلق یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ چالیس دن جہنم میں رہنے کے بعد آخر کار جنت میں چلے جائیں گے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھ کر اپنے ماننے والوں کے لئے کفارہ ادا کر گئے۔

مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی اور قیامت تک رحوں کو اگر نیک ہیں تو علیین میں اور اگر بد عمل ہیں تو جمحین میں رکھا جائے گا اور جب قیامت قائم ہوگی تو اعمال کے موافق جنت یا جہنم کا حقدار قرار دیا جائے گا لیکن صحیح

دن انسان بغیر کھائے پئے کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ پھر ہم ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے وہاں کچھ اور ہندو نروان کی تلاش میں اپنے جسموں کو مختلف طریقوں سے اذیت دینے میں مصروف تھے۔ بعض کے جسم سوکھ کر کاٹا ہو گئے تھے اور ان کی شکل و صورت بھی انسانی نہیں رہی تھی۔ ایک سادھو کو میں نے دیکھا کہ اپنے ناک میں نیل ڈال کر نیل کے سرے کو درخت کی ایک اونچی شاخ سے باندھ رکھا تھا کہ زمین پر صرف اس کے پاؤں کی انگلیاں ٹکی ہوئی تھیں۔ میرے استاد نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت ناک اور دردناک بھی تھا اور دلخراش بھی۔ وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور دوسرے سادھو نے ایک بڑا لمبا اور موٹا سا اس کے گرد پوری طاقت سے کس دیا۔ پاؤں سے لے کر گردن تک اس نے اس کے جسم کوڑھانپ لیا۔ میرے روگنے کھڑے ہو گئے اگر کوئی اور استاد کے ساتھ اس طرح کرتا تو میں اپنی جان دے دیتا اور استاد کو اس مصیبت سے بچاتا لیکن یہ راہ میرے استاد کی خود پسند کردہ تھی اور ایک مذہبی معاملہ تھا جس میں میں نہیں کوئی دخل نہیں دے سکتا تھا۔ اتنے میں ایک سادھو نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور پھر غضبناک انداز میں مجھ پر برس پڑا۔

”ادلیچھ (ناپاک) ٹو ہماری پوتر (پاک) زمین کو اپنے گندے وجود سے ناپاک کر رہا ہے، ابھی اسی وقت یہاں سے چلا جا۔ ہمارے باپ نے تمام ملیجھوں کو ہندوستان کی پوتر دھرتی سے نکال باہر کیا ہے، ٹو بھی یہاں سے نکل جا۔ مجھے گاؤں کی قسم ہم تمہیں بھارت ماما کے دوکڑے کرنے کی سزا ضرور دیں گے۔“

استاد نے زبان بند کر لی تھی، وہ نہ بول رہا تھا نہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخری بار استاد کو دیکھا اور تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ ابھی میں نے دو تین میل سفر طے کیا ہو گا کہ ایک دیرالے میں جو منظر دیکھا وہ دل دہلا دینے والا

کے قتل کے واقعات ہندو جوگی پر گہرے اثرات چھوڑ گئے اور اس کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا۔

”رکتھے! میں اگلے جنم میں سزا برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے بڑے وثوق سے مجھے کہا۔ ”اس جنم میں جو اندوہناک گناہ میں نے کئے ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں۔ اب نروان (نجات) کی تلاش میں اس سریر کو مشقتوں اور ریاضات کی بھٹی میں جھونک کر بڑی آتما سے ملنے کا خواہش مند ہوں اور میرا مشورہ تمہارے لئے بھی یہی ہے کہ چھوڑ اس پاؤں بھری ناپاک زندگی کو اور آ میرے ساتھ اس قالی سریر (جسم) کو دکھ اور مصیبت میں ڈال کر جنم جنم کی مصیبتوں اور پریشانوں سے چھٹکارا حاصل کریں اور اگر ٹو اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتا ہے تو پھر میرا تیرا ساتھ اب بچ نہیں سکتا۔ ٹو اپنا راستہ لے اور میں سیدھا گنگا اشان کر کے اس بے کئے سریر کو ایسا حڑہ چکھاؤں کہ آتما خوش ہو کے میری روح میں سما جائے۔“

”استاد! میرا کون سا مذہب ہے، مجھے تو کوئی پتہ نہیں لیکن میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”دیکھ رکتھے! میں جب اپنے آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا تو تمہیں ساتھ کیسے رکھ سکتا ہوں اور اگر ٹو دنیا میں رہ کر اور پاپ کمانا چاہتا ہے تو تیری مرضی۔ میں نے تمہیں گناہ آلود زندگی گزارنے کے لئے کئی گر سکھا دیئے ہیں ان کو استعمال کر کے ٹو ہر قسم کی عیاشی کر سکتا ہے۔“

”لیکن استاد! میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہو گا۔“ میں نے بغد ہوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ استاد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر ہم نے گنگا اشان کیا، اس دوران استاد نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ میں آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ اتنے

فوج کی وردی میں تھے، میں نے اپنی تلواریں جو میں نے ایک مقتول مسلمان کے سامان سے احتیاطاً لے لی تھیں، جلد سے چھپانے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے دیکھ لی پھر انہوں نے ہماری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور گھوڑوں سے نیچے اتر آئے اور ایک چٹخ کر بولا۔

”لوئے تم دونوں سسلے (مسلمان) ہو؟“ اور پھر انہوں نے کرپا نہیں نکالیں اور ہم پر حملہ آور ہو گئے لیکن میری پہلوانی کام آگئی، میں نے پوری قوت سے ایک سکہ کو ڈنڈا لگا یا وہ قلابازیاں کھانا ہوا دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ دوسرا کرپاں سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کرپاں کا وار کرتا میں نے پوری قوت سے تلواریں اس کی گردن پر دے ماری اس کا سر اس کے دھڑ سے علیحدہ ہو کر تریز کی طرح دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ دوسرے نے ابھی پوری طرح اپنے آپ کو سنبھالا بھی نہیں تھا کہ میں اس کے سر پر پتھر پھینک گیا اور اسے دو تین ٹھنڈے لگائے اور تلواریں ہوا میں لہرائی اور پھر ایک پھر پور وار اس کے موٹے حصے پر کیا اس کا بازو دھڑکنے پر گر پڑا۔ پھر میں نے دوسرا وار اس کے دوسرے کاندھے پر کیا اس کا دوسرا بازو بھی جسم سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا لیکن ہمارے پاس وقت کم تھا۔ تیسرا وار میں نے اس کی گردن پر کیا، اس کا سر جسم سے علیحدہ ہو تو نہ ہوا لیکن وار کا مرکز تھا اس کی شاہ رگ کٹ گئی تھی اس کے بچنے کے کوئی چانس نہیں تھے۔ پھر ہم نے ان کی تلاش کی اور کافی رقم ان کی جیبوں سے ہمارے ہاتھ آئی۔ پھر ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔

سورج غروب ہونے کو تھا جب میرا ساتھی اچانک گھوڑے سے گر پڑا، میں گھوڑا روک کر اس کے پاس آیا اس کی پسلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کے زخم کھل گئے تھے۔ پھر اسے خون کی تے آئی ایک دو

تھا۔ سو کے قریب مسلمان مقتول پڑے تھے جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں اور تقریباً اتنے ہی زخمی تھے جن کی چٹخ و پکار سے دل دل رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اتنے میں ایک زخمی کو ہوش آگیا جو زیادہ زخمی تو نہیں تھا لیکن صورت حال کی سنگینی کی وجہ سے حواس پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور وردیشاندہ لباس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ میں مسلمان ہوں تو اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کہنے لگا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کیا رہے ہو؟“

”میں مسافر ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ یہ دلدوز منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے بتا یہ کیا معاملہ ہے؟“

”جہیں نہیں معلوم کہ پاکستان معرض وجود میں آگیا ہے، ہمارا یہ قافلہ پاکستان ہجرت کر کے جا رہا تھا کہ ہندو اور سکھ غنڈوں نے ہم پر حملہ کر دیا اس کے نتیجے میں جو صورت حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔“ پھر وہ اٹھا اور باری باری مقتولین کے چہرے دیکھنے لگا اور پھر ہڈیاں انداز میں چیخنے لگا۔ ”سب قتل ہو گئے بیوی، بچے، بچیاں، بھائی، والد، والدہ کوئی بھی تو نہیں بچا۔“

میں نے اسے تسلی دلاسا دیا اور مشورہ دیا کہ ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہئے۔ دوسرے زخمی چٹخ و پکار کر رہے تھے لیکن ہم ان کی قسم کی مدد کرنے کی ہزیشن میں نہیں تھے۔ ہم نے لاشوں اور زخمیوں کے سامان سے کھانے پینے کا سامان اکٹھا کیا اور ہندو غنڈوں سے بچنے والی کچھ رقم اور زلیور اپنی جیبوں میں ڈالا اور اندازے سے ایک طرف چل پڑے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ دیکھا دو آدمی گھوڑوں پر سوار ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ ہمارے قریب آئے تو ہم انہیں دیکھ کر گھبرا گئے۔ وہ دونوں سکھ تھے اور پولیس یا

میں زیادہ فرق نہیں ہے۔" ہم کمزروں کو پوجتے ہیں آپ گڑھوں کو۔"

رکتے نے ایک گولی ایم کی ٹکالی، میں نے دودھ کا ایک بڑا پیالہ اسے بھر کر دیا اس نے گولی نگلی جلد ہی اس پر غنودگی طاری ہو ہونے لگی۔

### سالانہ میلہ

رکتے کی داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا، میں نے کہا۔ رکتے چالیس سال ٹوٹے کہاں گزارے اور ہندو جوگی تمہیں کیسے ملا۔ پھر یہ سانپ کا آنا جانا اور نظروں سے لوگوں کا شکار کرنا اور فقیری کے دوسرے گڑھوں نے کہاں سے اور کیسے سکھے؟

"دیکھ نذیر! میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" رکتے نے کہا۔ "بلکہ تمہیں یہ سارے فن سکھا بھی دوں گا لیکن میلے کے بعد، اب صرف دو دن بعد میلہ لگے گا اور ان دو دنوں میں ہم قاریغ نہیں ہوں گے۔"

"نہیک ہے رکتے!" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

میلے کی تاریخ 16 سادوں کو طے تھی لیکن رکتے کا پروگرام تھا کہ اس تاریخ کو بدل کر جینہ کے آخر کی کوئی تاریخ مقرر کی جائے کیونکہ سادوں میں عموماً بارش ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ میلے کی روایتیں مانع پڑ جاتی تھیں لیکن مجبوری یہ تھی کہ عام لوگ اس تاریخ سے ہی متعارف تھے اور لوگوں کے ذہن میں 16 سادوں میںہ چکی تھی۔ اس دوران رکنا اپنی شعبہ بازیوں اور مکاریوں کی وجہ سے کافی معروف ہو چکا تھا۔ اس کی بیری مریدی کا سلسلہ بھی کافی عروج پر تھا اور اس کی آمدنی بے حد بڑے شمار ہو گئی تھی۔ لہذا اب اسے جہلی کرنسی بنانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے متعلق ایک یہ بات بھی مشہور ہو چکی تھی کہ گونا گور کی مدد اس میں سرایت کر گئی ہے۔ گونا گور کے

بچپن میں اس اور اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ظاہر ہے میں اس کے کفن و دفن کا انتظام نہیں کر سکتا تھا، میں نے اس کی لاش کو بے نور و کفن چھوڑا اور اپنے والا گھوڑا جو ذرا کمزور تھا اس کی جگہ دوسرا گھوڑا لیا اور ان دنوں کبھی راہوں پر چل پڑا۔ میرا گھوڑا تھک چکا تھا۔ آدمی رات کے بعد میں گھوڑے سے نیچے اترا، رنے سے گھوڑے کے پاؤں باندھے اور اسے چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود زمین پر لیٹ گیا۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا اور پھر میں اس وقت جاگا جب بہت سے لوگ مردہ جوتیں اپنے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں بڑبڑا کر اٹھا۔ صورت حال معلوم کی تو پتہ چلا کہ مسلمان مہاجرین کا قافلہ ہے جو پاکستان کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہے، میں بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ ہم پٹنہ ریت پاکستان پہنچ گئے۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا لہذا میں نے ایک خانقاہ پر ڈیرہ لگایا لیکن وہ خانقاہ اتنی مشہور نہیں تھی۔ آخر میں اس موجودہ خانقاہ پر پہنچا اور پھر اپنی شعبہ بازیوں اور مکاریوں سے موتیوں والی سرکار بن گیا اور اب جو صورت حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔

"نذیر! مذہب کے نام پر لوگ جتنی جلدی ہے وقف بنے ہیں اتنی جلدی اور کسی چیز سے نہیں بنتے۔ میں نے اپنی زندگی میں ہندو مذہب میں جو دھوکہ اور فراڈ دیکھا ہے اور کسی مذہب میں نہیں دیکھا اور ہماری یہ فقیری والی لائن ہندوانہ طریقے سے ملتی جلتی ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ ہمیں پتھر کے بت کھڑے کرنے پڑتے ہیں اور ہمیں قبر اور مزار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے مولانا آزاد کی ایک بات یاد آگئی جب انہوں نے نہرو کے سامنے ہندو مذہب پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہاری عقل میں اتنی بات بھی نہیں آتی کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو پوجتے ہو اور انہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہو۔ تو نہرو نے جواب دیا تھا۔ مولانا ہم میں اور تم

اگست 2014ء

33

مکات

## داستان ایمان فروشوں کی

مصنف: عنایت اللہ

ان کہانیوں میں آپ کو سلطان صلاح الدین ایوبی اور صلیبیوں کے جاسوسوں اور تحریک کاروں (جن میں حسین لڑکیاں بھی تھیں) سراغرسالوں اور کمانڈرو جاتہازوں کے سنسنی خیز ایمان افروز ڈرامائی تصادم، زمین دوز تعاقب، فرار، محبت اور نفرت کی کش مکش کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں ملیں گی۔

قیمت مکمل سیٹ = 10 روپے

اور ایک سیٹ لکھن پیدا ہوا

ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے دلولہ انگیز، سنسنی خیز ایمان تارہ کرنے والے اور جذبات کو بار دینے والے واقعات جن میں ہندوؤں کی خیاری، شہید، بازی بھی ملے گی اور مذہب کے نام پر عصمتوں کا بیوپار کرنے والے بھی ملیں گے۔

قیمت مکمل سیٹ = 10 روپے

کتابوں کی داستان

بالہ گراؤٹ لٹک میکلورڈ روڈ۔ لاہور

فون: 042-37356541

بارے میں عام لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ سانپ اس کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔ پھر لوگوں میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ ہر جمعرات کو ایک بہت بڑا سانپ رکھنے کی خانقاہ سے ایک دوسری مشہور خانقاہ پر جاتا ہے جو وہاں سے کئی میل دور تھی اور کافی لوگوں نے ایک بہت بڑے اڑدھے کو اس طرف جاتے دیکھا بھی تھا۔ بہر حال اس قسم کے کئی واقعات رکھنے کے بارے میں مشہور ہو چکے تھے اور وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا اس کی خانقاہ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہو چکے تھے اور ان کی دلی مرادیں پوری ہوتی تھیں۔ کئی لڑکیاں اور عورتیں ذاتی طور پر بھی اس سے فیض یاب ہو چکی تھیں جو میلے دانے دن بن سنور کر آتی تھیں۔ راجہ امدت تو بھارہ رکھنے کے پاسک بھی نہیں ہوگا۔ ہندو جوگی کے بتائے ہوئے سنیا سی نے اُسے کسی میدان میں کبھی ہارنے نہیں دیتے تھے۔ اس کی شیطانی اور حیوانی طاقت سے میں بخوبی آگاہ تھا لیکن وہ خود مذاہب الہی میں گرفتار ہو کر ایک خوفناک اور شرمناک بیماری میں گرفتار ہو گیا تھا جس کا تذکرہ میں پیچھے کر چکا ہوں۔

”اچھا نہ میرا ان باتوں کو پھوڑا۔ میں نے کہا۔“  
”اور میلے کے بارے میں بتا۔“

”ہاں قاری صاحب! میں امدت کی آ رہا ہوں۔ جس دن صبح میلہ شروع ہوا تھا اس رات کو ساری رات ڈھول بجانے والوں نے مسلسل ڈھول بجائے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ عورتیں نڈرہ نیاز لے کر خانقاہ میں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ روٹ، سرخ اور تارے سنکڑوں کی تعداد میں آنے شروع ہو گئے جو خانقاہ سے ذرا بہت کر ایک بہت بڑے احاطے میں جس کے گرد چار دیواری تھی، خدمت گزاروں نے وصول کر کے کھلے چھوڑ دیے۔ یہ خدمت گزار رکھنے کے مرید تھے جو ثواب سمجھ کر یہ کام سرانجام دے رہے تھے۔ عورتیں رکھنے کے

ماتنے نذر پیش کرتیں پھر اُسے سلام کرتیں مگر اس کے ماتنے بعد وہ بڑھو جاتیں مگر اس کی مٹی چابی شروع کر دیتیں۔ رکھا ایک شان ہے غازی سے ایک گندی گالی بکتا اور کہتا حرام کارو دوسروں کی ہاری بھی آنے دو۔ عورتیں بے اختیار کہیں بسم اللہ کرے!

## مکافات عمل

رکھنے نے مجھے کہا۔ نذر پڑا تو اٹھ جا اور خدام بے کہہ کر گندم کے رکھنے کا انتظام کر کیونکہ اب لوگ گندھوں پر گندم لاد کر بھی نیا تر لارہے تھے۔ میں نے چند نوجوانوں کو گودام لے کر ایک کمرہ دکھایا اور انہیں حکم دیا کہ گندم اس کمرے میں رکھی جائے۔  
"ٹھیک ہے ہادامی!" انہوں نے جھک کر بڑے ادب سے کہا۔

پھر میں واپس رکھنے کی طرف چل پڑا کیونکہ پہلے کا اصل لطف تو رکھنے کے پاس تھا ابھی میں چند قدم ہی گیا تھا کہ میری نظر ایک پیکر حسن پر پڑی۔ چوٹ قد، موٹی آنکھیں، پتلے لب، چمکی ناک قلم کی طرح تر چھی ہوئی کوار سے تیز، چاندی رنگ، کمر کے نیچے تک لہرائی ہوئی چٹائی جیسے کالی ناک، یا توئی ہونٹ جو اس کے چاندی رنگ چہرے پر مبالغہ کی حد تک سجے ہوئے تھے۔ اس کا ایک اچھٹا سوائی حسن کا شاہکار تھا۔ میرے قریب آئی اور مجھے جھک کر سلام کیا۔

"موتیوں والی سرکار! میں آپ کی زیارت کے لئے آئی ہوں۔" شاید وہ پہلی مرتبہ آئی تھی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اُسے اصل موتیوں والی سرکار کا پتہ بتاؤں کیونکہ رکھا اس قسم کے نازک پھولوں کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ اس کے جسم میں زاہد روں کے راسخ عین کی روح سراپت کر چکی تھی پتہ نہیں عورتوں کے لئے اس میں کون سی کشش تھی کہ وہ شمع پر پھولوں کی طرح اس کے گرد

مٹھ لایا کرتی تھیں۔ رابعہ جس کے عشق نے مجھے دین و دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا اس لڑکی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی گور رابعہ اب بھی میرے دل میں بسی ہوئی تھی لیکن اگر کوئی مجھے اختیار دیتا اور میرے بس میں ہوتا تو میں رابعہ کے مقابلے میں اس لڑکی کو ترجیح دیتا اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یکدم یہ لڑکی میرے حواس پر کیوں چھا گئی تھی۔ میرے خیال میں مرد کی شیطانی فطرت ہے کہ وہ جس عورت سے فائدہ اٹھا لیتا ہے پھر وہ اس کی نظر سے گر جاتی ہے اور پھر وہ دوسری اور تیسری کی جستجو میں جت جاتا ہے اس لئے کسی گھاگ وانٹور نے یہ مقولہ تخلیق کی ہے کہ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔" مرد شکاری ہے اور عورت شکار اور شکاری کو حق حاصل ہے کہ اپنے شکار کو قابو کرنے میں جیسا چاہے حربہ اختیار کرے لہذا یہ ذمہ داری شکار پر آتی ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے۔ یقین کریں قاری صاحب! مرد جتنی بزدل جس دنیا کے تختے پر موجود نہیں بشرطیکہ عورت اپنا دفاع کرنا جانتی ہو کیونکہ غلط روی کی ابتدا عموماً عورت کی طرف سے ہوتی ہے اگر عورت کسی مرد کو دھتکار دے تو یہ دم دھا کر بھاگ جائے گا۔ ہاں بعض دفعہ مرد عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر زبردستی پر بھی اتر آتا ہے لیکن یہ شاذ و نادر ہوتا ہے۔ عموماً عورت کی طرف سے حوصلہ افزائی اس گیدڑ کو شیر بنا دیتی ہے۔

بہر حال میں اس قتالہ عالم کو ایک حجرے میں لے گیا اور اس سے خانقاہ پر آلے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگی۔ موتیوں والی سرکار شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک گودہری نہیں ہوئی، سنا ہے آپ کی دعاؤں میں بہت تاثیر ہے اس لئے نیاز لے کر آپ کے قدموں میں حاضر ہوئی ہوں۔

"ٹھیک ہے ہالک!" میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے لئے ہمیں خوش

کے پاس پہنچا وہ عورتوں کے جبرمٹ میں بیٹھا غریب  
وصول کر رہا تھا، میں اس کے قریب گیا اور اس کے کان  
میں کہا۔ رکھتے تیرے لئے ایک ہیرا کمرے میں بند کر آیا  
ہوں خدا کی قسم تو دیکھے گا تو پاگل ہو جائے گا اتنی حسین  
لڑکی تو نے آج تک نہیں دیکھی ہوگی اٹھ جلدی کرو وقت کم  
ہے یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ رکھتے کی رال چکنے لگی  
وہ میرے ساتھ چل پڑا میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو  
رکھتے کی آنکھیں تازے لگ گئیں۔

"لوئے غریب تم نے ٹھیک کہا ہے کیا یہ اسی دنیا کی  
عورت ہے؟"

"ہاں رکھتے! میری دریافت پر تمہیں کوئی شک

ہے؟"

"نذیر دروازہ بند کر دو کوئی دیکھ لے گا، لوگوں کا  
رش بہت زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔" رکھا کمرے میں داخل  
ہو گیا میں نے اوپر سے کنڈی لگا دی۔ ذرا ہی دیر بعد  
رکھتے نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور بلند آواز سے کہنے  
لگا نذیر جلدی سے دروازہ کھول میں نے جونہی دروازہ  
کھولا۔ رکھتے نے ایک کڑا کے دارڈھ مہری گروں پر لگایا  
میں تلا بازیوں کھاتا ہوا دور جا کر ایہ پہلا موقع تھا کہ رکھتے  
نے مجھے مارا تھا۔ میرے حواس پر اگندہ ہو گئے۔ ابھی میں  
پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ رکھا میرے قریب آیا  
مجھے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور ایک دروازہ چپت  
میرے منہ پر رسید کی مجھے دن کو تارے نظر آنے لگے پھر  
وہ بجلی کی طرح کڑک کر کہنے لگا۔

"بے حیا تمہیں پتہ ہے وہ لڑکی کون ہے؟"

"نہیں رکھتے! مجھے معلوم نہیں۔"

"او عالم وہ جنت ہے میری پھوکی بیٹی۔" مجھے  
اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن میں نے صت کر کے کہا۔  
رکھتے بھلا مجھے کیا معلوم تھا۔"

ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" رکھتے نے بڑے قلق کے

کہتا ہوا۔"

"سرکار! آپ جس طرح خوش ہوں گے میں  
کروں گی۔" اس نے کہا۔ "آج بھی میں نیاز لے کر  
حاضر ہوئی ہوں اگلے جنترات مزید نیاز لے کر آؤں گی۔"  
"دیکھو ہالک ہم نیاز سے خوش نہیں ہوتے۔"

"سرکار! آپ جس طرح خوش ہوتے ہیں میں  
اس طرح کر لوں گی۔"

"اوہ پھر سمجھو تمہاری دلی مراد پوری ہو گئی ادھر  
ہمارے قریب آؤ۔" وہ میرے قریب ہو گئی میں سمجھا کہ  
چھلی جال میں پھنس چکی ہے لیکن جب میں نے اس سے  
چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تو اس کے سفید رخساروں پر  
یکدم گلابی رنگ چڑھ گیا اور پھر وہ گہرا گلابی ہو گیا پھر ایسا  
محسوس ہوا کہ ابھی رخساروں سے خون بہہ نکلے گا۔ پھر وہ  
ہوئی تو اس کی آواز میں ٹپکے ارتعاش کے ساتھ خود احتدائی  
غصے اور تذذب کی کیفیت بھی کہنے لگی۔

"سرکار! آپ کو یہ حرکات زیبائیں ہیں میں یہاں  
سائل بن کر آئی ہوں عزت بردار کروانے نہیں اور دیکھو  
جب میں نے عزت گنوا لی تو بچے کا کیا فائدہ؟ یہ جسم  
میرے سر کے سائیں کی امانت ہے، میں بچے پر بھی لعنت  
بھیجتی ہوں اور تم پر بھی۔" ادھر اس کی جسمانی ساخت اور  
حسن کی ٹھہری اوپر سے انکار ای چیزوں نے میرے تن  
بدن میں آگ لگا دی۔ قاری صاحب میں حلیہ کہتا ہوں  
کہاں بھی جواں، طاقتور، طویل القامت، خواہ صورت  
لوکی نے میں نے زندگی میں پہلے دیکھی تھی نہ آج تک  
کہیں نظر آئی ہے میں کسی قیمت پر موقع گنوانا نہیں چاہتا  
تھا۔

"ہالک ادھر دیکھو!" میں نے کہا تو اس نے غیر  
اختیاری طور پر میری طرف دیکھا اور پھر میری نظروں کے  
حصار میں جکڑی گئی۔ پھر وہ میرے اشاروں پر ناچنے کے  
لئے مجبور ہے بس تھی۔ پھر میں دروازہ بند کر کے رکھتے

مان گیا کیونکہ اس ناپاک ماحول سے میں خود بھی نکلنا نہیں چاہتا تھا لیکن ذرا سا موڑ بنانے پر رکھنے کے عتاب سے بھی بچ گیا اور آئندہ کے لئے رکھا بھی مزید محتاط ہو جائے گا۔

جنت جحرے کے دروازے پر کھڑی ہونٹوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اس کا دماغ ابھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل کے صد ہزار ٹکڑے ہو گئے کہ جنت ابھی چلی جائے گی مجھے اس انسان پر جلن اور حسد ہونے لگا جو اس کے جسم و جان کا مالک تھا۔ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں خوب سیرت بھی تھی یہ کوئی مردانگی نہیں تھی کہ اسے بے بس کر کے اس کی عزت برباد کر دی جائے وہ اب بھی پاک تھی کیونکہ اس کا دل پاک تھا۔ پھر وہ لگتی منگتی ہماری طرف بڑھنے لگی اور ہمارے قریب آ کر رکھنے کو دوسرے دیکھنے لگی پھر اس کے ہونٹ بٹے اور کہنے لگی۔

”موتیوں والی سرکار میں نے اس سے پہلے کہیں آپ کو دیکھا ہے مجھے ایسا یاد پڑتا ہے جیسے آپ میرے والد ماجد پھلوان کے جنازے پر ہمارے گھر آئے تھے اور میرے والد اور والدہ کی ہنٹوں کا دیدار کیا تھا۔“

”نہیں مالک! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ہم کبھی کسی کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔“

”ہاں ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔“

”بالکل تمہارا نام کیا ہے؟“

”موتیوں والی سرکار! میرا نام جنت ہے۔“

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”سرکار! آپ کی دعا لینے آئی ہوں میری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی گودہری نہیں ہوئی۔“

”تمہاری شادی کہاں ہوئی ہے؟“

اس نے ایک گاؤں کا نام لیا۔ وہ گاؤں ہماری خانقاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ساتھ کہا۔  
”دیکھ رکھنے اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا گزرا وقت بھی کبھی ہاتھ آیا ہے؟“  
”لیکن نذیر! ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

”رکھنے! تو جو سزا دینا چاہتا ہے مجھے دے لے۔“  
”میں تمہیں کون سی سزا دوں گا؟ نے وہ جرم کیا ہے جس کی سزا بھی تجویز نہیں کی جاسکتی۔“ پھر یکدم میرے دماغ نے پلٹا کھایا میری ریزہ کی ہڈی میں درد کی ٹیپیں اٹھ رہی تھیں اور میرے گال پر جیسے کسی نے آگ کا انگارہ رکھ دیا ہو میں نے غصے اور جوش کی حالت میں کہا۔

”دیکھ رکھنے! جن عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ تو بے دھڑک گناہ کیا کرتا تھا وہ بھی تو کسی کی بیٹیوں کی بیٹیاں ہی ہوتی ہیں اس وقت تیری غیرت کہاں چلی جاتی ہے۔ جب تو شیطانی کھیل کھیلتا ہے اور بے خیالی کرتا ہے۔ اس وقت تیری غیرت جوش میں نہیں آتی؟ یاد رکھ رکھنے جو کسی کی امی بھین کی عزت سے کھیلتا ہے اس کی اپنی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی۔ بتا تو نے کتنی نازک نظیوں کو سلا ہے اور اب بھی اس کا حیا ہے میں بھی تجھے شرم نہیں آتی۔ میں تیرے کروت لوگوں کے سامنے بیان کر دوں تو تیری اولیائی کا لہواہ تار تار ہو جائے گا۔ اب تو جنت کی لٹی ہوئی عزت کا ماتم کر میں تجھ پر تین لفظ بھیج کر ابھی یہاں سے چار باہوں۔“

رکھنے کو جب فام بگڑنا نظر آیا تو اس کی غیرت جھٹک کی طرح بیٹھ گئی وہ منت سماجت پر اتر آیا اور مجھے منانے کی کوشش کرنے لگا گواہی دیتی طور پر ابال آیا تھا لیکن خبیث اور بے غیرت انسان جلد ہی کئی جواز ذہن میں پیدا کر لیتا ہے۔ زانی انسان ایک ایسا بے غیرت حیوان ہے جو خود اپنے ہاتھ سے اپنے گھر کی طرف زنا کا راستہ بناتا ہے۔ میں تھوڑے سے تذبذب کے بعد جلد ہی

## خواہشات

☆ لامحدود خواہشات محدود زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں جبکہ انسان کی زندگی میں "صبر" اور "شکر" دونوں کا بڑا درجہ ہے کیونکہ صبر مصیبت کو نالا ہے اور شکر نعمت کو بڑھاتا ہے۔ (شیخ سلیمان صدیق)

ہے۔ پھر اس نے نیاز پیش کی اور دوائی کی قیمت پوچھی۔ رکھے نے کہا۔ دیکھو بالک ہم تم سے نیاز نہیں لیں گے اور دوائی کے پیسے بھی نہیں لیں گے اور یہ ہمیں آدھ ہوا ہے ہم حیرت مرشد کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتے۔

"لیکن سرکار! میں کوئی غریب نہیں ہوں ہم پر اللہ کا بہت فضل ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہمیں مرشد کا جواب دینا ہے ہم اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔"

اب جنت لا جواب ہو گئی رکھے نے حیلے سے دونوں باتوں میں بھر کر رو پے نکالے اور جنت سے کہنے لگا۔ بالک! جمولی پھیلاؤ یہ بھی میرے مرشد کا حکم ہے جنت نے جمولی پھیلائی اور رکھے نے رو پے اس کی جمولی میں انڈیل دیے پھر اس کے سر پر شفقت سے پیار دیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ سلام کر کے چلی گئی۔ جوں ہی وہ خانقاہ سے باہر نکلی رکھنا زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا ایک بازو اپنی آنکھوں پر رکھا پھر وہ اس قدر غائب ہو گیا کہ میرا دل بھر آیا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور ایک کان میں شہادت کی انگلی دے کر ترنم سے یہ شعر پڑھنے لگا۔

پاسے پاسے مٹی جوانی پاس نہ سدا یا راں  
ساقی کون محمد بخش! درد دہلے غم خواراں  
مان نہ کرے روپ گئے وا وارث کون حسن نا  
سدا نہ رہن شاخاں ہریاں سدا نہ پھول چمن دا

"ٹھیک ہے بالک! ہم تمہارے لئے دعا کریں گے لیکن ہماری کچھ شرائط ہیں اگر تم وعدہ کر لو کہ ہماری شرائط پر عمل کر دو گی تو تمہاری گود ہری ہو جائے گی۔"

"سرکار! میں ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ میرے سر کے سائیں کی حق تلفی نہ ہو۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"پھر بتائیں سرکار!"

پہلی شرط تو یہ ہے کہ تم آئندہ ہری زندگی کسی خانقاہ یا کسی محاور کے پاس نہیں جاؤ گی اگر تم نے ایسا کیا تو پھر ہماری دعا بے اثر ہو جائے گی اور دوسری شرط یہ ہے کہ جب تمہاری گود ہری ہو جائے تو پھر بھی غدر نہ کرنا لے کر اس خانقاہ پر نہیں آنا بلکہ گاؤں کی مسجد میں جو توفیق ہو حصہ دار رہنا یا کسی دیوہ یا جیم کو حسب توفیق رقم ادا کروانا اور اگر تم ساری زندگی کسی خانقاہ پر گئی تو تمہاری اولاد میرے جائے گی اور ہمیشہ بے اولاد رہو گی۔ بتاؤ میری یہ شرطیں منظور ہیں؟"

"جی موتیوں والی سزا میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اور آپ کو زبان دیتی ہوں۔ آپ نہیں جانتے ہیں جس باپ کی بیٹی ہوں وہ بھی زبان کا پکا تھا اگر آپ میری والدہ کو دیکھ لیتے تو اس کے چہرے پر جہا کی چادر اور نیکی کا نور آپ کو ضرور نظر آتا۔" اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے سونے سونے آنسو گرنے لگے۔ رکھے کی آنکھوں میں بھی ساون اتر آیا اور رکھے نے مجھے کہا۔ نذیر اوجھر مجھ سے دواؤں والا اٹھیا لے کر آؤ۔ جب میں واپس آیا تو رکھے نے جنت کو کچھ دوائیں دے کر اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ کون کون سی دوا اس کے خاوند نے کھائی ہے اور کون کون سی اس نے خود کھائی ہے۔

"انچھا اب تم جاؤ اور میری باتوں پر عمل ضرور کرنا۔"

"موتیوں والی سرکار! یہ میرا آپ سے وعدہ

پہلے کھڑکی کا پردہ گرام بھی تھا۔ وقت مقررہ پر قلف ملا توں کی تھیں میدان میں اتریں شائقین کھڑکی سے دل بھر کر لطف اندوز ہوئے لیکن ابھی پہلے کا سب سے اہم اور دلچسپ پردہ گرام رات کو ترہیب دیا گیا تھا اور وہ موسیقی کا پردہ گرام تھا ملک کے مشہور گانے والے اور گانے والیاں آ کی ہوئی تھیں لوگ بڑی شدت سے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

### اقبال بالو عرف بالو بکھری

گانے والیوں میں بالو بکھری سب سے معروف اور مشہور تھی۔ خوبصورت، نین نقش کے علاوہ اتنی سریلی کہ سامعین کا دل سوہ لیتی تھی۔ اس زمانے میں گانے والی کو بکھری اور سازندوں کو بکھر کہا جاتا تھا۔ ان میں لٹال اور بھانڈ بھی تھے جو اپنی باری پر مختلف جھتیں کر کے لوگوں کو ہلاتے تھے۔ بالو بکھری کی جو عفت عوام میں مشہور تھی وہ یہ تھی کہ وہ شرم و حیا سے ہانکل پاک تھی۔ مردوں کے مجھے میں بے دھڑک اپنے فن کا مظاہرہ کرتی جس شخص سے روپیہ وصول کرتی اس کی گال پر چٹخی ضرور بھرتی۔ مجھے میں سے جب کوئی روپیہ دکھاتا تو کئی کئی مردوں کے اوپر سے چھلانگ لگا کر متعلقہ آدمی تک پہنچ جاتی۔ بالو نے کئی گیت گائے اور کئی لوگوں کی جیبیں خالی کیں۔ پھر اس نے مخصوص انداز میں ڈانس کیا اس کے سر پر پانی کی چائی بھر کر رکھ دی گئی اب صرف وہ اپنی کمر ہلا رہی تھی جبکہ دوسرے اعضاء ہانکل ساٹن تھے۔ حتیٰ کہ پانی سے اباب بھری جاتی سے ایک قطرہ پانی باہر نہ نکلا۔ رکھا اور میں گاؤں کیوں کے سہارے زمین پر ہمارے لئے بچائے گئے مخصوص قالین پر بڑی شان سے بیٹھے مظلوم ہو رہے تھے۔ بالو شاید تھک گئی تھی اس نے ایک نوجوان بڑے کی طرف اشارہ کیا اس کے بال شانوں تک لٹکے ہوئے تھے وہ چٹائے کر کھڑا ہوا تیرا اور بکھری اس نے اپنے مخصوص

سدا نہ ہوو ہمیشہ بکھری سدا نہ وقت اسن دا مالی حکم کیوں نہ دیوے اج سیر کرن دا سنگدے ساٹھی لدھی جاندے ساٹھی سدا ساتھ لدتا ہتھ نہ آدے فیر محمد جان ایہہ وقت وہاں مگر شکاری کرے تیاری ہار چہ بندیاں ہرماں جو چڑھیا ایا ڈھینا لوڑک جو تھیا اس مرماں پھوپھا، پھوپھی، والد سوہنا دے گئے وارغ جدائی جنت توں بھڑ دیتا آتے وجہ جنت کر کے دھائی پھوپھا جنت تیری میرے کول۔ اج پرونی آئی شامت میرے عملان والی دیتی اونہوں آئی رکھنے کی سریلی، بلند اور دل سوز آواز پر اس کے گرد ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ رکھا شاید اپنے حواس میں نہیں تھا میں نے آگے بڑھ کر رکھنے کو بازو سے پکڑا اور بڑے ادب سے کہا موتیوں والی سرکار لوگ آپ کا دیدار کرنے کے لئے آئے ہیں آئیں اپنے آستانہ عالیہ میں شریف رہیں۔

لوگوں کی بہو، بیٹیوں کی عزت سے کھیلنے والا مکار، معصوم بچوں کا قاتل دھوکے باز، جب اپنے گھر کو آگ لگی تو حواس کھو بیٹھا لیکن موقع اور صورت حال کی نزائت کو سمجھتے ہوئے جلد ہی حواس پر قابو پا گیا۔ عقیدت مند جبکہ جبکہ کر سلام کر رہے تھے اور وہ ایک شان بے نیازی سے واپس اپنے حجرے کی طرف چل پڑا۔ میلہ اب اپنے پورے جوہن پڑا گیا تھا ہزاروں کی تعداد میں عقدیت مند اور تماشا بین پہنچ چکے تھے۔ مختلف ڈکانیں ج چکی تھیں۔ کھیل تماشے والے اپنے اپنے کتب دکھانے میں مصروف تھے۔ خانقاہ کو چومنے چائے والے اپنے کام لگے ہوئے تھے، روٹ، مرے، بکرے، پتنگروں من گندم اور نقدی کے بازار لگ گئے تھے۔ فالودے کی ڈکانوں پر بچوں کا رش تھا۔ مضامی کے شوقین جلیبی سے شوقی پورا کر رہے تھے۔ عصر سے ذرا

ہوتا جیسے ٹھنڈے دھوپ کے حکم اور غشا کے مطابق بنا رہے ہیں۔ ذرا دیر بعد چٹا بجانے والا لڑکا اس کے قریب آیا اس نے چٹے کی آواز ٹھنڈے دھوپ کے ہم آہنگ کر دی تو ایک ماں بندہ گیا اب بالو بھری نے شر بانہی اور رکھے کی جگہ لگانے لگی۔

میری موتوں والی سرکار  
لاڈلی ڈبے ڈبے پار  
اس کدی نہ منی پار  
اوتے جگہ میرا جگہ  
میری جگہ دے دھاکے بکے  
جگہ اوہے مونہوں جگہ  
جنہوں سٹ عشق دی جگہ  
اوتے جگہ میرا جگہ  
سائیں بوہڑاں والیا جگہ  
ام ٹھنڈوں ٹھنڈوں جی سائیاں  
نالے گھر گھر بوہڑاں توں لائیاں

رکھے کے عقیدت مندوں نے بالو بھری پر روپوں کی بارش کر دی۔ رکھا اس کے قریب آیا اس نے دونوں ہاتھوں میں روپے بھرے ہوئے تھے پھر اس نے بالو کے سر پر سارے روپے بھرا کر دیے۔ بالو بھری کی تیزی سے پیچھے ہٹی اور پھر ایک خاص انداز میں ہنسی ہوئی رکھے کے ہاتھوں قریب آ گئی اس نے ایک ٹھنڈا زمین پر پکا اور سر کو اتنی تیزی سے گھمائے لگی کہ اس کا پرانہ روپے کے چہرے پر پڑنے لگا۔ پھر وہ ایک ٹھنڈے سے کھڑی ہوئی اور سر میں سینے لگی ساتھ ہی وہ ایک ہاتھ سے رکھے کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھی۔

ایہہ موتیاں والی سرکار  
کینڈا بوہڑاں لپڑا درہا  
بانجوں پھڑا جنہوں اک وار  
پڑا جگہ اوہا پار

انداز میں چٹا بجا کر گانا شروع کیا۔

ملاحی حیرے دیکھنے لوں جوگی اتر پہاڑوں آیا  
بھنگی رات میں اس کی سریلی آواز سے مجمع مسجد ہو گیا۔ ظالم نے ایسا لہجہ پایا تھا کہ لوگوں کی آنکھیں تارے لگ گئیں وہ جب خاص انداز سے ہالوں کو جھٹکا اور آواز کے زیر و بم کے ساتھ چٹے کی آواز کو ہم آہنگ کرتا تو لوگوں کے ہاتھ غیر ارادی طور پر جیبوں میں چلے جاتے اور پھر لوگوں نے اس پر روپوں کی بارش شروع کر دی۔ رکھا دونوں ہاتھوں سے اس پر روپے ٹار کر رہا تھا۔ اس کی سریلی آواز اور انداز بیان نے لوگوں پر جادو کر دیا۔ بالو بھری کے اندر شیطان طول کر گیا وہ آگے بڑھی اور اسے سینے سے لگا کر دھمال شروع کر دی اب پورے مجمع پر شیطان مسلط ہو گیا لو جوالوں نے آوازے کئے شروع کر دیے تینوں شیطانی اٹھار ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ آواز دوسرا اور حسن دوسرے پھر سمجھ گئے کہ پورے مجمع پر شیطانی اور شہوانی ماحول مسلط ہو گیا ہے یہ نقصان وہ بھی ہو سکتا تھا لہذا انہوں نے بہت دیر کو اشارہ کیا۔ بھاڑ اپنی مخصوص اور مستحکم خیز آوازوں سے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔

بھاڑوں نے اپنی جگہوں سے بے شمار روپے نوٹے۔ پھر بالو بھری شونخ میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں نمودار ہوئی۔ گیس کی روشنی میں میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بالو بھری ابھی ابھی کوہ قاف سے آئی ہے۔ گیسوں میں دوبارہ قیل ڈالا گیا اور ہوا بھری لگی جس سے ان کی روشنی اتنی بڑھ گئی کہ دن کا گمان دونے لگا۔ اب بالو رکھے کے سامنے کھڑی ہو گئی اس نے پاؤں میں ٹھنڈے بانہے ہوئے تھے اس نے کمر دکھائی اور پہلے ایک پاؤں کو مخصوص انداز میں زمین پر مارا ٹھنڈے دھوپ کی آواز گونجی پھر باقاعدہ ڈانس کرنے لگی وہ اپنے پاؤں اس ترتیب سے زمین پر مارتی کہ ایسا محسوس

اوسے سائیں میرا جگنی  
میں مقلتی اہے در دی آں  
نالے خادم اہے گھر دی آں  
مٹھا اہے قدمیں تے دھر دی آں  
اوسے در میرا جگنی

رکھا دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے لگا۔ نذر میں  
آئی ہوئی ساری دولت ایک کھجری پر لٹا دی پھر اپنی  
انگوٹوں سے سونے کی انگوٹیاں اتار کر بالو کو اپنے قریب  
بلایا اور اپنے ہاتھ سے انگوٹیاں اس کو پہنا دینا۔ رات  
آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی ابھی میرا بچہ کا سواٹک ہائی  
تھا چوری نیم بالنگ تیار تھی۔ چونک، ٹپکی، کبڈہ، سیر، رانچہ،  
سستی تمام مشہور کردار اٹھائے۔ میں بچے کے تھے۔ میرا  
کردار بالو کھجری نے خور اور کرنا تھا۔ بسبب کہ سستی کا کردار  
کرنے کے لئے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی، کھانا سے  
میں مسودہ ہوئی کہ اچانک وہ نوجوان لڑکے بچے سے  
بھاگتے ہوئے نکلا۔ اسے کی طرف آئے۔ ایک نوجوان  
نے سستی کو کمر سے پکڑا اور کندھوں پر ڈال کر کھجری سے  
بھاگ نکلا دور لڑکا اس کے ساتھ تھا یہ سب اتنی جلدی  
میں ہو گیا کہ کسی کے ہم و گمان میں بھی نہیں تھا سب لوگ  
ششدر و حیران کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اتنی کی جھلیں کچھ  
دیر تک سنائی دیتی رہیں پھر وہ بھی بند ہو گئیں۔ کچھ  
نوجوان انداز سے اس طرف کو بھاگ گئے جس  
طرف وہ دونوں لڑکے سستی کو اٹھا کر بھاگے تھے لیکن سستی کا  
کوئی سراغ نہ مل سکا پھر نہیں سے زمین لگ گئی تھی یا  
آسمان کھا گیا تھا۔ بالو کھجری بلند آواز سے رورہی تھی  
ہائے میری بیٹی پھر اس پر خوشی کے دور سے پڑنے لگے۔  
اب کافی لوگ پاروں طرف بکس گئے۔ رات کا اندھیرا  
گہرا تھا اس لئے سستی کی تلاش بہت مشکل ہو گئی تھی۔  
کافی دیر تلاش کرنے کے بعد کچھ لوگ خالی ہاتھ  
واپس آ گئے لیکن ابھی کچھ نوجوانوں نے تلاش جاری رکھی

تھی کہ اچانک انہیں ایک کما کے کھیت سے آہوں اور  
سکیوں کی آواز آئی وہ کھیت میں داخل ہو گئے اور آواز  
کے رخ پر آگے بڑھتے چلے گئے آخر وہ سستی کے قریب  
پہنچ گئے۔ ان کے پاس تاریخ وغیرہ کا انتظام نہیں تھا ایک  
نوجوان نے ماچس کی تیلی جلائی اور سستی کے لباس اور  
میک اپ سے کچھ گئے سستی اسی ہے لیکن ظالم درندے اپنا  
کام کر گئے تھے۔ سستی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی ایک  
نوجوان نے اسے کندھے پر ڈالا اور واپس خانقاہ کی  
طرف چل پڑے سستی کی آپٹیم جکی تھیں شاید وہ خوف  
کی وجہ سے دوبارہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ خانقاہ کے قریب  
پہنچ کر ایک نوجوان نے زور سے آواز لگائی موتیوں والی  
سرکار سستی مل گئی ہے بالو کھجری دودنی ہوئی آواز کی طرف  
پہنچی ایک آدمی کیسے لئے ہوئے اس کے پیچھے گیا جب بالو  
نے سستی کی حالت دیکھی تو کربناک آواز میں نہیں کرنے  
لگی۔ ہائے لوگو میں لٹی گئی۔

”ہاں اور وہاں بند کر اور خدا کا شکر ادا کر کہ سستی زندہ مل  
گئی۔“ کسی نے کہا۔

بالو نے دونوں ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارا اور کہنے  
لگی۔ ”اس سے مر جانی تو بہتر تھی۔ ہائے لوگو..... تم نہیں  
جانتے میرا کتنا نقصان ہوا ہے میری زندگی کی ساری کمائی  
خالی ہو گئی ہے۔“

”ہم تیرا نقصان پورا کر دیں گے۔“ موتیوں والی  
سرکار نے کہا۔

”ہمیں موتیوں والی سرکار میرا نقصان آپ پورا  
نہیں کر سکتے۔“

”اچھا رونا دھونا چھوڑ اور اپنی کو ہوش میں لانے کی  
کوشش کر۔“ کچھ دیر بعد سستی کو ہوش آ گیا۔ ظاہر ہے اب  
پر وگرام نہیں ہو سکتا تھا لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے  
گئے۔ چند خادم اور بالو کے ساتھ آنے والے سازندے،  
بھاٹہ اور دولڑکیاں باقی رہ گئیں۔ رکھنے نے بالو کھجری

سے کہا۔ بالو بتا تیرا کتنا نقصان ہوا ہے تاکہ میں وہ ہمارا کر دوں۔

”موتیوں والی سرکار! آپ میرا نقصان پورا نہیں کر سکتے بس میں نصیبوں جلی اپنی سزا کو کچھ مٹا کر مجھے سستی کی عزت دینے کا کوئی افسوس نہیں پہلے ہماری کون سی عزت محفوظ ہے لیکن مجھے افسوس یہ ہے کہ سستی کی عزت قلعہ لوگوں نے لوٹی ہے۔ ابھی تو میں نے اس کی تھکھائی کی رسم ادا کرنی تھی مگر راجے اور نواب اس کی بولی لگا چکے تھے۔ ایک نواب پچاس ہزار بولی دے چکا تھا لیکن میں نے ابھی ہاں نہیں کی تھی۔“

”بالو! تھکھائی کیا ہوتی ہے؟“

”موتیوں والی سرکار! ان مداخلات کو آپ نہیں سمجھتے یہ ہمارے خاندانی رسم و رواج ہوتے ہیں۔“

”لیکن ہمیں بتانے میں کیا حرج ہے؟“ رکھنے نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”سرکار! تھکھائی یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں کو جن کے ہاں کوئی پتہ نہیں ہوتا لیکن ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ اس کا ہاپ فلاں آدمی ہے، جب وہ چھوٹی عمر میں ہوتی ہیں تو ہم ان کے ناک میں سونے کی ایک تھیلی ڈال دیتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ لڑکی اب جوان ہونے والی ہے پھر ہم اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی مرد اس کے قریب نہ جائے اور یہ بات راجاؤں اور نوابوں تک پہنچ جاتی ہے کہ فلاں ہائی نے ایک لڑکی کو تھکھائی پہنائی ہوئی ہے۔ پھر بڑے بڑے راجے اور نواب بولی لگا جاتے ہیں۔ بس جو زیادہ بولی دے وہ تھکھائی کا حقدار بن جاتا ہے اور اس کام میں ہم مکمل ایمان داری سے کام لیتے ہیں کہ بالکل سچ اور صاف مال اسے مہیا کریں۔ بس وہ نواب پہلی دفعہ اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور اس طرح اس کی تھکھائی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ جب اس کی تھکھائی اتار دی جاتی ہے تو بس پھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب یہ

کلی نہیں پھول بن چکی ہے۔“

”اچھا یہ بات ہے۔“ رکھنے نے کہا۔

”سرکار! میری بڑی بیٹی کی تھکھائی پچاس ہزار روپے میں ہوئی تھی۔“ بالو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”سرکار! ہمیں بے غیرت کہنے والے خود ہم سے بھی بڑے بے غیرت ہیں۔ میں جب جوانی کی سرحد میں داخل ہوئی تو میری ہائی نے میری تھکھائی ایک ریاست کے نواب سے کرانی تھی۔ میں ابھی چھوٹی عمر میں تھی نواب پچاس سال سے کسی طرح کم جنہیں ہو گا پورے بازار حسن میں مجھ سے زیادہ خوبصورت اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔ پچاس ہزار روپے کوئی معمولی رقم ہوتی ہے؟ میں سب کچھ اپنی جان پر سہہ گئی لیکن میرے دل میں اس نواب کے لئے نفرت اور انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور پھر میں نے اس سے ایسا انتقام لیا جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ نواب مجھ پر لو ہو چکا تھا آخر میں نے اسی نواب سے ایک بیٹی کو جتا۔ وہ بڑی بیٹی اسی نواب کی ہے اور پھر جب میں نے بڑی بیٹی کی تھکھائی کی رسم ادا کی تو اسی نواب کا بیٹا میرا مہمان بنا اور اپنی بیٹی کی تھکھائی کی۔ اس رات میں بہت خوش تھی۔ میں نے بڑے نواب سے لو کھا انتقام لے لیا تھا اور اب سستی کے ساتھ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ایک نئے دفا سے وہ انتقام لیتی کہ انسانیت کا نپ جاتی۔ وہ واحد شخص تھا جو میرے دل کو پسند آیا تھا میں نے ہائی سے اس کا ذکر کیا تو میری ہائی نے ماتھے پر تھوڑی چڑھائی اور غضبناک انداز میں کہنے لگی۔

”بالو! عشق ہمارا شیوہ نہیں اگر گھوڑی گھاس سے پیار کرے گی تو کھائے گی کیا؟ کھجری کی لولہ کسی سے عشق کرے گی آج تک نہ سنا نہ دیکھا۔ خبردار! آئندہ جو ایسی بات منہ سے نکالی۔“

پھر میں نے اس نو جوان نواب زادے کو دل کے

اور ہوں ابھی جوان تھی جو وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔

بالو نے رات کا بقیہ حصہ رکھنے کے حجرے میں گزارا تھا اور پھر وہ ناگن اُسے اُس گئی رکھا مار قاری (؟ شک) میں جٹا ہو گیا تھا۔ وہ ناپاک اور گندی عورت پہنچن کتنے مردوں کو اس بیماری میں مبتلا کر چکی تھی۔ یہ بازاری عورتیں عموماً اس مرض میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان سے یہ بیماری مردوں میں پھیلتی ہے۔ آج کے زمانے میں ایڈز جیسی موذی بیماری پھیلانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ آپ انہیں بے شک خاں صاحب اور میڈم کا نام دے لیں بھلا شراب کی بوتل پر شربت کا لیبل لگانے سے اس کی اصلیت تو نہیں بدل جاتی۔ گورنمنٹ نے بازار حسن ختم کر کے اس گندگی کو شہروں، محلوں، پوش خانوں، ٹیکسیوں اور شرفاء کے درمیان پھیر دیا ہے یہ گندگی ایک جگہ پر ہی رہتی چاہئے تھی یا پھر اس کو بڑے سے منادیا جاتا جو موجودہ حالات میں ناممکن ہے لیکن رکھا ایک ماہر سنیا سی تھا اس نے ہندو جوگی سے طلسماتی نسخے سکھے ہوئے تھے لہذا وہ جلد ہی بیماری پر قابو پا گیا۔ ادھر میں جنت کے عشق میں جٹا ہو گیا تھا اس کے خیالات مجھے کسی ملی بھین نہیں لینے دے رہے تھے۔ وہ رکھنے کی پھپھوکی بیٹی تھی لہذا میں اس کے متعلق رکھنے سے ہات نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن جوش جنون میں ہمیں بدلا درویش نہ لباس پہنا اور رکھنے سے سیر کرنے کی اجازت مانگی۔ سیر کو فقیری زبان میں بتل کہتے ہیں اور اس کا مطالب ہوتا ہے کہ کسی گاؤں میں جا کر خانقاہ کے نام پر نیاز مانگی جائے، رکھنے نے مجھے اجازت دے دی میں سیدھا جنت کے گاؤں پہنچا لیکن دیدار معشوق میسر نہ ہو سکا۔ میں بے دلی سے واپس آ گیا جب میں خانقاہ میں پہنچا تو رکھنے اور تہمتی دونوں غائب تھے۔ (رکھا اور سستی کہاں گئے؟..... شمارہ ستمبر "مائیکرو نمبر" میں ملاحظہ فرمائیں)

بھید سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگا۔ بالو تم خوبصورت ہو، لو جوان ہو لیکن ہو تو کجری کی اولاد تم روپے مانگو جتنے مانگتی ہو میں دوں گا لیکن تمہیں باعزت طریقے سے اپنالوں یہ خیال بھی دل سے نہ لانا۔ سستی اس نواب زادے کی بیٹی ہے اور اسی نواب زادے نے اپنی بیٹی کی قیمت پچاس ہزار روپے نکالی ہے مگر افسوس میری یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ بالو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھ بالو! رکھنے نے مکارانہ انداز میں کہا۔ "میں تمہیں پچاس ہزار روپے ادا کر دیتا ہوں۔"

"نہیں سرکار! اب اس کی اتنی قیمت نہیں رہی نصف قیمت پر میرا اور تمہارا سودا ہوا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔" رکھنے نے جلدی سے کہا اور پھر سستی ہمارے پاس رہی۔

جب دن چڑھا تو میں نے بالو کجری اور بھانڈوں کجروں کو دیکھا تو مجھے کلی سی ہونے لگی۔ اُن کے جسموں سے اٹھنے والی گھنیا میک اپ اور جس لمے سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی فو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ بالو کجری کا بے نور اور جھریوں بھرا چہرہ جسے میک اپ کی تہوں نے چھپا رکھا تھا۔ دانتوں پر پان کے گندے سرخ و زرد داغ، مردانہ آواز، مصنوعی چوٹی وہ فکڑا نما عورت نظر آ رہی تھی۔ گیس کی روشنی، گہرے میک اپ، بھڑکیلے لباس، لمبی مصنوعی چوٹی کے پس پردہ جوالوں کے دلوں پر راج کرنے والی بالو دن کی روشنی میں کسی چیز سے کم نہیں تھی۔ میرے دس سے بالو کی رات والی شخصیت گندے سرے سینکوں کی طرح غائب ہو گئی۔ کاش دوسرے تماش بین بھی اسے دن کی روشنی میں دیکھ لیتے تو بالو کی اداؤں پر آجیں نہ بھرتے البتہ سستی اور اس کی بڑی بہن عمر کے اس حصے میں تھیں جس میں بد صورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالو بھی کبھی خوبصورت ہو گی لیکن اب کھنڈرات میں تہ لیل ہو چکی تھی لیکن اس کی مال کی غرض

اس انگریز ڈپٹی کمشنر کا قتل جس نے ڈاکوؤں کو  
اپنے گھر میں ڈاکو ڈالنے کا چیلنج دے رکھا تھا۔

## ڈاکو اور ڈپٹی کمشنر



ماشق حسین



بک بکنچے کی پوری پوری کوشش کرتی تھی۔ اُس زمانے  
میں گاؤں میں پولیس کا سپاہی آ جاتا تو ہر طرف خبر پھیل  
جاتی کہ تھانہ آیا ہوا ہے، خدا نکر کرے، کوئی خاص بات  
ہے کہ حکومت کا آدمی آیا ہے۔

ایک انگریز ڈپٹی کمشنر بنایا گیا الکلینڈ سے خلع  
راولپنڈی میں تعینات کر کے لئے آیا۔ جب بھی کوئی انگریز  
افسر ہندوستان میں آتا تو اسے ہندوستان کی مختلف  
قوموں کے بارے میں مکمل معلومات دی جاتی تھیں تاکہ  
وہ تاج برطانیہ کے لئے اچھی طرح حکومت اور کنٹرول کر  
سکے۔ اس انگریز ڈپٹی کمشنر کو بتایا گیا کہ یہاں ہندوستان  
میں بڑی بڑی ٹیپ قسم کی وارداتیں ہوتی ہیں جن میں  
ڈاکے اور چوریوں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا کھرایا کھوج

یہ کہانی مجھ سے تقریباً بیس سال بڑے ایک  
دوست نے سنائی تھی۔ میری عمر اس وقت ساٹھ  
کے لگ بھگ ہے۔ یہ واقعہ پاکستان بننے سے بہت پہلے کا  
ہے۔ اس نے اپنے باپ سے سنی تھی۔ اس وقت لوگوں کی  
صحبتیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ چائے، سگریٹ اور بنا ہتی  
تھی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اکثر لوگ پیدل ہی سفر کرتے  
تھے۔ وہ زمانہ جو اندروں اور بہادری کا تھا۔ لوگ ایسے  
ایسے بہادری کے کارنامے کرتے تھے کہ موجودہ دور میں  
ناممکن نہیں تو مشکل ضرور محسوس ہوتے ہیں۔

انگریزوں کا راج بڑے زوروں پر تھا۔ قتل یا ڈکیتی  
وغیرہ کی واردات ہو جاتی تو لوگ بھی تعیش میں بڑی  
دلچسپی لیتے اور پولیس بھی دل و جان سے اصل مجرموں

گئی۔ آدمی کا اصل نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ فرضی نام امیر باز رکھ لیں۔ اس آدمی کا نام دس نمبر میں لکھا ہوا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے جرائم میں مشہور تھا۔ گاؤں کے باہر چوپال پر اکثر لوگ فارغ وقت میں بیٹھ کر گپ شپ لگایا کرتے تھے۔ امیر باز بھی اُس وقت وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ جب ڈی سی کے اشتہار کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ امیر باز خاموشی سے سنتا رہا۔ اُس نے پوچھا کہ دو ماہ گزرنے کے بعد بھی چوری کی سمیت سے ڈی سی کے بچکلے پر کسی کے جانے کی کوئی خبر بھی ملی ہے یا نہیں۔ ایک آدمی نے بتایا کہ اگلے ہی دن پنڈی سے ایک سرکاری آدمی جو کہ ہمارے گاؤں کا ہے، چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کسی کو وہاں جانے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ یہ تو موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے۔

امیر باز نے محکم ارادہ کر لیا کہ میں مر جاؤں گا یا انگریز ڈپٹی کمشنر کو ایسا سبق دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ چونکہ وہ دس نمبر پر تھا، اس لئے اس کو اپنا گاؤں چھوڑنے سے پہلے اپنے نمبردار، چوکیدار کو مطلع کرنا پڑتا تھا۔ وہ اس واردات کو کم سے کم وقت میں مکمل کرنا چاہتا تھا۔ لہذا اُس نے اس سکیم پر عمل کرنے کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ کتوں کے لئے اس نے پیلوں کے دو سینک تلاش کئے جن میں خالص گھی کی روٹی کی پوری بنا کر سینکوں میں اچھی طرح بھر دی تاکہ کتوں کی کوشش کے باوجود چوری آسانی سے نہ نکل سکے۔

اُس زمانے میں سوائے ریل کے آنے جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لہذا عام لوگ چالیس چالیس کوس پیدل چلتے تھے۔ ہمارے علاقہ کے لوگ جہلم اور گوجراننگ پیدل ہی سفر کرتے تھے۔ امیر باز صبح سویرے نمبردار کو ملا تاکہ اسے معلوم ہو کہ امیر باز گاؤں میں موجود ہے۔ چکوال سے راولپنڈی کا راستہ بہ نسبت مرگ کے پیدل کا نزدیک ہے۔ امیر باز پچھلے پہر ڈی سی کے بچکلے کا جائزہ

لگاتا ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ بعض وارداتیں اس قدر دلیرانہ قسم کی ہوتی ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتے ہیں۔

مے ڈپٹی کمشنر نے ایس پی کو جو انگریز تھا، کہا کہ میرے بچکلے پر چھپ چکے پولیس کی سطح کا رد موجود رہتی ہے۔ میرے پاس دو خوشخوار کتے چوکیداری کے لئے رات کو کھلے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میرے ملائے میں پولیس گشت پر رہتی ہے۔ بتایا بھی ساری رات ملتی رہتی ہیں۔ کیا ایسے حالات میں بھی چور میرے بچکلے سے چوری کر کے جاسکتا ہے؟

ایس پی نے جواب دیا کہ ان تدابیر کے باوجود چوری کا امکان ہو سکتا ہے۔

”میرا ذہن نہیں مانتا۔“ انگریز ڈی سی نے کہا۔ ”اسے سخت انتظامات کے ہوتے ہوئے بچکلے کے قریب بھی کوئی آنے کی جرأت کر سکے، چہ جائیکہ بچکلے کے اندر آ کر کوئی چیز چھدی کر کے نکل جائے۔“

انگریز کی حکومت اور پولیس کی دہشت بھی اتنی زیادہ تھی کہ رات کے وقت تو کیا دن کے وقت بھی کوئی اُس طرف جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ڈی سی کے اصرار پر ایس پی نے کہا کہ اگر آپ ہندوستانی قوم اور خاص کر مسلمان کو آزمانا چاہتے ہیں تو اخبار یا اشتہار کے ذریعہ آزما کر خود تجربہ کر لیں۔

آخر یہ طے ہوا کہ ایک اشتہار دیا جائے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے بچکلے کے اندر سے جو کوئی آدمی چوری کر کے نکل جائے گا اس کو پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ پولیس اور کتوں کے ہاتھوں مارا گیا تو وہ خود دس روپے ہو گا۔ اگر موقع پر نہ مارا گیا یا گرفتار نہ ہوا تو اسے پیش ہونے پر پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا جائے گا اور گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی سزا دی جائے گی۔

اشتہار نکلنے تقریباً دو ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ بات اڑتے اڑتے چکوال کے درمیان ملائے میں بچکلے

برآمدے کے اندر چلا جائے۔ یہ موقع جلد ہی میسر آ گیا۔ سنتریوں کی پیشہ ایک دوسرے کے مخالف تھی۔ امیر باز چھلاوے کی طرح اچھل کر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

امیر باز درمیانے قد کا آدمی تھا۔ بدن میں بلا کی جستی کے علاوہ دوڑ میں اتنا تیز کہ دوڑتے ہوئے بالکل چھلاوہ نظر آتا تھا۔ اُسے یہ یقین تھا کہ واردات کے بعد جگہ کی حدود سے نکل گیا تو پھر سنتریوں کا باپ بھی اُسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ دوسرا موقع ملتے ہی وہ بچنے کا جالی والا وردازہ کھول کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ لکڑی کا وردازہ کھلا تھا۔ تمام جائزہ لینے کے بعد بچنے کے وسطی کمرے کے قریب پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ درمیان میں بہت بڑا بنگ بچھا ہوا ہے اور مدھم لائٹ جل رہی ہے۔ بنگ پر ایک طرف صاحب اور دوسری طرف میم صاحبہ سوئی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں لکڑی کی بنی ہوئی بڑی بڑی دو نیم الماریاں بڑی ہوئی تھیں اور چڑے کے سوٹ کیس بھی تھے۔ اُس نے ایک سوٹ کیس کو کھولا تو اس میں چاندی کے روپے پڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت لوٹ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اُس نے خاموشی سے اپنی کمر کے ساتھ بندی تھپند کے پلو میں چاندی کے روپے ایک ایک کر کے رکھنے شروع کر دیے۔ جب پلو بھر گیا تو اُس نے اچھی طرح گاتھ باندھ لی۔ اب وہ نکلنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اس کی نظر میم صاحبہ کے بار پر پڑ گئی جو اُس کے گلے میں پڑا ہوا تھا اور اُس کے مولی مدھم روشنی کے باوجود چمک رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ وہ بار اتارنے میں کامیاب ہو جائے تب ہی چیلنج کا صحیح جواب ہوگا۔

میم اور صاحب گہری نیند سوئے ہوئے تھے، امیر باز نے مدھم روشنی میں دیکھا کہ بار کی ہک میم کی گردن کی دائیں طرف لگی ہوئی تھی۔ اس نے دم سادھے بار کے ہک کو کھولنے کی کوشش کی۔ ہک تو کثرت سے

لینے کے لئے رول پینڈی پہنچ گیا۔ اس نے سنتریوں کو ڈیوٹی پر مشغول کرنے دیکھا۔ بچنے کی باہر کی دیوار عام آدمی کی کمر تک اونچی تھی۔ جیسا کہ اُس وقت عام بنگوں کی ہوتی تھیں۔ دیوار کے اندر سنتریوں کی ہاڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کے مچن بالان کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھولدار پودے لگے ہوئے تھے۔ بچنے کے چاروں طرف برآمدے تھے۔ برآمدوں کے تقریباً چار چارٹ چوڑے ستون تھے۔ امیر باز کو اندر جا کر کوئی بھی چیز اٹھالے جانی تھی اور یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان میں ایسی قوم بھی رہتی ہے جو اتنی دلیر ہے کہ جان کی ہمدانے بغیر ہر چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

آخر آدمی رات کے وقت وہ بچنے کی باہر کی دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا اور سنتریوں کا جائزہ لینے لگا۔ کتوں کو بھی دیکھا جو کوشی کے لان میں ادھر ادھر بھر رہے تھے۔ سب سے پہلے اُس نے دونوں سینک جن میں خالص گھی کی روٹی کی خوشبو تھی، اندر کی طرف بڑے آرام کے ساتھ رکھ دیئے۔ خود دس بارہ گز دیوار کے آگے کی طرف سے سرک گیا۔ کتوں نے جو خوشبو سونگھی تو وہ سینکوں میں سے بھڑکی نکالنے میں لگ گئے اور سینکوں کو گھسیٹنے لگیئے کافی فاصلے پر نے گئے۔ اب اُس نے سنتریوں کو دیکھا جو گل چار تھے، وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد برآمدے کے باہر ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے۔ انہوں نے رائلیں اٹھا رکھی تھیں مگر معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے اب وہ سمجھ چکے ہیں کہ یہاں آنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ چیلنج کئے ہوئے عرصہ دو ماہ سے زائد گزر گیا تھا۔ اس لئے وہ کچھ شست بھی ہو گئے تھے۔

بہر حال امیر باز اللہ کا نام لے کر دیوار کے اندر جا کر پودوں کی لوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہ اس موقع کی تلاش میں ہی تھا کہ جو فی سنتری تھوڑے فاصلے ہوں تو وہ

کل مکی مگریم نے سونے کی حالت میں اپنا ایک ہاتھ گردن پر الٹا پھیرا اور ساتھ ہی کروٹ بدل کر دوسرے پہلو ہو گئی۔ اب ہارکل کراہی کی گردن اور کندھے کے درمیان بستر پر بڑا ہوا تھا۔ امیر باز چنگ کے نیچے ہو گیا۔ تقریباً پانچ منٹ گزرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ میم اب دوبارہ غیند میں ہو گئی ہے تب اس نے چنگ کے نیچے سے نکل کر ہار کو آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ ہار نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے وہ ہار اپنی تہبند کے دوسرے پہلو میں ابھی طرح کس کے ہاتھ لیا اور کمر کے ساتھ اپنی تہبند کو لپیٹ لیا۔ امیر باز اندر سے جالی والے دروازہ کے ایک سائیڈ پر کھڑا ہو کہ چند لمحے یہ دیکھتا رہا کہ سنتری کب ادھر ادھر ہوتے ہیں۔

جلد ہی باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے کے چوڑے ستون کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب اسے لان اور باہر والی دیوار کو پھلانگنا تھا۔ کتے ابھی تک اپنی ناکام کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ وہ بیٹگوں سے بھاری ٹھل لیں۔ امیر باز نے اللہ کا نام لے کر موقع پاتے ہی دوڑ لگائی اور لائن عبور کر کے دیوار پھانسی اور سڑک کراس کرتے ہوئے دوڑ پڑا۔

سنتری بیدار ہو گئے اور انٹ خدش گولیاں چلانے لگے۔ امیر باز پکڑھویوں کے رستوں سے بھاگ رہا تھا۔ وہ ہائی رات اور سارا دن چلا رہا اور دوسری رات دس گیارہ بجے اپنے گھر پہنچ گیا۔

اس واردات کے بعد جو حالات بعد میں اس کو معلوم ہوئے وہ کچھ اس طرح ہیں کہ ڈپٹی کمشنر اور اس کی میم جاگ پڑے۔ پہلے تو انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ چاندی کے روپے سوٹ کیس سے قاعب ہیں۔ انہوں نے معمولی سی چوری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی مگر جو مکی میم صاحب کو احساس ہوا کہ اس کے گلے میں قیمتی ہار نہیں ہے تو اس نے اُدھم مچا دیا وہ

عام قسم کا ہار نہیں بلکہ بڑا ہی قیمتی ہار تھا۔

ایس بی صاحب اور ضلع کے انگریز انسپکٹس ہو گئے۔ علاقے کا چھ چھ چھان مارا لیکن مجرم کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ڈی سی حیران تھا کہ اتنی بڑی احتیاطی تدابیر کے باوجود یہ دلیری کس شخص نے کی ہے۔ ڈی سی کہتا تھا کہ چور قیمتی ہار واپس کر دے اور وعدہ کے مطابق اس کو 5 سو روپے نقد انعام کے علاوہ سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا۔ اشتہار دیئے گئے اور اخبار میں بھی خبر چھپوائی گئی۔ چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی چور کا سراغ نہ مل سکا۔

ادھر میم صاحبہ تنگ کر رہی تھی کہ ہر قیمت پر ہار واپس دلایا جائے۔ ہار کی نوٹوں کا پی اور نقشے کی کاپی ہر قحطی میں بھجوائی گئی اور تاکید کی گئی کہ چوری کا سراغ لگانے والے کو بہت بڑی ترقی سے نوازا جائے گا۔

ادھر امیر باز چوری کی ہوئی رقم سے اپنے گھر کے اخراجات چلاتا رہا۔ اس وقت چاندی کا ایک روپیہ آج کل کے دو سو روپوں کے برابر تھا۔ اس کی صرف ایک ہنگی اور بیوی تھی اس لئے بغیر کام کے بڑے آرام سے دن گزر رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ خواہ مخواہ پیش ہو کر اپنے آپ کو منجھٹ میں کون ڈالے۔ ایسا نہ ہو کہ انگریز سرکار ہمیشہ کے لئے قید خانے میں ڈال دے۔ ہار اس کی بیوی نے مٹی کی ایک ڈلی میں ڈال کر رکھا ہوا تھا جو لاپرواہی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بہت ہی قیمتی ہار ہے۔ ایک دن اس نے ہار کے دو موتی نکالے اور قریب ہی قصبے میں سٹار کے پاس لے گئی اور کہا کہ میری بیٹی کے لئے چھوٹی سی ہالیاں بنا دو اور ان میں یہ دونوں موتی لگا دو۔

سٹار نے جب موتیوں کو دیکھا تو اس نے امیر باز کی بیوی کو بتایا کہ یہ تو بہت قیمتی موتی ہیں۔ یہ تم نے کہاں سے لئے ہیں؟ اس نے جھوٹ بول کر کہا کہ میرا خاوند اپنے گاؤں کے قریب مٹی کھود رہا تھا، پرانے زمانے کی

راولپنڈی ایس پی کے سامنے پیش کیا گیا۔ فوراً ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی گئی کہ آپ کا ہارل گیا ہے۔ یہ امیر باز کے گھر سے برآمد کر لیا گیا تھا۔ ڈی سی اور اس کی میم نے فوراً ان کو طلب کر لیا۔ جب انہوں نے امیر باز کا حلیہ اور ظاہری جسم وغیرہ دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ہار تو ہمارا ہی ہے مگر یہ چور ہمارا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے آدمی کی اتنی جرات ہو ہی نہیں سکتی کہ اتنی بڑی ہمت کر کے ہار گلے سے اتار کر لے جائے۔

ایس پی نے اس کو کہا کہ وہ اپنی زبان تمام طریقہ واردات صاحب بہادر کو سنائے۔ امیر باز نے تمام کہانی سنائی اور جرح کا جواب مکمل طور پر دیا۔ یہاں تک بتایا کہ میم صاحبہ نے اس طرح اپنی گردن پر ہاتھ بھی پھیرا تھا جس وقت میں ہار اتار رہا تھا۔ وہ حیران بھی ہوئے اور مکمل یقین بھی کر لیا کہ ہمارا ہار اس شخص نے چھایا ہے۔ اگھر یہ صاحب نے اسے کہا کہ تم نے ہمیں سخت پریشان کیا ہے۔ اگر تم واردات کے فوراً بعد اطلاع دے دیتے تو ہمیں خوشی ہوتی مگر پھر بھی وعدہ کے مطابق تمہیں تنگ بھی نہیں کیا جائے گا۔ لہذا امیر باز کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا اور تاحید کی گئی کہ آئندہ وہ باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرے۔

امیر باز نے آئندہ شریفانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں علاقے کے ایک بزرگ کے ہاتھ بیعت کرنی چاہی تو اس بزرگ نے اسے کہا کہ بیعت تو میں تمہیں کر لیتا ہوں مگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ چوری چکاری نہیں کرو گے۔ اس نے وعدہ کر لیا مگر چوری سے تو جا سکتا ہے جہاں پھیری سے نہیں جاتا۔ کبھی کبھار موقع ملتا تو وہ چھوٹی موٹی واردات اور نقل گھنٹی کر لیتا۔ کسی نے ان بزرگ شخصیت کو بتایا کہ امیر باز اب بھی چکر چلاتا رہتا ہے مگر موقع پر نہ پکڑے جانے کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ انہوں نے امیر باز کو بلایا اور کہا کہ آئندہ اگر کوئی ایسی

کھائی ہے، وہاں سے یہ دونوں موتی لے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اپنی بچی کی بالیوں میں ڈالوا لوں۔ اب میں یہ موتی تمہارے پاس لے آئی ہوں۔ سارے نے اس بیان کو صحیح سمجھ کر بالیاں بنا دیں جو ماں نے اپنی بچی کے کانوں میں ڈال دیں۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بچی ایک دن مکان کے باہر بیٹھی رو رہی تھی۔ پولیس کا ایک حوالدار جو کسی تقیش کے سلسلے میں نمبردار کے پاس آیا ہوا تھا، امیر باز کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ بچی کے رونے کی وجہ سے نظر اس پر پڑی تو اس نے بچی کا حلیہ جو عام غریب کے بچوں کا ہوتا ہے دیکھا۔ اس کی نظر اس کی بالیوں پر پڑی۔ موتی چمک رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ عام موتی نہیں بلکہ کوئی خاص قسم کے موتی ہیں۔ اس نے نمبردار سے پوچھا کہ یہ بچی کس کی ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ امیر باز کی بچی ہے جس کا نام اس نمبر میں ہے۔ حوالدار کو کچھ شک ہوا۔ اس نے بچی کو نزدیک جا کر دیکھا تو موتیوں کی شکل اس ہار کے موتیوں سے ملتی جلتی تھی جو کہ ان کے پاس ڈی سی کی میم کے ہار کا نقشہ تھا۔ وہ میں بطور ریکارڈ پڑا ہوا تھا۔ اس نے امیر باز کو بلوایا اور کہا کہ یہ بالیاں تھانے لے جا رہے ہیں بلکہ تمہیں واپس کر دیں گے۔

نظر یہ کہ موتی شہادت ہو گئے۔ امیر باز پہلے ہی مشکوک آدمی تھا لہذا اسے فوراً تھانہ طلب کیا گیا۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ پھر بھی کہ تم خود ہی اپنی زبان سے بتاؤ کہ یہ موتی تم نے کہاں سے لئے ہیں اور نہ مار مار کر بڑی پہل ایک کروں گا۔ پہلے تو امیر باز نے انہیں باتیں کی مگر اس کو معلوم تھا کہ اسے اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک میں ان کو ان موتیوں کا ثبوت نہ مہیا کر دوں۔ چنانچہ اس نے واردات کا مکمل اعتراف کر لیا۔

تھانیدار بہت خوش تھا کہ اس نے بہت بڑا کیس کھلا ہے جو اس کی ترقی کا باعث ہو گا۔ امیر باز کو

حرکت کی تو وہ خود سدا رہا ہوگا۔

موجودہ حالات کا اندازہ ہے کہ نوجوان اپنی ذہنی  
اور جسمانی صحت کی طرف توجہ دیں  
نئی نسل پر کٹھن فرد اریلوں کا بوجھ  
آپڑا ہے

ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے ہم وہ  
کتاب پیش کر رہے ہیں جس کے  
آپ کو شدید ضرورت ہے

ڈاکٹر نصیر امیر شیخ ایم بی بی ایس

مہیم الف کی مشترکہ کتاب



آپ کی سرائف بنی جسمانی جسمانی اور نفسی انجمن  
کا مجموعہ اور سہل حل پیش کرتی ہے  
سفید کاغذ، آفسیٹ طباعت  
خود تصدیق شدہ روایت، قیمت روپے  
چھ ہزار روایت شدہ دفتر سے کتاب خریدیں گے  
انہیں ایک روپیہ روایت پیش کی جائے گی  
لکھناؤہ

ملکتہ داستان لکھناؤہ

چند ہی دنوں بعد ایک ہندو کے گھر کا تالہ توڑا گیا  
جو قریب کے گاؤں میں رہتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور  
ہندو مع ال خانہ چھت پر سو رہا تھا۔ ہندو کو شکست ہوا کہ  
نیچے مکان میں کوئی آدمی ہے۔ اُس نے شور نہ مچایا بلکہ  
آہستہ آہستہ چھت سے اتر کر اُس کمرے کا باہر سے کنڈا  
لگا دیا جس کا کہ تالہ ٹوٹا ہوا تھا۔ امیر باز اندر ہی تھا۔ ہندو  
نے شور مچانا شروع کر دیا۔ گاؤں کے چند آدمی لالچیاں  
لے کر ہندو کے گھر پہنچ گئے۔ پانچ چھ آدمی دروازہ کھول  
کر اندر گئے۔ لالچین سے چار پانچوں کے نیچے دروازے  
سے آ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ امیر باز پہلے ہی ہوشیار ہو  
چکا تھا۔ چنانچہ وہ گھڑوئی (جور ضائیوں وغیرہ رکھنے کے  
لئے اونچی جگہ بنائی ہوتی ہے) پر چڑھ کر چھت کے شہتر  
کے کنڈے میں پاؤں کی انگلیاں پھنسا کر شہتر کے ساتھ  
چھت کی طرح چھٹ گیا۔ جو فی قصبے کے لوگ دروازے  
سے دُعا آگے چار پانچوں کے نیچے تلاش کرنے لگے تو وہ  
اوپر سے چھٹا لگ لگا کر باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ محن سے  
ٹپکنے کے بعد آدمی بھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ باہر  
کھیتوں میں آگے آگے وہ دوڑ رہا تھا اور پیچھے پیچھے گاؤں  
کے آدمی دوڑ رہے تھے۔

ویسے تو اس کو پکڑنا مشکل تھا مگر اندھیرے کی وجہ  
سے ایک اونچے مینڈھ سے پاؤں ٹکرا گیا جس کی وجہ سے  
وہ گر گیا۔ اب وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ  
پیچھے سے آدمی پہنچ گئے۔ پہلے تو اُس کی خوب ٹھکانی کی  
بعد میں اس کو تھانے لے گئے۔ کیس چلا، چھ ماہ سزا ہو  
گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے بزرگوں کے ساتھ وعدہ  
خلافی کی ہے لہذا یہ سزا مجھے ملی ہے۔ سزا کاٹنے کے بعد  
اس نے شریمانہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ وہ بہت  
بوڑھا ہو کر فوت ہوا تھا۔





## دریازِ عمرانی

موسم سے پھر بن جانے والے ایک شریف النفس قبائلی لوجوان کی سنسنی خیز سبکدوشی۔



”نہیں۔“ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”آپ بالکل بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ یقین نہیں آتا تو اپنے سامنے رکھی قبوے کی پیالی چیک کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ قبوہ ابھی تک گرم ہوگا۔“

میں نے پیالی کو چھوا تو وہ واقعی گرم تھی لیکن میرا شک پھر بھی زور نہ ہوا، میں نے کہا۔ ”پیالی میں گرم قبوہ بھی تو ڈالا جاسکتا ہے؟“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے اگر آپ

یہاں سے بٹے ہوتے تو تب

ورنہ آپ کی موجودگی میں یہ

کیسے ممکن ہے؟“

”تو پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے

کہ میں بے ہوش ہوا تھا؟“

وہ ہنس کر بولا۔ ”یہ اس قبوے

کا کمال ہے کہ آپ کو ایسا لگتا

ہے۔ ورنہ حقیقت میں ایسا

کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”مطلب قبوے میں کچھ

ملا گیا تھا؟“ میں نے مشکوک

انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہ محض آپ کا دہم ہے قبوے میں کچھ بھی نہیں ملا گیا تھا۔ یہ اس قبوے کی تاثیر ہے کہ پہلی بار بیٹے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہے مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ بیٹے والا پوری طرح ہوش میں رہتا ہے تاہم وقتی طور اُس کے دل و دماغ میں بالکل ضرور کچ جانی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو اب کی بار لی کرو کیہ لیں، اس بار آپ کو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوگا۔“

میں نے قبوے کی پیالی اٹھا کر ایک بار پھر لبوں

سے لگا لی اور گھونٹ گھونٹ کر سارا قبوہ پی گیا مگر اس

میں جب دوبارہ ہوش میں آیا تو میں نے خود کو اسی صوفے پر پایا۔ ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اور قبوے کا نصف کپ بدستور میرے عین سامنے سنٹرل ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں الجھن کا شکار ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہوا ہی نہیں ہوں۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ قبوے کا نصف کپ پینے کے بعد میں بے ہوش ہوا تھا۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل

تھا؟ اس بارے میں مجھے کچھ

بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے

ایسے ہی وال کلاک پر نظر ڈالی

تو ٹھیک دس بجنے والے تھے۔

میری الجھن مزید بڑھ گئی

کیونکہ یہ وہی وقت تھا جب

بے ہوش ہونے سے قبل میں

قبوہ پی رہا تھا۔ دونوں مسخ

فحش بھی وہیں موجود تھے۔

جب کہ وہ غیر ملکی نظر آنے والا

فحش اسی طرح صوفے

پر عین میرے سامنے تشریف

فرما تھا۔ مجھے الجھن میں

اور پریشان دیکھ کر پہلا تو وہ مسکرایا، پھر بولا۔ ”کیا بات

سے شیر دل! آپ مجھے بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔

کوئی الجھن ہے تو پلیز مجھے بتائیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں الجھن تو ہے مگر میں جانتا ہوں

کہ آپ مجھے کچھ نہیں بتائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”بھئی! پہلے سوال تو کرو، جواب نہ ملے تو

تب یہ شکوہ کرنا۔“

”کیا میں قبوہ پینے کے دوران بے ہوش ہوا تھا؟“

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

اُس کے لبوں پر ایک ہنسراہی سی ہنسی رہ گئی۔

### دعائے مغفرت

محترم رزاق شاہد کوہلر اور محترم ریاض عاقب  
کوہلر کے والد محترم 23 رمضان کو بہ حکم الہی دفات پا  
جئے۔

### اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اللہ مرحوم کو فریق رحمت کرے اور لواحقین کو صبر  
جیل عطا فرمائے۔ ادارہ اس عظیم صدمے پر ان کے غم  
میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے اپیل ہے کہ وہ  
دعائے مغفرت فرما کر لو اب دارین حاصل کریں۔

(ادارہ)

بات کا ہمیشہ نہ امنایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ ماما کو ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے، تب اُن دونوں کے بیچ بحث چھیڑ جایا کرتی تھی۔ ماما بابا جان سے کہتی کہ داؤد اور ڈیوڈ دونوں ایک ہی نام ہیں بس زبان اور لہجے کے فرق کی وجہ سے مختلف لگتے ہیں مگر بابا جان جو کہ معمولی سے بڑھے لکھے تھے، ہمیشہ ماما کی ہر دلیل کو رد کر دیا کرتے تھے۔ ماما کا تعلق انگلینڈ سے تھا جب کہ بابا جان ایک قبائلی پٹھان تھے۔ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی مگر یہ محبت اُن دونوں کو اس نہ آسکی حالانکہ ماما نے شادی سے قبل اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ اتنا بتا کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

مجھے اُس کی کہانی دل چسپ لگی مگر اب وہ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات تھے۔ یوں جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ شاید ماضی کی کرب انگیز یادوں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ ایسی صورت حال میں اُس سے کچھ پوچھنا میں نے نامناسب خیال کیا۔ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ تب میں نے پہلی بار اپنے دل میں اُس کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس کیے۔ اُس نے ایک بار پھر چشمہ اُتار کر اپنی نم آنکھوں سے صاف کیوں اور پھر مسخ گارڈز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم دونوں باہر جا کر بیٹھ جاؤ، جب تک میں نہ بلاؤں کمرے میں مت آنا۔“

غلیظ دانتوں والے نے منہ کھولا۔ ”آپ ریسک لے رہے ہیں جناب! یہ شخص بہت خطرناک اور عیار ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں یہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس نے سلیم کو جس بے رحمی کے ساتھ قتل کیا ہے اُس کے بعد اس پر اعتبار کرنا.....“

”دفع ہو جاؤ۔“ داؤد خان نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ”میں نے جو عزم دیا ہے اُس پر عمل کرو۔“

اُسے غصے میں دیکھ کر دونوں گارڈ میز سے باہر نکل گئے۔ گارڈز کے جانے کے بعد اُس نے میری

بار مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا حالانکہ قبوے کا لالہ اندھ اور خوشبو بھی دیتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا پھر قبوہ بدل دیا گیا تھا؟ بہر کیف جو بھی تھا مجھے اُس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہذا میں نے موضوع بدل کر سوال کیا۔ ”لو کے قبوے والی بات کو رہنے دو اور یہ بتاؤ کہ مجھے کس مقصد کی خاطر اغوا کیا گیا ہے، آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”میرا نام داؤد خان ہے اور میں آپ کا ہمدرد ہوں۔“

”اس ہمدردی کا سبب جان سکتا ہوں؟ میں نے طعنیہ انداز میں سوال کیا۔“

”آپ آم کھا میں عذمت سمجھیں۔“ وہ لیوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی نیلی کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں آپ کا دوست ہوں، دشمن نہیں۔“ ”یہ بھی خوب کہی..... دوست بھی بھلا کبھی یوں بنوا کرتے ہیں؟“

اُس نے چشمہ اُتار کر دونوں شیشوں پر باری باری پھونک ماری اور پھر چشمہ دوبارہ چہرے پہ سجاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں صہیار خان کا دشمن ہوں، وہی صہیار خان جس نے آپ کی توہین آمیز دلیولہ لائی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”آپ جب تک اپنے ہارے میں مجھے سچ نہیں بتائیں گے میں آپ کی کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ آپ صہیار خان کے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں؟“

”ٹھیک ہے۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میرا نام تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے یعنی داؤد خان، آپ کی طرح میں بھی.....“

”داؤد خان یا ڈیوڈ؟“ میں نے قطع کلامی کی۔

”ویسے مجھے ڈیوڈ ہی کہا کرتی تھی۔“ وہ مسکرایا۔

”تاہم بابا جان چونکہ نسلا پٹھان تھے اس لیے ماما کی اس

حالات اس قدر بُرے نہیں تھے جیسے آج کل ہیں۔ اُس دور میں الگینڈ جانے کا بہت چاہ تھا۔ خاص کر پنہان لوگ تو اپنا گھر بار بیچ کر بھی ملک سے باہر جانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ میرے بابا جان ایک لڑک لارائیور تھے اور پشاور کراچی روٹ پر چلا کرتے تھے۔ وہ پشاور سے مال لے کر کراچی جاتے اور کراچی کا مال پشاور لایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار تو وہ پشاور سے آگے افغانستان کے شہر جلال آباد تک بھی پہلے جایا کرتے تھے۔ بابا جان کا نام احمد یار خان تھا جب کہ اُس سے ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام صدر یار خان تھا۔ احمد یار خان اپنے چھوٹے بھائی سے بے تحاشا پیار کرتے تھے اور اُسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ دونوں کا باپ اُن کے بچپن میں ہی گزر گیا تھا۔ بس ایک بوڑھی ماں تھی اور وہ دو بھائی تھے۔ اُن کے دن نہایت ہی اچھے گزر رہے تھے۔ گھر میں اللہ کا دیا کبھی کبھار تھا۔ احمد یار خان کی تنخواہ اُن کی ضرورت سے زیادہ تھی۔ ویسے بھی وہ دور بہت سستا تھا۔ اس قدر ارزانی نہیں تھی جیسے آج کل ہے۔

اُن دونوں صدر یار خان میٹرک میں تھا جب احمد یار خان کے سر پر ملک سے باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا۔ مریا کے دن تھے ہرات کے کھانے کے بعد جب وہ تینوں ایکٹھی مٹی کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو احمد یار خان بولا۔ ”مور جان (ای جان) میں ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ یہاں میری محنت کا صلہ بہت کم ملتا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”یارو خان! صلہ کم نہیں ملتا بلکہ تم ناشکرے ہو گئے ہو۔“ (ماں اُسے پیار سے یارو خان کہا کرتی تھی)

اُس نے کہا۔ ”مور جان! تم جانتی ہو کہ میں صدر خان کو بڑا آدمی بنانا چاہتا ہوں۔ میرا یہ پینا صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب میں ملک سے باہر کہیں ملازمت کروں گا۔ یہاں رہ کر میں اپنے بھائی کے لیے

طرف دیکھا اور پھر چہرے پر ایک ڈھکی سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ میری داستان سننے کے لیے بہت بے تاب ہوں گے۔“

”ہاں بے تاب تو ہوں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو پھر میں آپ کی داستان حیات ضرور سننا چاہوں گا۔“

وہ بولا۔ ”بہت ذکھ بھری داستان ہے۔ آپ خواہ تنخواہ السرودہ ہو جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”میری السرودگی کو چھوڑو، آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ اُس نے ہائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”ذکھ میں کسی دوسرے کو شریک کرنے سے ذکھ کا احساس آدھا رہ جاتا ہے۔“

”تو پھر سنائیے میں ہمدن گوش ہوں۔“

وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے مگر میری ایک شرط ہے؟“

”کیسی شرط؟“ میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ ”اب جب کہ ہم دونوں میں دوستی کا آغاز ہو چکا ہے تو کیا ہم اسی طرح ایک دوسرے کو آپ جناب کہہ کر مخاطب کرتے رہیں گے؟“

”ہاں واقعی ہمیں ان تکلفات میں نہیں پڑنا چاہیے اب ہم اچھی نہیں رہے۔“ میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا۔

”گنڈ یہ ہوئی ناں بات۔“ اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”اب میں تمہیں اپنی داستان حیات ضرور سناؤں گا۔“

☆☆☆

”یہ آج سے تقریباً چالیس برس قبل کا ذکر ہے۔“ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں اُس وقت ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ ملک کے

"میں یاری خان ہوں دنیا کی کوئی عورت مجھے تم لوگوں سے جدا نہیں کر سکتی، چاہے وہ انگریز ہی کیوں نہ ہو۔"

"جانے سے پہلے سب اپنی ماؤں سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں مگر وہاں جا کر انہیں یہ باتیں بھول جاتی ہیں۔"

"مور جان! اگر تم نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" اس نے حتیٰ فیصلہ سنایا۔

"ہاں مور جان! لالہ ٹھیک کہتا ہے۔" چھوٹے بھائی نے بھی اس کی تائید کی۔ "انگلینڈ میں ایک ڈرائیور کو بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ ہمارے دن پھر جائیں گے، ہم کب تک گاؤں کے اس کپے اور ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہیں گے؟"

دونوں بھائیوں کو متفق دیکھ کر ماں مجبور ہو گئی۔ ویسے بھی وہ ایک آن پڑھ اور سادہ مزاج عورت تھی۔ بیٹے کو دلیل سے قائل نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر زندہ ہوتا تو شاید اس کا ساتھ ضرور دیتا، تب وہ یاری خان کو باہر جان سے زبردستی بھی روک سکتی تھی۔ تاہم وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"میں یاری خان کی بات مان لوں گی مگر میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط مور جان؟" یاری خان نے بے صبری کے عالم میں پوچھا۔

وہ بولی۔ "ہر دن ملک جانے سے قبل تمہیں شادی کرنا پڑے گی۔"

"اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟" یاری خان شہنشاہ گیا۔ اسے ماں سے کسی ایسے سوال کی توقع ہی نہیں تھی۔

ماں نے کہا۔ "تمہارے پیروں میں زنجیر ہوگی تو بھٹکنے سے باز رہو گے۔"

"مگر میرا تو ابھی رشتا بھی طے نہیں ہوا، کون مجھے

کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ تمہارا صدمہ ایک دن بہت بڑا آدمی بن جائے؟"

وہ بولی۔ "صدمہ خان پڑھ تو رہا ہے اور تمہیں کیا چاہیے؟"

"دسویں پاس کرنے کے بعد جب وہ کالج میں جائے گا تو تب بہت خرچہ ہوگا۔ اس وقت میری تنخواہ سے یہ خرچہ پورا نہیں ہوگا۔" اس نے دلیل پیش کی۔

"نہیں یاری خان! ماں نے انکار میں سر ہلایا۔

"میں تمہیں پردیس جانے کی اجازت نہیں دے سکتی وہاں جو بھی جاتا ہے کبھی واپس نہیں آتا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھونا نہیں چاہتی۔"

وہ بولا۔ "مور جان! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر سال چھٹی آیا کروں گا۔"

"وہاں جانے والوں کو وعدے یاد نہیں رہتے، تم بھی ہمیں بھول جاؤ گے۔"

"یاری خان! اپنی ماں اور بھائی کو بھول جائے یہ ناممکن ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پردیس کی رنگینیوں میں کھو کر خونی رشتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا تمہیں اپنے یاری خان پر اعتماد نہیں ہے؟" اس نے جوش کے عالم میں سوال کیا۔

"تم پر تو اعتماد ہے لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا مور جان؟" اس نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

"وہاں کی عورتیں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ ماؤں سے بیٹے اور بہنوں سے ان کے بھائی چھین لیتا ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہیں بھی کوئی ایسی ہی عورت ہم سے چھین لے گی اور پھر میں اور صدمہ اکیلے رہ جائیں گے۔"

ماں نے دل میں چپے خدشے کا اظہار کیا۔

"یہ تمہارا وہم ہے مور جان۔" اس نے تہنید لگایا۔

لے چل دی۔ جب کہ وہ دونوں بھائی دیر گئے تک دیکھتی  
انگلیٹھس کے گرد بیٹھے مستقبل کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے  
رہے۔

☆☆☆

دوسرے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر یاری  
خان کی ماں اپنی بہن کے گھر جا پہنچی۔ دونوں بہنوں کے  
تعلقات آپس میں بہت ہی اچھے تھے۔ سو بہن اُسے  
دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھی۔ "آپا خانم! خیر تو ہے آج  
صبح سویرے میری یاد کیسے آگئی؟" چھوٹی بہن نے  
مسکرا کر سوال کیا۔

وہ بولی۔ "ذریعہ آج میں تیرے گھر میں سوالی  
بن کر آئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنی آپا کو خالی ہاتھ  
نہیں لوٹاؤ گی۔"

ذریعہ نے کہا۔ "آپا! آپ حکم کریں، آپ کے  
لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔"

خانم نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ "میں تم سے جان  
مانگنے کے لیے نہیں آئی ہوں بلکہ گل رُخ کا ہاتھ مانگنے  
کے لیے آئی ہوں۔ مجھے اپنے یاری خان کے لیے گل رُخ  
کارشٹا چاہیے؟"

ذریعہ لمحہ بھر کے لیے تو متحیر رہ گئی۔ اُسے آپا خانم  
سے اس سوال کی شاید توقع ہی نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی  
کہ شاید بڑی بہن کو رد پے پیسے کی ضرورت ہوگی مگر وہ تو  
گل رُخ کا ہاتھ مانگ رہی تھی۔ چنانچہ ذریعہ سوچوں میں  
مستغرق ہو گئی جب کہ خانم جواب طلب نظروں سے اُس  
کی طرف دیکھنے لگی۔ جب خاموشی کا ایک طویل وقفہ گزر  
گیا تو خانم بولی۔ "کن سوچوں میں مہم ہو، میں بڑی  
امید لے کر تیرے پاس آئی ہوں۔ کیا تم بڑی بہن  
کو نامراد لوٹاؤ گی؟"

"نہیں۔" ذریعہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ "میں

آپ کہاں کرکتی ہوں، میں تو یہی کرکتی ہوں۔ اس

بچی دے گا؟" اُس نے جواز گھڑا۔  
"تم ہاں تو کر دو ششاکش کرنا میرا کام ہے۔" ماں  
نے پُر عزم لہجے میں جواب دیا۔

وہ سوچوں میں مستغرق ہو گیا۔ دل و دماغ میں  
جنگ چھڑ گئی۔ دماغ نے کہا ماں کا کہنا مان کر شادی  
کر لو، دل بولا اگر وہاں کوئی میم صاحب پسند آگئی تو کیا  
ہوگا؟ دماغ نے طحیہ قہقہہ لگا کر کہا ایک مڈل پاس  
ڈرائیور کو بھلا کوئی میم کیوں پسند کرے گی؟ دل بولا عورت  
عشق میں اندھی ہو جاتی ہے وہ تعلیم، مرتبہ، خاندان بلکہ  
لہجہ تک نہیں دیکھتی بس اپنے دل کی سنتی ہے۔ دماغ  
نے کہا بجا مگر شادی کیسے بنایہ باہر نہیں چلائے گا؟ دماغ  
کی اس ٹھوس دلیل نے دل کو لا جواب کر دیا، وہ دھڑک  
رہا تھا مگر اس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی جسے  
جواز بنا کر وہ دماغ کی بولتی بند کر دیتا، سو بچارا دھڑکنے  
کے سوا کچھ بھی نہ کر پایا۔ دماغ نے طحیہ انداز میں  
طرح کیا اب بولو ناں! پُچپ کیوں ہو، جواب دو میرے  
سوال کا۔ دل بولا تمہیں جیت مبارک ہو مگر اتنا یاد رکھنا کہ  
یہ وقتی جیت ہے۔ بہت جلد میں تمہارے ہوش اُڑا دوں  
گا۔ دماغ نے کہا تم بے وقوف ہو اتنا بھی نہیں جانتے کہ  
جو میری مانتا ہے وہ ہمیشہ سرفروہ ہوتا ہے دنیا والے اُسے  
جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ دل نے جواب دیا  
اور جو میری مانتا ہے وہ مگر بھی امر ہو جاتا ہے۔

دل و دماغ کی یہ مدلل جنگ جاری تھی کہ معا اُس  
کی سماعتوں سے ماں کی آواز نکلرائی۔ "یاری خان! اچھپ  
کیوں ہو جواب دو ناں؟"

"ٹھیک ہے مور جان۔" اُس نے اقرار میں سر  
ہلایا۔ "مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ آپ جہاں چاہیں  
میری شادی کر سکتی ہیں، میں کوئی اعتراض نہیں کروں  
گا۔"

ماں اُسے ڈھیروں دعاؤں سے نواہی ہوئی سونے کے

زیرینہ نے کہا۔ ”آپا! اگر ایسی بات ہے تو گل رخ کا باپ کبھی بھی نہیں مانے گا۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔“  
”تم اسے یہ بات مت بتانا کہ یاری خان ملک سے باہر جا رہا ہے۔“ خانم نے مشورہ دیا۔  
”میں اپنے خاوند سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”آپ تو جانتی ہی ہیں کہ وہ مجھے کے بہت چیز ہیں۔ انہیں اگر کسی طرح یہ بات معلوم ہوگئی تو وہ مجھے زندہ جلا لیں گے۔“

”اس بات کا صرف مجھے اور تجھے پتہ ہے۔ جب ہم دونوں زبان بند رکھیں گی تو اسے کیسے پتہ چلے گا؟“  
”آپا! آپ مجھے آگ میں کودنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ جھوٹ جھوٹ ہی ہوتا ہے جلد یا بدیر ظاہر ہو جاتا ہے۔“

”اگر ایسا کچھ ہوا تو سارا الزام میں اپنے سر لے لوں گی۔ تجھ پر کوئی آج نہیں آنے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

زیمہ اضافے کے ساتھ (ریپرٹ)

## حالی سفر نامہ

جرمن، امریکہ، افغانستان اور دیگر ممالک کا چشم کشا سفر نامہ

(دوسرا ایڈیشن)

جرمنی۔ جی ڈار لوگوں کی سرزمین

قیمت 300 روپے

جرمنی کی ترقی کاراز اور انتہائی دلچسپ سفر نامہ

سفر حج حجاز مقدس کے روح پرور اور ایمان افروز سفر کا حال

صرف 25 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

26۔ پیالہ گراؤنڈ لنک میٹرو روڈ لاہور۔

فون: 042-37356541

”ادب سرائے“ 125۔ ایف۔ ماڈل ٹاؤن لاہور۔

مصنف 205/M ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون 0300-4154083

لیے کہ گل رخ کا مالک اس کا باپ ہے۔ آپ میرے بجائے گل رخ کے باپ سے رشتہ مانگیں۔“  
وہ بولی۔ ”مجھے بھائی جی سے بات کرنا ہوتی تو تمہارے سامنے دامن کیوں پھیلاتی؟ ان سے تم خود بات کرو گی اور آج ہی کرو گی۔“  
”آپا! یہ کیسی بات کرتی ہو..... اتنی جلدی بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“

خانم نے کہا۔ ”یاری خان ملک سے باہر جانا چاہتا ہے کمانے کے لیے، بس اسی وجہ سے میں اس کی جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی ہوں۔“  
”اس کا مطلب ہے کہ آپ اس کے حروں میں زنجیر ڈالنا چاہتی ہیں؟“

”ہاں ایسا ہی کچھ بات ہے۔“ خانم نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”مجھے اندیشہ ہے کہ غیر ملک جا کر کہیں میرا بیٹا ہلک نہ جائے۔“

ہے تم سے۔"

"نہیں لالا! میں بھلا آپ سے کیوں جھوٹ بولنے لگا؟" اُس نے دل منظر کو سنبھالنے کی کوشش کی۔  
ماں ان دونوں کو چھوڑ کر گھر کے کاموں میں لگ گئی  
جب کہ یاری خان کافی دیر تک چھوٹے بھائی  
کو کریدتا رہا مگر اُس نے اپنے دلی جذبات کو کچھ اس  
انداز میں چھپایا کہ یاری خان بالکل مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

گل رخ جابر خان اور زرینہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ  
جابر خان کو اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔ رات کو کھانے  
کے بعد جب گل رخ اپنے کمرے میں سونے کے لیے  
چلی گئی تو زرینہ نے امت کا مظاہرہ کرتے ہوئے  
شوہر کے سامنے خانم کا پیغام دہرایا۔ جابر خان نے پہلے  
تو زرینہ کو آنکھیں دکھائیں اور پھر ماں گوار انداز میں بولا۔  
"کیا خانم یا گل ہے اُسے گل رخ اور یاری خان کی  
مگر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"

وہ بولی۔ "ان کی عمروں میں کوئی اتنا بڑا فرق تو  
نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا۔"  
"خانم کی طرح شاید تمہارا بھی دماغ خراب ہو گیا  
ہے۔ دس بارہ سال سے بھی زیادہ کا فرق ہوگا اور یہ بہت  
بڑا فرق ہے۔" وہ ایک دم غصہ ہو گیا۔

"آپ خواہ تو او غصہ کر رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے  
دل دو مبالغہ سے غور کریں عمر کا یہ فرق لڑکی کے لیے اچھا  
ہوتا ہے۔" زرینہ نے دلیل دی۔

وہ بولا۔ "تجھے دانش ور بننے کی کوئی ضرورت نہیں  
ہے۔ گل رخ کا رشتہ میں خود طے کروں گا۔ تم بس اپنے  
کام سے کام رکھا کرو۔"

"کیوں..... میں کیا گل رخ کی کچھ نہیں لگتی؟"  
زرینہ کو بھی غصہ آ گیا۔ "نوا ما اُسے پیٹ میں لے کر  
بھرتی رہی ہوں۔ اڑھائی برس اُسے دودھ پلایا ہے۔ میں  
ماں ہوں اُس کی، آپ سے زیادہ اُس پر میرا حق ہے۔"

"ٹھیک ہے آپا! میں کوشش کروں گی مگر آپ کو  
چند دن صبر کرنا پڑے گا۔ میں کوئی مناسب سامان دیکھ  
کر اُن سے بات کروں گی۔" آخر کار وہ رضامند ہو گئی۔  
خانم خوشی خوشی گھر لوٹ آئی اور دونوں بیٹوں کو  
سامنے بٹھا کر ساری بات بتادی۔ یاری خان کو یہ جان  
کر بہت خوشی ہوئی کہ گل رخ اُس کی پھی بننے والی ہے  
مگر صبر یار خان یہ خبر سن کر کچھ بچہ سا گیا۔ پتہ نہیں اُس  
کے دل میں کیا تھا؟

"اوئے لائے کی جان! تم نے کیوں منہ لٹکا رکھا  
ہے، میں تمہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے؟"  
یاری خان نے اُس کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر سوال  
کیا۔

وہ بوکھلا کر بولا۔ "نن..... نہیں لالا! ایسی کوئی بھی  
بات نہیں ہے۔"

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر تمہاری شکل لگور جیسی  
کیوں ہو گئی ہے؟" یاری خان نے شوخی سے پوچھا۔  
"وہ دراصل لالا میرے امتحان ہونے والے  
ہیں ناں! تو بس اسی وجہ سے تھوڑا پریشان ہوں۔" اُس  
نے بہانہ گھڑا۔

یاری خان نے کہا۔ "اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو  
ابھی بتادو، تیرے لالہ کی جان بھی تیرے لیے  
حاضر ہے؟"

"کمال کرتے ہو لالا!" اُس نے ایک کھوکھلا سا  
توتہ لگایا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ سے  
کیوں چھپاتا؟"

وہ بھائی کی پینہ تھپکتے ہوئے بولا۔ "صدا خان! میں  
صرف تمہارا بھائی ہی نہیں ہوں، بلکہ باپ بن کر تیری  
پرورش کر رہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا مجھ سے زندگی میں  
بھی جھوٹ مت بولنا ورنہ مجھے بہت تکلیف ہوگی۔"

حکایت

کا شمارہ ستمبر 2014ء

# سالگرہ نمبر

ہوگا

جو اپنی سابقہ روایات کے مطابق

ایک مستقل کتاب کی اہمیت کا حامل

ہوگا۔ اپنی کاپی ہا کر سے کہہ کر بک کرا لیں۔

سالگرہ نمبر 320 صفحات پر مشتمل ہوگا۔

قیمت - 100/- روپے

قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں۔

سوچتے وقت اتنا خیال رکھنا کہ یاری خان میرا بھانجا اور گل رُخ کا خالہ زاد ہے۔ وہ گل رُخ کے لیے اچھا شریک حیات ثابت ہوگا۔

”اچھا اب زیادہ بک بک نہ کر اور میرے لیے قبوہ بنادے۔“ اُس نے نالٹے والے انداز میں جواب دیا اور زرمینا اٹھ کر مگن کی طرف چل دی۔

ایسے ہی وقت بھر دنی گیت پر دستک ہوئی تو وہ اٹھ کر گیت کی طرف چل دیا۔ اُس نے گیت کھولا تو سامنے صد خان کھڑا ہوا تھا۔ جاہر خان اُسے دیکھ کر کچھ بھر کے لیے تو حیران رہ گیا، پھر پوچھا۔ ”کیا بات ہے صد خان..... کیسے آنا ہوا؟“

”آپ..... آپ سے ایک ضروری کام ہے خالو۔“ اُس نے جھجک کر جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اندر آ جاؤ۔“ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو صد خان تیزی سے اندر آ گیا۔

جاہر خان نے گیت کو دوبارہ بند کیا اور صد خان کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ”بیٹھو۔“ اُس نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا تو صد خان بیٹھنے لگے۔

”ہاں اب بولو کیا کام ہے؟“ جاہر خان نے اُس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

گوکہ صد خان اکثر اُن کے گھر آیا کرتا تھا مگر جاہر خان سے اُس کا سامنا کم ہی ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر وہ اُس کی غیر موجودگی میں خالہ کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اُسے جاہر خان کی غصیلی طبیعت کے متعلق اچھی طرح معلوم تھا۔ چنانچہ جاہر خان نے جس طرح اُس سے سوال کیا اس سے وہ قدرے نرم ہو کر کٹکٹ کش کا شکار ہو گیا۔ اُسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ بات شروع کسے تو کس طرح کرے؟ جاہر خان بدستور جواب طلب لگا ہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کا موسم ہونے کے

”حق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے آگ میں جھونک دیا جائے۔ شادی گڈے گڑیا کا کیل نہیں ہوتی۔ عمر بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کو سوچ سمجھ کر دشتا طے کرنا چاہیے۔ ویسے بھی مجھت کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔“ اُس نے بھڑک کر جواب دیا۔

”میرا بھانجا لاکھوں میں ایک ہے۔ کیا کی ہے اُن کے گھر میں، خدا کا دیا بھی کچھ ہے اُن کے پاس، ہو ہی تو بھائی ہیں۔ گل رُخ وہاں مارج کر سے گی۔“

”میں جو بھی فیصلہ کروں گا سوچ سمجھ کر کروں گا مگر فی الحال میں اس کام کے لیے مجید نہیں ہوں۔ اگر خانم کو جلدی ہے تو تم اُسے انکار کر دو۔ گل رُخ ابھی بچی ہے، شادی کے لیے بڑی عمر پڑی ہے۔ ابھی تو اُس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔“

وہ بولی۔ ”گل رُخ پورے اٹھارہ برس کی ہو چکی ہے اور یہ شادی کے لیے مناسب عمر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اُس سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ وہ بیٹی ہے آپ اُسے ساری عمر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔“

”میں نے کہا ہے ناں! کہ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا، پھر تم کیوں اس بات کے پیچھے پڑ گئی ہو..... کیا گل رُخ کسی کے ساتھ بھاگی جا رہی ہے؟“ وہ رنج ہو گیا۔

”اللہ نہ کرے کیسی بات کرتے ہیں؟ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جتنی جلدی گھر کی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

”یہ دیکھ۔“ اُس نے بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اللہ کی بندی! مجھے چند دن سوچنے کے لیے تو دے؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ خوشی سے کل اٹھی۔ ”جتنے دن دل چاہے آپ سوچیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس

ایسا دیر آدی نہیں ہوں۔

"جی ہاں متا دو، ورنہ گھنٹ کر مار ڈالوں گا۔"  
وہ جابر خانہ انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "بولو گل رُخ سے  
تمہارا کیا تعلق ہے؟ اور خیردار! اب کی بار اگر تم نے  
جھوٹ بولا تو میں تمہاری کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔"

"مم..... میں قسم کھاتا ہوں خالو کہ ایسی.....  
کو کوئی....." وہ ابھی بھلا ہی رہا تھا کہ جابر خان نے آگے  
بڑھ کر اسے دو تھپڑ جڑ دیے۔

"حرام زلوے! تمہاری یہ صحت کہ تم جابر خان کی  
بچی کا نام لو۔" جابر خان نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔  
"میں تجھے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ بولو تمہارا گل رُخ  
سے کیا تعلق ہے؟ بولو ورنہ مار ڈالوں گا۔"

ایسے ہی وقت زرمینہ قبوہ لے کر کمرے میں داخل  
ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ چلائی۔ "جابر خان! اسے  
کیوں مار رہے ہو؟ کیا کیا ہے اس نے..... خدا کے لیے  
اسے چھوڑ دو..... میں خاتم کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

جابر خان نے اسے گریبان سے پکڑ کر چاچائی سے  
نیچے بلخ دیا اور پھر اس کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر رسید  
کرتے ہوئے گرجا۔ "پوچھ اپنے اس حرامی بھانجے سے  
کہ یہ میرے گھر میں کون سا مقصد لے کر آیا ہے اور گل  
رُخ سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔"  
زرمینہ قبوہ کا کپ میز پر رکھتے ہوئے آگے بڑھی  
اور پھرے ہوئے خاوند سے لپٹ گئی۔ "خدا کے لیے مجھے  
بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے اور یہ یہاں اس وقت کیسے آ گیا؟"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔" جابر خان خود کو  
چمڑاتے ہوئے بولا۔ "بلکہ تم اندھی ہو چکی ہو اپنے  
بھانجے کی محبت میں۔ پوچھو ذرا اس سے کہ یہ یہاں کس  
نیت سے آیا ہے؟ اور گل رُخ کو بھی بلاؤ، مجھے لگتا ہے کہ یہ  
اسی کی شہ پاک یہاں آیا ہے۔ وہ یقیناً اس کے ساتھ ملی

باوجود صبر خان کو اپنا گلا خشک سا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اب وہ  
اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے ادھر آنے کا ارادہ کیا  
تھا۔

"تم چپ کیوں ہو..... کیا منہ میں زبان نہیں  
ہے؟" اس بار جابر خان نے قدرے سختی کے ساتھ  
پوچھا۔

صبر خان کا سر جھکا ہوا تھا۔ تاہم وہ ہمت مجتمع کرتے  
ہوئے بولا۔ "وہ..... وہ خالو..... دراصل..... میں کہنا  
چاہتا تھا..... کہ آپ..... آپ اس رشتے سے  
انکار کر دیں۔"

"تو اس رشتے کی بات کر رہے ہو؟" جابر خان نے  
آنکھیں چلائیں۔

"یا..... یاری خان..... اور گل..... گل رُخ کے  
رشتے کی۔" اس نے بدقت تمام جواب دیا۔

"کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے اس  
سے؟" جابر خان نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"یاری خان ٹھیک آدی نہیں ہے خالو..... وہ.....  
وہ گل رُخ کو خوش نہیں رکھ سکے گا۔" اس نے سہمے ہوئے  
انداز میں بتایا۔

"ادہ..... تو تم گل رُخ کے اہل مدینہ بن کر آئے ہو؟"  
جابر خان نے طریہ انداز اختیار کر لیا۔ "لیکن کیوں.....  
تمہیں اپنے سگے بھائی سے زیادہ گل رُخ سے اہل مدینہ  
کیوں ہے؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟ محنت  
میں کون اتنی تکلیف اٹھاتا ہے..... اصل بات کیا ہے  
بولو؟"

"نن..... نہیں خالو! ایسی تو..... گک..... کوئی  
بات نہیں ہے۔" وہ ایک دم پوکھلا اٹھا۔ "مم..... مجھے.....  
دراصل آپ سے اہل مدینہ ہے..... گل رُخ سے تو.....  
مم..... میں نے کبھی..... بب..... بات بھی نہیں کی.....  
آپ بلا وجہ..... مجھ پر شک کر رہے ہیں مم..... میں

کمرے میں داخل ہوئی اور باپ اور صاحب خان کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ "نہیں اباجی! میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ آپ اس کے خون سے ہاتھ نہ دھوئیں تو اچھا ہوگا۔"

"ہٹ جاؤ گل۔" جابر خان جنونی انداز میں چلایا۔ "آج اسے میرے ہاتھ سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں اسے چھلنی کر کے غار ہوں گا۔"

"اگر یہ بات ہے اباجی تو پہلے گولی آپ کو مجھ پر چلانا پڑے گی۔" گل رخ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مجھے مار کر ہی آپ اس تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"گل! میں کہتا ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔" جابر خان نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے اسے وارننگ دی۔

"میں نہیں اباجی ہٹنے والی، اگر آپ کو گولی چلانی ہے تو بے شک چلا دیں۔" اس نے ایک عزم سے جواب دیا۔

"اور گل کے بعد میری باری ہوگی۔" زرمینہ نے مداخلت کی۔ "اب آپ سوچیں مت بلکہ گولی چلائیں، ہم مرنے کے لیے تیار ہیں۔"

صورت حال کو یک دم پلٹتے دیکھ کر اس نے رائفل اپنی کٹھنی پر رکھ دی۔ "ٹھیک ہے اگر یوں نہیں تو پھر یوں سہی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا اور دائیں ہاتھ کو لہبا کرتے ہوئے انگوٹھا اٹھ کر پر رکھ دیا۔

"نہیں..... نہیں....." دونوں ماں بیٹی ہڈیانی انداز میں چیختی ہوئیں اس کی طرف بھاگیں مگر اس سے قبل کہ وہ اس تک پہنچ پائیں معا "وہائیں وہائیں" کی آواز گونجی اور جابر خان کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

(اس سلسلے فیروزستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

ہوئی ہے۔"

"خدا کا خوف کرو جابر خان! اپنی مصوم بیٹی پر اس قدر گناہنا الزام مت لگاؤ۔" وہ ٹرپ کر بولی۔ "صاحب خان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"خدا ہی! تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے خالو سے بھاؤ۔" صاحب خان اُنھ کر زرمینہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "خدا کی قسم! میں تو خالو سے باری خان کے رشتے کی بات کرنے کے لیے آیا تھا مگر خالو نے میری بات سننے کی بجائے مجھے مارنا شروع کر دیا، مگر آئے مہمان کے ساتھ بھی بھلا کوئی ایسا سلوک کرتا ہے؟"

صاحب خان کو یوں گرگٹ کی طرح زنگ بدلتے دیکھ کر جابر خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چلایا۔ "حرام زادے! مجھ پر الزام لگاتے ہو ابھی تھوڑی دیر قبل تو تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ باری خان اچھا آدمی نہیں ہے اور میں گل رخ کا رشتہ اس نہ کروں۔"

"خالو! خدا کا خوف کریں میں نے ایسا کب کہا ہے؟" صاحب خان نے باقاعدہ ردنا شروع کر دیا۔

"تیری تو....." وہ ایک گالی دیتے ہوئے طیش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔ "آج میں تجھے ذمہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہیں آپ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔" زرمینہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر لٹ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "مجھے یقین ہے کہ میرا بھانجا کبھی رہا ہے۔ البتہ آپ کے دل میں اس قدر میل ہوگا کہ بات میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچتی تھی۔"

"تیرے بھانجے کی ایسی کی تھی۔" جابر خان تیزی سے دیوار پر چکی ہوئی رائفل کی طرف بڑھا اور رائفل اتارتے ہوئے بولا۔ "آج میں اس کیپنے ہڈیاں کا قصہ ہی پاک کر دیتا ہوں۔"

رائفل اُتار کر وہ جو فی پلٹا مین اس وقت گل رخ

## ادھر ادھر سے



☆ ..... 0345-7094506 ..... رانا محمد شاہد

کی بارش کر دی۔ انہوں نے عابدین کو بالوں سے پکڑ کر  
پچھ کر ادیا اور ان کی دھنائی کر دی۔ اس خبر کے منظر عام  
پر آنے سے پتہ چلا کہ صرف پاکستان ہی نہیں دنیا بھر میں  
خواتین کے نژادی اور مارکٹائی کا انداز ایک جیسا ہے۔

انوکھی ٹیکنالوجی..... درختوں کے ذریعے مواصلات کا  
نظام: کیسا ہو گا کہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے  
درختوں سے ایسی روشنی خارج ہو جو رات کے وقت  
سڑکوں پر اجالا کر دے اور انہی درختوں کی شاخیں موبائل  
فونز اور دیگر مواصلاتی سرسبز کے لئے اینٹینا کا کام انجام  
دیں۔ یقیناً ان کی توانائی کا ذریعہ جڑیں ہی ہوں گی۔ جی  
ہاں ایسا اب شاید ممکن ہو جائے۔ گزشتہ ماہ امریکی

مہمان نے ایسکر پریس کی آن ایئر دھنائی کر دی: ٹیلی  
وژن چینلو کے ٹاک شو، کھانے پکانے کے پروگراموں  
میں میزبان کی ایسی سیدھی حرکتیں ان کے گلے بھی پڑ جاتی  
ہیں۔ ایسا ہی معاملہ مصر کے ٹیلی وژن چینل کی ایک  
میزبان نیہا عابدین کے ساتھ پیش آیا۔ مہمان خاتون نے  
آن ایئر کسی بات پر طیش میں آ کر ان کی دھنائی کر دی۔  
ہوا کچھ یوں کہ میزبان نے اپنی مہمان لگ خاتون کو  
چرانے کے لئے ان کی تیار کردہ ڈش میں سرکہ ڈال دیا۔  
بس پھر کیا تھا، پروگرام میں کھانے پکانے کی مہارت کا  
مظاہرہ کرنے والی خاتون اتنی جذباتی ہوئیں کہ انہوں  
نے اپنی ڈش کے خراب ہونے پر اپنی میزبان پر مار دھاڑ

ہے جسے دیکھ کر حقیقی پرندے کا گمان ہوتا ہے۔ سارٹ برڈ نامی روبونک پرندے کا وزن صرف 400 گرام ہے جسے جاسوسی کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کبوتر کی طرح نظر آنے والا یہ روبونک برڈ مختلف زاویوں پر مڑنے اور لینڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایرانی دو شیرازوں کو ڈرائیونگ کرتے رقص مہنگا پڑ گیا: سماجی رابطے کی ویب سائٹ "یو ٹیوب" پر ایک ویڈیو تیز رفتاری سے مقبول ہو رہی ہے جس میں دو ایرانی لڑکیاں گاڑی چلاتے ہوئے ایک گانے کی دھن میں گن رقص کر رہی ہیں۔ ان کی خوشی اس وقت اوجھری رہ گئی کہ جب ان کی تیز رفتار گاڑی اچانک ایک خوفناک حادثے کا شکار ہوتی ہے، تاہم خوش قسمتی سے دونوں محفوظ رہتی ہیں۔ موبائل فون سے بنائی گئی ویڈیو میں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ گاڑی چلانے والی ایک دو شیرازہ گانے اور ناچنے میں اس قدر مگن تھیں کہ اس نے سٹیرنگ سے ہاتھ اٹھائے تاکہ اپنی اداؤں کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر سکے۔ عین اسی لمحے ان کی گاڑی حادثے کا شکار ہوئی۔

سردار جی کی کیا بات ہے حضرت علامہ اقبالؒ کے لاکھوں مداحوں میں کچھ سکھ حضرات بھی تھے۔ ہر بندہ سنگھ سے علامہ اقبالؒ کی خاصی دوستی تھی۔ ایک دن ہر بندہ سنگھ علامہ اقبالؒ کے گھر آئے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو رات ہو گئی۔ ہر بندہ سنگھ علامہ اقبالؒ سے گفتگو میں اتنے مگن ہوئے کہ انہیں احساس بھی نہ ہوا کہ بادل گھرے ہوئے ہیں، بارش سے پہلے گھر چلے جائیں۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ علامہ صاحب نے کہا۔ "سردار جی! بارش نے بہت زور پکڑ لیا ہے، آپ یہیں ٹھہر جائیں"۔ سردار جی مان گئے۔ علامہ صاحب ان کے لئے بستر وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے اندرون خانہ چلے گئے۔ چادر نکال لے کر آئے تو سردار جی غائب تھے۔ نوکر وغیرہ سب سو چکے تھے۔ علامہ صاحب کھڑکیاں دروازے بند کرنے

ریاست میساجوسٹ کے انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے پروفیسر مائیکل سینٹروینو اور ان کی ٹیم نے پودوں پر کچھ تجربات کئے جن کی روشنی میں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ چھوٹے پودوں اور بڑے درختوں سے ایسے بہت سے کام لئے جاسکتے ہیں جو بظاہر ان کے لئے نہیں ہیں۔ پروفیسر مائیکل نے سب سے پہلے پالک کے چوں پر تجربہ کر کے اس بات کا اندازہ لگایا ہے کہ اگر پودوں کی "فونو سنیٹھیز" کے عمل کو تین گنا تیز کر دیا جائے تو نہ صرف پودوں کی نشوونما تیز ہوگی بلکہ انہیں برقی سینرز کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکے گا۔ انہی سینرز کی مدد سے مواصلات کا نظام چلایا جاسکتا ہے اور روشنی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یقیناً یہ تحقیق ٹیل کام کی صنعت سے تعلق رکھنے والی کمپنیوں کے لئے خوش خبری ثابت ہوگی۔ اب انہیں اپنی سرورس صارفین تک پہنچانے کے لئے بڑے بڑے میٹ ورکنگ ٹاورز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس طرح کے پودوں کو "باؤنک پلانٹس" کا نام دیا گیا ہے۔

نیویارک ریسٹورنٹ..... پانچ سال تک ایڈولس بنگ ہو چکی: اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کے لئے انتظار تو کرنا پڑتا ہے مگر امریکہ میں ایک ریسٹورنٹ ایسا بھی ہے جس میں کھانا کھانے کے لئے پانچ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ نیویارک میں واقع ون مین ریسٹورنٹ میں بے کھانے اتنے لذیذ ہیں کہ اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں ایک ہی شیف ہے جس کے ہاتھوں کا کھانا کھانے کے لئے ایڈولس بنگ کرانی پڑتی ہے۔ اگر آپ کو بھی یہاں کھانا کھانا ہے تو بس 2019ء تک انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہاں اگلے پانچ سال تک کی تمام بنگ ہو چکی ہے۔

مشینی پرندہ: حقیقی پرندوں کے علاوہ اب مصنوعی پرندے بھی اڑان بھر سکیں گے۔ حال ہی میں جرمن سائنسدانوں نے کبوتروں کی طرح اڑان بھرنے والا روبوٹ تیار کیا

استدعا کو رد کرتا ہوا بولا۔ ”ابھی تک اس بوڑھے کے دماغ سے خوئے حکمرانی نہیں گئی۔ کیا اب بھی وہ چاہتا ہے کہ طالب علموں کی صورت اس کا دربار سجا ہو اور ان پر اپنا حکم چلاتا ہے۔“

قیامت کی نشانی: سورج مغرب سے اٹھے گا۔ ناسا نے ”قیامت کی نشانی“ کو قبول کر لیا ہے۔ امریکی خلائی ادارے ناسا کی تحقیق کے مطابق 30 جولائی کو اس سیارے کی مشرق کی سمت گردش رک گئی تھی جبکہ اُسٹ اور خیمبر کو مریخ نے اپنے راستے کی سمت تبدیل کر لی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مریخ سیارے میں گردش میں تبدیلی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ تمام سیاروں کی گردش میں ایک دفعہ تبدیلی ضرور آئے گی۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس کی گردش بھی مخالف سمت میں ہوگی اور سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور ایسا جلد ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور اس دن توبہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔“ (صحیح مسلم)

بچوں کی حس مزاج: ایک نئی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کی حس مزاج کا تعلق ان کے والدین سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر مائیں سنجیدہ مزاج ہیں تو آپ یہ ہرگز مت سوچئے گا کہ بچے حس مزاج سے مالا مال ہوں گے کیونکہ بچوں کی مزاج کی حس ان ہی کی ہوگی۔ محققین کے مطابق بچوں میں حس مزاج 18 ماہ کی عمر سے پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اپنے والدین کو دیکھ کر ہی ان کی حس مزاج تشکیل پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ساتھ ہر وقت موجود مائیں اگر سنجیدہ مزاج ہوں تو بچوں کی حس مزاج بھی محدود ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ بچے دو سال کی عمر سے یہ سمجھنا شروع ہو جاتے ہیں کہ کون سی چیزیں سنجیدہ ہیں اور کون سی مزاج کے دائرے میں آتی

گئے تو انہوں نے ہر بندہ سنگہ کو پانی میں شرابور و روا سے پر کھڑا پایا۔ علامہ صاحب نے انہیں اندر بلا لیا اور دریافت کیا کہ وہ کہاں چلے گئے تھے۔ سردار جی بولے۔ ”میں اپنے گھر سیلنگ سوٹ لینے اور یہ بتانے گیا تھا کہ آج علامہ صاحب نے مجھے اپنا مہمان بنا لیا ہے۔ اس لئے رات کو گھر نہ آ سکوں گا۔“ علامہ صاحب نے کہا۔ ”گھر پہنچ گئے تھے تو واپس آنے کی کیا ضرورت تھی، وہیں آرام کرتے۔“ سردار جی نے کہا۔ ”آپ نے مجھے مہمان بنا لیا تھا۔ اس واپسی (شرف) کو پورا کرنا ہی تھا۔“ (”زندگی زندہ دلی“ فضل الرحمن خاں شیردانی کی کتاب سے اقتباس)

کاک پٹ گھر: دنیا میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک افراد کی کمی نہیں۔ ایسے لوگ بہت جلد دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ برطانوی علاقے بنگلہم شائر کے رہائشی ایک جوڑے نے اپنے گھر کی پہلی منزل پر موجود ٹیرس کو پونگ 737 ٹائی طیارے میں تبدیل کر دیا ہے اور اس شوق کے لئے 40 ہزار پاؤنڈ خرچ کر ڈالے ہیں۔ اسٹیو اور رکی نے طیارے کے اندرونی حصے میں موجود تمام چیزیں اس ٹیرس میں نصب کر دی جس میں کاک پٹ، 12 میٹر کیمین، ڈپارچر لائونچ اور انٹر برج شامل ہیں۔ جوڑے نے اس طیارے میں بیٹھنے کے لئے 75 پاؤنڈ کا ٹکٹ لگا دیا ہے۔

خوئے حکمرانی: برصغیر کے مغل فرمانرواؤں میں سے سب سے نیک اور متقی کہلائے جانے والے شہنشاہ نے اپنے والد کو آگرہ کے قلعے میں اس طور نظر بند رکھا کہ وہاں سے پردوں کا گزر بھی ممکن نہ تھا۔ مکمل قید تھائی۔ جب سابق شہنشاہ برہمپور کی قید تھائی سے آگیا تو اپنے بیٹے اور وقت کے شہنشاہ کو پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس ہمجہ طالب علم بھجوادے جے جائیں جنہیں وہ قرآن پڑائے۔ اپنے والد شاہ جہاں کا پیغام سن کر اورنگزیب عالمگیر مسکرایا اور والد کی

کوریہ کے دورے پر تھے اور اس دوران ان کے بیٹے نے ان کے پاسپورٹ پر ڈرائنگ بنا کر مکمل طور پر اپنے گھر کا مظاہرہ دکھایا جس کے باعث کسٹم حکام نے انہیں وطن واپسی سے روک دیا۔ جوئیر زیگ نے اپنے والد کے پاسپورٹ پر جانوروں کی تصاویر سے لے کر ہاتھوں اور پودوں تک کی تصاویر بنا ڈالیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی جوئیر زیگ نے اپنے والد کی موت نہیں اور ڈاڑھی بنا کر انہیں خرید پرکشش بنانے کی بھی کوشش کی۔ اب مسٹر زیگ نے جینی حکام سے رابطہ کیا ہے اور مدد کی درخواست کی ہے۔

30 لاکھ ڈالر انعام دینے کا اعلان: ملائیشیا کے کم شدہ بونگ 777 طیارے کے مسافروں کے رشتہ داروں نے ایک چندہ مہم شروع کی ہے اور جمع شدہ رقم میں سے طیارے کے بارے میں مصدقہ اطلاع دینے والے کو 30 لاکھ ڈالر انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

کیلے چور کہیں کے: وسطی امریکی ریاست ٹکساگو کی عدالت نے تین مردوں کے خلاف دو کیلوں کی چوری کے الزام میں مقدمہ شروع کر دیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ماہرین قانون نے اس مقدمے کی وجہ سے عدالت کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ سماعت کے دوران اتارنی جنرل کے ادارے نے کہا کہ تین ملزمان نے گزشتہ سال دسمبر میں 32 سینٹ مالیت کے دو کیلے ایک دکان سے چوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ دو ملزمان کو حراست میں رکھا گیا ہے جبکہ ایک اپنے گھر میں نظر بند ہے۔ ان لوگوں کے وکیل نے کہا کہ ان کے موٹوں کے خلاف مقدمہ شروع کرنے کے عدالت کے فیصلہ کی وجہ قابل وضاحت ہے۔



دنیا کی سب سے بڑی عمارت گاہ: خانہ کعبہ کی عمارت 49.5 فٹ بلند ہے۔ اس کی دیواروں کی لمبائی کچھ اس طرح ہے۔ مشرقی دیوار 38 فٹ 18 انچ، مغربی دیوار 38 فٹ 1.5 انچ، شمالی دیوار 33 فٹ 8.5 انچ۔ اس کے دروازے (باب منترم) کی لمبائی 6 فٹ 6.5 انچ اور چوڑائی 3 فٹ 13.5 انچ ہے۔

برصغیر کا پہلا ڈاک ٹکٹ: برصغیر میں پہلا ڈاک ٹکٹ یکم جولائی 1852ء کو سندھ کے گورنر نے جاری کیا۔ اس کی مالیت آدھا آنہ تھی اور یہ صرف 5 اضلاع کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اسے کرنسی نوٹ چھاپنے والے ادارے تھامس ڈی لارے اینڈ کمپنی نے شائع کیا تھا۔ اس کی شکل گول اور رنگ سرخ تھا۔ اس ٹکٹ کو براعظم ایشیا کے پہلے ڈاک ٹکٹ ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس کے اعداد گول دائرے میں "سندھ ڈسٹرکٹ ڈاک" چھپا ہے۔

دنیا کی مہنگی ترین گلی: ہانگ کانگ میں واقع رسل سٹریٹ دنیا کی مہنگی ترین گلی ہے۔ حالیہ ذرائع ابلاغ کے مطابق رسل سٹریٹ میں ایک دکان کی قیمت دو کروڑ 30 لاکھ ڈالر ہے اور یہاں سب سے زیادہ قیمت پر دکانیں کرائے پر ملتی ہیں۔ رسل سٹریٹ میں دکان خریدنا تو درکنار یہاں خریداری کرنا بھی آسان نہیں۔ دنیا کے امیر ترین لوگ ہی یہاں آ کر کچھ خرید سکتے ہیں ہر کسی کے بس میں نہیں کہ وہ یہاں شاپنگ کر سکے۔

بیٹے کی شہادت باپ کے لئے مصیبت: کبھی کبھی بچوں کی شرارتیں بڑوں کو کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہیں جس سے دو کوشش کے باوجود بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ ایسا ہی کچھ چینی سیاح کے ساتھ ہوا جو اپنے 4 سالہ بیٹے کی شرارت کے باعث جنوبی کوریا میں پھنس گیا۔ رپورٹ کے مطابق مسٹر زیگ اپنے بیٹے کے ساتھ جنوبی

مگر پولیس محنت اور دیانت داری سے تفتیش کرے تو پاتال میں چھے  
بجروں کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یہ تفتیشی کہانی اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔

## ڈکیتی کے بعد



ڈکیت شہزاد

0300-9667909

☆

ہوئے تھے جبکہ ان کی مقابل کرسی پر ایک گاڑک بیٹھا تھا۔  
نوجوان سید حائجر کی بغل میں کچھ گیا اور ان کے کندھے  
پر ہاتھ مار کر پیچھے دھکیلا۔ انہوں نے حاضر دماغی کا  
مظاہرہ کرتے ہوئے خطرے کے الارم والا نوحہ دیا مگر  
سائزن دھوکا دے گا۔ اتنے میں نوجوان نے اُن کی کٹھنی  
پر پورا زور کی نال لگا دی۔

”خبردار! اگر چالاک کی دکھائی تو بھیجا اڑا دوں گا۔“  
اس نے سرو لہجے میں کہا۔ ”ہاتھ پیچھے گردن پر رکھو اور  
کمرے ہو جاؤ۔“

باہر بابا کی جان سوکھنے لگی اور سامنے بیٹھا گاڑک  
کا پنے لگا۔ انہیں اپنی موت بالکل قریب دکھائی دے رہی  
تھی جس سے وہ خوف سے کانپ رہے تھے اور وہ حکم کے

کے جوتی علاقہ نرالا مگر پر ایک ڈیری والی  
گلاب پور روڈ واقع ہے جہاں بینک آف پنجاب  
کی برانچ بھی میں روڈ پر ہی واقع ہے۔ دن ساڑھے تین  
بجے کا وقت تھا۔ سڑک پر کافی گہما گہمی تھی۔ بینک میں اس  
وقت منیجر باہر بابا کے علاوہ کیشئر نجف علی، علیہ چوہدری، جی  
ایم زیدی، طارق باجوہ، چڑھی ڈاکٹر حسین، سوہرہ طارق  
کے علاوہ گاڑک روح علی اور اس کی ماں عائشہ فہیم جوی، محمد  
آصف و خورشید تھے۔ ٹھیک تین بج کر پینتالیس منٹ پر دو  
نوجوان بینک میں داخل ہوئے، دونوں ہی جلیٹ پیسے  
ہوئے تھے، ایک نوجوان روح علی کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا  
جبکہ دوسرا نوجوان منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

منیجر باہر بابا اس وقت کسی فائل پر نظریں گاڑے

سے لیروں کے بارے میں گہرائی سے پوچھ چمک کی۔  
السران نے ڈاکوؤں کے ذریعے چھوڑے گئے بینک کی  
تلاشی لی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ڈاک سکواڈ بھی باہر آ  
کر رک گیا۔ بینک میں لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی ہایت  
بینک ملازمین نے بتایا کہ وہ کئی ماہ سے خراب ہیں۔ اس  
کی اطلاع اعلیٰ السران کو دے دی گئی ہے۔ آئی جی قیصر  
حساس نے اعلان کیا کہ جو بھی لیروں کی اطلاع دے گا  
اُسے ایک لاکھ روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔ واقعہ کی  
رپورٹ تھانہ سول لائن ڈیپٹی کے تحت درج کی گئی اور  
تفتیش کا کام انسپٹر عاطف چوہدری کے سپرد کر دیا گیا۔

29 نومبر کو ڈیپٹی ہوئی تھی۔ رات دیر گئے تک جانچ  
پڑتال جاری تھی۔ السران لوٹ کی واردات پر بحث کر  
رہے تھے کہ بھی خبر آئی کہ باغ جناح پارک میں کچھ  
نوجوان ایک ہائیک کو آگ لگا کر بھاگ گئے ہیں۔  
ملاقاتی لوگوں کی اطلاع پر باغ جناح پولیس نے موقع پر  
پہنچ کر آگ بجھائی اور نیم سوختہ ہائیک قبضہ میں لے  
لی۔ اگلے دن آرٹی اے سے معلومات حاصل کی گئی تو علم  
ہوا کہ مذکورہ ہائیک رجانہ کے باشندے احمد فراز راجو کے  
نام پر ہے۔ پولیس نے احمد فراز راجو سے رابطہ قائم کیا تو  
انہوں نے بتایا کہ ہائیک بچھے بچھے راول تھیل سے چوری  
ہو گئی تھی جس کی رپورٹ تھانہ رجانہ میں درج ہے۔  
پولیس نے علاقہ کے کئی مشتبہ لوگوں اور کئی پرانے کار  
چوروں کو پکڑ کر حراست میں لے کر پوچھ چمک کی مگر معاملہ  
صفری نکلا۔ ادھر سول لائن پولیس نے بینک کے ملازم  
طارق اور احمد حسن کو حراست میں لے کر پوچھ چمک شروع  
کر دی۔

تک یہ نہیں کہ لوگوں کو خوفزدہ کر دیا جائے مگر یہ بھی نہیں ہے  
کہ اس کے سبب ملت کی شہرت کے لئے تکلیف جائیں۔  
تک یہ ہے کہ چھوٹ کی طرح بھی اس کی جگہ لے سکے۔

مطابق وہی کر رہے تھے جیسا وہ کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسی  
دوران روح علی خیر کے کمرے کی طرف آئی اور اس نے  
دیکھا کہ نوجوان خیر کی کپٹی پر ریوالور لگائے انہیں باہر کی  
طرف لا رہا ہے۔ روح علی چپ چاپ اپنی ماں کے پاس  
آ کر بیٹھ گئی اور ماں کو بتانے لگی۔ بھی اچانک اُس کے  
پچھے بیٹا نوجوان ریوالور لہراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”بھئی لوگ چپ چاپ کھڑے ہو جائیں۔“ اس  
نے حکم دیا۔ ”ہاتھ سر پر رکھ لیں اور اپنے موبائل زمین پر  
پھینک دیں۔“

پھر وہ اسٹرائیک روم کی طرف بڑھا۔ گاؤں کے  
پاس والا نوجوان بھی گاؤں کو کور کئے ہوئے اسٹرائیک  
روم میں لے آیا۔ اسی دوران ڈاکر حسین، طارق اور جی  
ایم زیدی نے کچھ حرکت کرنے کی کوشش کی تو ڈاکوؤں  
نے ریوالور تان کر انہیں ساکت کر دیا۔ پھر ایک بد معاش  
سبکی کو گن پوائنٹ پر کور کئے رہا جبکہ اُس کا دوسرا ساتھی  
لائے ہوئے بیگوں میں لوٹ بھرنے لگا۔ روپے بھرتے  
وقت اس بد معاش کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ یہ دیکھ  
کر روح علی کو لگا کہ وہ اناڑی ہے چشمہ ورڈ آؤٹ نہیں ہے اور  
ڈر رہا ہے، اُس نے ریوالور والے بد معاش سے بھڑنا چاہا  
لیکن بھی اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ محض  
چھوڑے منٹ میں قلمی انداز سے بینک لوٹ کر دلوں  
بد معاش ریوالور لہراتے ہوئے فرار ہو گئے۔

آؤں خود کار کیا ہوگا خود کار تو ہماری کا پچھتا ہے جو کھائے  
چارے کی قیمت اپنا گوشت کھلا کر ادا کرتا ہے۔

ڈاکوؤں کے بھاگ جانے کے بعد روح علی بینک  
کے باہر آئی اور پڑوسی ڈاکہ انداز علی جان سے موبائل لے کر  
15 نمبر پر واقعہ کی اطلاع پولیس کو دے دی۔ تھوڑی ہی  
دیر میں کئی قانون کی پولیس اعلیٰ پولیس السران کے ساتھ  
موقع پر پہنچ گئی۔ السران نے بینک میں موجود تمام لوگوں

دن گزرتے گئے مگر پولیس کو کوئی کامیابی نہیں ملی تو حسن عباس نے عہدے کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے سب سے پہلے سول لائن تھانہ انچارج عاطف چوہدری کا تبادلہ کر دیا اور ان کی جگہ ناصر گجر کو لایا گیا۔ بینک ڈکیتی کی تفتیش کر رہی پرانی ٹیم کو ہٹا کر نئی ٹیم بنائی گئی۔ ڈی پی او حسن عباس نے سافٹ ویئر کی ایک بالکل نئی تکنیک کا استعمال کیا۔ اس تکنیک سے موبائل ٹاور پر بیوی ٹریک کے باوجود پولیس کو آسانی سے کئی مشتبہ نمبر ملے جس سے پولیس کو کافی مدد ملی۔ پولیس کو ایک ایسا نمبر مل گیا جو حادثہ کے بعد سے ہی بند تھا جبکہ حادثہ کے وقت اس کی لوکیشن بینک کے موبائل ٹاور میں موجود تھی۔

کووڈس کا اتحاد اور چیونٹیوں کی غنیمت قطار کسی بھی قوم یا گھرانے کے لئے مشکل راہ ہو سکتی ہے۔

اسی دوران ایک دن اشرف عرف چہرا میرے گھر آیا اور مجھ سے کہا کہ کچھ کیا جائے ورنہ پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ اشرف کا دوست ساہر بھی پریشان تھا، اس کا باپ 18 سال قبل ہی لاپتہ ہو گیا تھا۔ تب سے آج تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ وہ ایم ایس سی کی فیس بھی نہیں جمع کرا پا رہا تھا۔ اسی وقت فون کر کے اشرف نے ساہر کو بلوایا۔ ہم لوگوں نے پارک میں بیٹھ کر بینک ڈکیتی کا منصوبہ بنایا۔ میرا بینک آف بنگالیر کالونی میں کھاتا تھا۔ اسی سبب مجھے وہاں کی سرگرمیوں کا علم تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر بینک کا نقشہ بنایا اور اشرف اور ساہر کو سمجھایا۔ اس کے بعد اشرف ساہر نے کئی بار بینک کی ریکی کر کے وہاں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے طے کیا کہ ایک موٹر سائیکل دو ریوالور وکارتوس کا انتظام پہلے ہی کر لیا جائے۔ میں نے اپنے دوست بنگلہ کے رہنے والے شاداب سے ایک ریوالور وکارتوس کا انتظام کر لیا۔ اس کے بعد اشرف سے وقت لے کر وکیل احمد جس کی بریانی کی دکان ہے، اس سے ایک ریوالور وکارتوس لے آیا۔

اسلحہ کا بندوبست ہو گیا۔ تب ایک موٹر سائیکل کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ منصوبے کے مطابق اشرف عرف چہرا اور میں اپنی یا ماہا موٹر سائیکل سے گول چکر گئے اور وہاں شیفٹ میں اپنی گاڑی کھڑی کر دی اور پرچی لے کر دونوں سول لائن واپس آ گئے اور اسی پرچی سے کپیڈٹر کی دکان سے سکین کر لیا۔ اس طرح ہمارے پاس دو پرچیاں ہو گئیں۔ اس کے بعد واپس جا کر ایک پرچی سے اپنی یا ماہا

سپولیس ٹیم نے اس نمبر کی آئی ڈی نکالی تو اجاز کا پتہ ملا جو اس بینک کا خاص کھاتے دار تھا اور اب یہ کھاتے بند تھے۔ پولیس نے تینوں کی آئی ڈی نکلوانی اور پھر نیو لیبر کالونی کے باشندے اشرف عرف چہرا، نواب پور کے باشندے ساہر کے علاوہ بنگلہ کے رہنے والے لالہ اجاز کو گرفتار کر لیا۔ اشرف عرف چہرا اور ساہر طالب علم تھے جبکہ اجاز ایم ایس سی کا طالب علم تھا۔

پھر چھ گھنٹہ میں ملزموں نے بینک ڈکیتی کا اعتراف کر لیا۔ انہوں نے ڈکیتی کا واقعہ جو بیان کیا تو اسے سن کر انسپران بھی ہکا بکار ہو گئے۔ اجاز قریشی نے پولیس کو بتایا کہ بنگلہ کے مکان نمبر 257 میں ہم رہتے تھے مگر حاجی وسیم وغیرہ نے دھوکا دے کر مکان اپنے نام لکھوا لیا۔ جب سے ہم لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ راجیل میرا دوست ہے جو لیبر کالونی میں رہتا ہے۔ اشرف عرف چہرا کا دوست ہے ساہر ہے جو اشرف کے ساتھ ایم ایس سی کر رہا ہے۔ میرا گھر جب وسیم وغیرہ نے لے لیا تو میں اشرف کی مدد سے سول لائن چوراہے کے پاس کمرے کا کمرہ لے کر رہنے لگا۔ میرے ماں باپ بہن بھائی بھی ساتھ رہتے تھے۔ تھوڑے دن بعد ہی ہم مٹان پور میں واقع ناصر کے بینک

باہر نکل آئے اور ریوانو لہراتے ہوئے موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گئے۔ آس پاس کے ڈکاندار زور زور سے گیر ریوانو دیکھ کر بھاگنے لگے۔ اس کے بعد اشرف نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی تو میں پیچھے بیٹھ گیا اور لال حویلی ہوتے ہوئے عثمان پورہ کالونی پہنچے جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میرے گھر والے سول لائن والے کرائے کے کمرے میں تھے۔ ہم لوگوں نے کمرہ بند کر کے وہیں پر سارے روپے گئے، وہ کل رقم ایک کروڑ دس لاکھ تھی۔

وہ ہنڈا موٹر سائیکل اندر کھڑی کر دی۔ پھر روپوں سے بھرے دو ڈول بیک پٹنگوں کے ڈبیر کے درمیان میں چھپا دیئے اور اپنے بھائی کو فون کر کے بلوایا۔ اس نے کچھ دن پہلے ہی گیسروالی سائیکل سات ہزار میں خریدی تھی۔ بھائی کے آنے پر اس کی گیسروالی سائیکل اشرف کو دلا دی۔ اشرف روپوں سے بھر ایک بیک لے کر اپنے گھر چلا گیا اور روپے اپنے گھر میں رکھ کر سائیکل سے میرے پاس آ گیا۔ اس بار سائیکل گھر میں کھڑی کر دی اور میں اپنی یا ما موٹر سائیکل سے اور اشرف ہنڈا موٹر سائیکل سے دھرا بیک لے کر اشرف کے گھر کی طرف چلے۔ میں آگے آگے چل رہا تھا، اشرف میرے پیچھے تھا۔ جب ہم لوگ باغ جناح پارک کے پاس پہنچے تو بٹھا کی چین ٹوٹ گئی۔ جسے اشرف نے وہیں چھوڑ دیا اور میری بائیک پر بیٹھ کر اپنے گھر پہنچا۔ اشرف نے دونوں بیک اپنے اوپری کرے کے پھان میں رکھ دیئے۔ ساہر کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بیک لوٹنے کے بعد وہ وہیں سے اپنے گھر چلا جائے گا۔ میں تو اشرف کے گھر سے واپس چلا آیا۔ موہا ل سیٹ وسم اسی دن توڑ کر بند پڑے ٹی وی کے اندر ڈال دیئے تھے۔ اُدھر رات گئے سنانے کا فائدہ اٹھا کر اشرف نے ثبوت مٹانے کی غرض سے ہنڈا موٹر سائیکل کو آگ لگا دی اور چپ چاپ اپنے گھر بھاگ گیا۔

اگلے دن اشرف نے مجھے بیس لاکھ 53 ہزار

موٹر سائیکل اٹھائی اور دوسری سکین پر جی سے موٹر سائیکل نمبر لکھ کر رات 8 بجے اسے بھی اٹھالیا۔ یہ موٹر سائیکل اشرف کے گھر ہی رہتی تھی۔ گھر والوں کے پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ ایک دوست کی ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے گھر بھی کھڑی کر جاتا تھا۔ جب ہمارے پاس دو موٹر سائیکل ہو گئیں اور ریوانو کا توں بھی ہو گئے تو اشرف عرف چھرا میرے گھر آیا اور فون کر کے ساہر کو بھی وہیں بلوایا۔ دوپہر تقریباً ساڑھے تین بجے بینک آف پنجاب پہنچے۔ ہم دونوں نے ایک سم دونوں سیٹ میں ڈال کر اپنے پاس اور ایک اشرف نے رکھ لی اور تیسری سم ساہر کے موبائل میں ڈال کر بینک کے سامنے سڑک کی دوسری ہڈی پر کھڑے ہو کر اپنے اپنے موبائلوں میں کال کا نمٹنگ کر لی۔ ساہر کو بینک کے باہر گمرانی پر لگا کر موٹر سائیکل لال حویلی جانے والی گلی میں کھڑی کر کے میں اور اشرف ہیلمٹ لگائے ہوئے ساڑھے تین بجے کے بعد بینک میں داخل ہوئے۔ مگر اس دن بینک میں گا کلوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے بہت نہیں پڑی ہم کبھی اس دن واپس ہوئے۔

مؤرخہ 27 نومبر کو بھی اسی طرح ہم لوگ اسی وقت بینک گئے مگر اس دن بھی امید سے زیادہ بھیڑ تھی۔ سو لوٹ آئے۔ پھر اگلے دن چھٹی ہو گئی۔ 29 نومبر کو پھر موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ہم لوگ بینک میں پہنچے۔ ساہر کو سڑک پر اتار کر میں اور اشرف ہیلمٹ لگائے بینک کے اندر داخل ہوئے۔ میرے ہاتھ میں پہلے سے ہی تین ہینڈ بیک روپوں کو بھرنے کے لئے تھے اور اشرف اپنے ہاتھ میں تالا لئے تھا جس نے صدر گیٹ میں کنڈی بند کر کے تالا لگا دیا تاکہ نہ کوئی باہر سے اندر آ سکے اور نہ ہی اندر سے کوئی باہر جا سکے۔ ایک چابی اشرف کے پاس تھی اور دوسری مجھے دے دی تھی۔ ہم لوگوں نے اپنی انگلیوں میں ٹیپ لگائے تھے تاکہ نشان نہیں آ سکے۔

بینک لوٹنے کے بعد صدر گیٹ کا تالا کھول کر ہم



## گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

صابر حسین راجپوت

ان کہانیوں میں صرف شکار نہیں حقیقی  
زندگی کے چونکا دینے والے ڈرامے، سچی  
محبت اور جھگڑا سیریز کے کردار اور  
پاکستان کی مردانگی کے حیران کن کارنامے  
ملیں گے۔

کتاب چسپ کرتا ہے اپنے  
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

کتاب کی قیمت

26 پیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ۔ لاہور

فون: 042-37356541

روپے دیئے۔ اُسی دن ہم لوگ مال روڈ پر گئے، یہاں  
سے نام سنگ گلیسی شپ موہاں لیا۔ اسی دکان سے  
اشرف نے بھی موہاں اور کچھ کپڑوں کی خریداری کی۔  
پندرہ ہزار روپے چنگ والے کے اُدھار چمکا کئے اور  
پچاس ہزار پانچ سو روپے گڑیا ماں کا اُدھار چکا یا۔ اگلے  
دن میں اپنے گھر والوں کو لے کر لاہور چلا گیا۔ مال روڈ  
پر واقع ایک ہوٹل میں سات دن رہا جس کا کرایہ بیس ہزار  
چمکا کیا۔ اس دوران ڈیفنس میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے  
لی۔ انہی دنوں میں واپس گلاب پور آیا اور ٹرک سے اپنا  
سامان لاہور لے گیا۔ ٹرک کا کرایہ بیس ہزار روپے دیا۔  
ایک لاکھ روپے اپنے بھائی ہارون کے کھاتے میں بینک  
آف پنجاب کی برانچ میں جمع کئے۔ اس طرح لوٹ کر رقم  
سے ہی کافی روپیہ کھانے پینے میں خرچ کر دیا۔

اسی طرح ساہرا اور اشرف نے بھی اقبال جرم کر لیا۔  
تینوں سے پولیس نے لوٹ کی کافی رقم برآمد کی۔ ساہرے  
فیس کے 50 ہزار روپے جمع کرائے تھے جو کالج انتظامیہ  
نے پولیس کو واپس کر دیئے۔ اسی طرح ہنگوں والے اور  
گڑیا ماں سے بھی رقم واپس مل گئی۔ پولیس نے تینوں کو  
عدالت میں پیش کیا۔ جہاں سے انہیں سیدھے جیل بھیج  
دیا گیا۔ بینک آف پنجاب نے پولیس کی پوری ٹیم کو  
اعزاز بخشا اور اپنے ملازم طارق وگاہک مدد علی کو بھی  
بلا خوف حوصلہ کھانے کے لئے اعزاز دیا گیا۔

جس طرح کسی خلائی جہاز کو مدار میں رکھنے کی گرفت سے نکلنے  
کے لئے ایک انتہائی بلند رفتار کی ضرورت ہوتی ہے اسی  
طرح ہمیں بھی اپنے مخصوص میلانات و تعصبات سے  
بالترک ہونے کے لئے بہت زیادہ قوت و ارادہ کی ضرورت ہے۔



مضبوط سکندری

## باعثِ ذلتِ پایا عتِ شرمندگی

یہ امر حیران کن ہے اور اہل ہند کے لئے مقامِ عبرت بھی کہ ایک تیس کی برتری کے باوجود اور وہ بھی اپنی ہی سرزمین پر ہم غلام بن گئے اور وہ بھی چند دنوں یا چند سالوں کے لئے نہیں بلکہ کم و بیش دو سو سالوں کے لئے۔

☆ سکندر خان بلوچ

برطانوی جنگوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارا سر شرم اور ذلت سے جھک جاتا ہے۔ برطانیہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو کم و بیش برصغیر سے 8 ہزار میل دور ہے۔ خشکی کا کوئی راستہ نہیں کہ وہاں تک پہنچا جائے یا وہاں کے لوگ یہاں تک پیدل مارچ کرتے ہوئے پہنچ جائیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ وہاں سے لوگ آ کر یہاں حکمران بن گئے۔ جب انگریز برصغیر میں آئے تو وہ محض تاجر تھے اور وہ تاجروں کی طرح مختصر سی جماعت کے ساتھ یہاں پہنچے۔ آئے بھی صرف ایک جہاز میں تھے جس پر اگر قبضہ کر لیا جاتا تو وہ ٹرپ ٹرپ کر مر جاتے واپس اپنے وطن نہ جا سکتے۔ (1608 میں ایک کزن نامی 500 ٹن وزنی صرف ایک جہاز جنوبی ہند کی بندرگاہ "سورت" پر لشکر اتار دیا۔ یہ جہاز کمپنیشن ہاکنز نامی شخص کماؤ کر رہا تھا۔) اس دور میں ہوائی جہاز نہ تھے کہ ایک ہی دن میں ایک

دفعہ جنگ کا حصہ ہوتی ہیں۔ اکثر چھوٹی افواج بڑی افواج پر غالب آ جاتی ہیں جس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جنگ بدر میں بھی یہی کچھ ہوا تھا کہ 313 کا مسلمان لشکر ایک ہزار کفار پر غالب آ گیا۔ اگر اس جنگ کا تجزیہ کیا جائے تو دو وجوہات سامنے آتی ہیں۔ اول: جنگی قیادت اور دوم: جنگی جذبہ۔ اس وقت مسلمانوں میں یہ دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جنگی قیادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تھی اور یہ منہجی بھر مسلمان جذبہ اسلام سے بھی سرشار تھے۔ جس فوج میں یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہوں وہ ہمیشہ فتح سے ہمکنار ہوتی ہے۔ یہی صلاحیتیں مسلمانوں کے اس لشکر میں بھی تھیں جو طارق بن زیاد کی قیادت میں ساحل اندلس پر لشکر اتار دیا اور اندلس کا مالک بن گیا۔ اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ہم برصغیر میں

نر صغیر آسکتے تھے۔ اس وقت کے نر صغیر کی آبادی تقریباً 15 کروڑ تھی۔ اگر پوری برطانوی آبادی کا تناسب بھی نکالا جائے تو اہل ہند کو ایک کے مقابلے میں تیس کی برتری حاصل تھی جبکہ جنگ بدر میں اہل کفار کو ایک کے مقابلے میں تین کی برتری حاصل تھی۔ یہ امر حیران کن ہے۔ اور اہل ہند کے لئے مقام عبرت بھی کہ ایک تیس کی برتری کے باوجود اور وہ بھی اپنی ہی سرزمین پر ہم غلام بن گئے اور وہ بھی چند دنوں یا چند سالوں کے لئے نہیں بلکہ کم و بیش دوسو سالوں کے لئے۔

یہ امر مزید حیران کن ہے کہ نر صغیر میں دوسری جنگ عظیم کے دوران زیادہ سے زیادہ برطانوی فوج جسے گورنر فوج کہا جاتا تھا، صرف ساٹھ ہزار تھی اور کسی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ سول بیوز و کرپٹ بشمول تمام ملازمین دو ہزار سے زائد نہ تھے۔ بالفاظ دیگر انگریزوں نے محض 62 ہزار برطانوی اشخاص کی مدد سے 40 کروڑ ہندوستان میں اور 37 لاکھ مربع کلومیٹر پر حکومت کی۔ یاد رہے کہ 1941 تک ہندوستان کی آبادی بڑھ کر 40 کروڑ تک پہنچ چکی تھی۔ اس حساب سے تو تناسب فی برطانوی چھ ہزار ہندوستانی بنتا ہے اور اگر فوج کا حساب بھی لگایا جائے تو دوسری جنگ عظیم میں 60 ہزار برطانوی فوج کے علاوہ 21 لاکھ ہندوستانی فوج بھی تھی جنہیں برطانوی آفیسرز کمان کر رہے تھے یعنی ایک گورے سپاہی کے مقابلے میں تقریباً 35 مسلح ہندوستانی سپاہی تھے۔ پھر بھی حکومت انگریزوں کی ہی رہی۔ ایک اچھا اور پھر تھلا گڈریا بھی بیک وقت 20 سے 25 بھیلروں کو 5 بو میں رکھ سکتا ہے یا 15 سے 20 بڑے جانوروں کو۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک گڈریا ہزاروں کی تعداد میں جانوروں کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔ چہ جائیکہ انسانوں کو لیکن ہم تو جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ 40 کروڑ کی تعداد میں ہوتے ہوئے 62 ہزار کی غلامی میں رہے..... غلام

کچھ آسکتے یا مزید ملک یہاں آسکتی۔ جب انگریزوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو مغل حکومت عروج پر تھی۔ وسائل بھی بے انتہا تھے اور انہی وافر وسائل کی وجہ سے ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ بھوکے نگلی یورپی اقوام ہندوستان پہنچنے کے لئے بے قرار تھیں۔ اس دور میں خیر سوین بھی تھی کہ برطانوی ایک دو ہفتوں میں یہاں پہنچ جاتے بلکہ انہیں آدمی دنیا کے گرد چکر لگا کر یہاں آنا پڑتا تھا۔ وہ انگلستان سے روانہ ہو کر مغربی یورپ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مراکو تک پہنچتے تھے اور پھر پورے افریقہ کے گرد چکر لگا کر سورت جنوبی ہندوستان تک پہنچتے تھے۔ کچھ تاریخی حوالوں سے یہ کم از کم 9 ماہ کا سفر تھا۔ Navigation کے طریقے بھی جدید نہ تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کولمبس یورپ سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوا اور ہندوستان کی بجائے شمالی امریکہ جا پہنچا..... ان حالات پر جب غور کیا جائے تو کوئی وی ہوش انسان یہ قبول نہیں کر سکتا کہ برطانوی تاجروں کی یا ملاحوں کی اتنی دور سے بے سرو سامانی کی حالت میں یہاں پہنچنے والی چھوٹی سی لونی اتنے بڑے نر صغیر کی مالک بن گئی۔ اتنی بڑی ہندی افواج کو شکست دی اور شکست بھی مکمل برطانوی فوج کے ساتھ نہیں بلکہ ان انگریزی تاجروں کی قائم کردہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم سپاہیوں کے ساتھ یعنی وہی سپاہی جب اپنے وطن کی طرف سے وطن کی حفاظت کے لئے لڑے تو ریت کی دیوار ثابت ہوئے لیکن جب انگریزی کمان کے تحت لڑے تو اپنے سے کئی گنا بڑی اپنے ہی وطن کی افواج کو جس جہس کر ڈالا۔ سمجھ نہیں آتی ایسا کیونکر ہوا۔

سترویں صدی کے شروع میں برطانیہ کی کل آبادی بمعدہ آئرلینڈ پچاس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ تمام کے تمام لوگ فوجی نہ تھے اور نہ ہی یہ سب لوگ

## بیشی

(پجاری بیٹی شمینا نور کے نام جو کسی میں فوت ہوئی)

محمد اور بس انور کوٹ

تم نے تو کہا تھا عید پہ آ جاؤں گی  
لوٹ آؤ جانے پھر عید آئی ہے  
پاپا سے پچھرنے کا تب سوچا تھا نے  
یہ کیسا دھوڑا ہے، کیسی یہ ہدائی ہے  
جنت کی لٹائوں میں پرواز تیری ہر دم  
وہ کیسی دنیا ہے جو تُو نے بسائی ہے  
حوروں نے تجھے ہاتھوں ہاتھوں لپا ہو گا  
لگتا ہے ستاروں نے تیری مانگ سہائی ہے  
جدا ہو کے جو ہم سے، رنج سفر باندھا  
مڑ کے بھی نہ دیکھا کیسی قیامت ڈھائی ہے

تھے جو افواج کو لڑا سکتے۔ دوسری بد قسمتی یہ بھی کہ بغاوت  
کرنے والی فوج میں ہندی آفیسرز نہ تھے۔ اُس وقت  
تک کسی بھی ہندوستانی کے لئے سب سے بڑا رینک  
صوبیدار تھا اور یہ لوگ زیادہ تر راجپوت اور مہاراجوں کی  
اولادیں تھیں جنہیں یہ رینک ان راجوں کو قابو میں رکھنے  
کے لئے اعزازی طوطہ پر دیا جاتا تھا اور یہ لوگ برٹش  
آفیسرز اور ہندی فوج کے درمیان محض رابطے کا کام دیتے  
تھے۔ یہ لوگ جنگی قیادت کے اہل نہ تھے۔

ان حالات میں بغاوت کرنے والے فوجی طاقت  
کے طول و عرض سے دلی کی طرف بھاگے تاکہ بادشاہ  
سلامت کی قیادت میں لڑیں۔ تقریباً 80 فیصد فوج باغی  
ہو کر بھاگ گئی۔ بہت سے لوگ راستے کی مشکلات کا  
شکار ہو کر مارے گئے اور ایک بڑی تعداد کو انگریزی افواج  
نے جن جن کر مار دیا۔ مثلاً پشاور اور گرد و نواح

اور تابعداری اس حد تک کہ کم و بیش اڑھائی لاکھ  
ہندوستانیوں نے انگریزوں اور انگریزی حکومت کے لئے  
جان دے دی۔ یہ لوگ مختلف محاذوں پر برطانیہ کی طرف  
سے لڑتے رہے۔ تقریباً 12 لاکھ ہندوستانی انگریزی  
پالیسیوں کی وجہ سے مارے گئے ان میں 10 لاکھ افراد تو  
صرف 1947 کی تقسیم ہند میں مارے گئے حالانکہ انگریز  
اس مسئلے کو صلیبی صفائی سے حل کرا سکتے تھے اور تقریباً 2 لاکھ  
کے لگ بھگ اُن انگریزی جنگوں میں کام آئے جو  
انگریزوں اور مقامی راجوں مہاراجوں کے درمیان  
ہوئیں۔

1857 میں جنگ آزادی کے وقت کل انگریزی  
فوج کی تعداد 45 ہزار برطانوی تھے اور تقریباً اڑھائی  
لاکھ کے قریب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سایہ مارے لوگ  
فوجی ملازمت کرتے تھے جو 'Native Infantry'  
یعنی مقامی انگریزی کہلاتے تھے۔ یہ لوگ کلکتہ سے پشاور  
تک مختلف چھاؤنیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُس وقت  
جبکہ نقل و حرکت اور مواصلاتی وسائل بھی نہ ہونے کے  
برابر تھے لہذا 45 ہزار برطانوی فوج کے لئے اڑھائی لاکھ  
کی فوج جو کہ 37 لاکھ مربع کلومیٹر میں پھیلی ہوئی تھی کو قابو  
میں رکھنا بالکل آسان کام نہ تھا۔ انگریزی حکومت کی  
طرف سے فوجی نظم و ضبط قائم رکھنا واقعی قابل ستائش عمل  
تھا۔ 1857 میں جب فوجی بغاوت ہوئی تو یہ بغاوت  
میرٹھ سے شروع ہو کر پشاور تک پہنچ گئی۔ ہندی سپاہی  
انگریزوں کے ساتھ لڑنے کے لئے اور اپنی جان دینے  
کے لئے تو تیار تھے لیکن بد قسمتی سے اُن کے پاس کوئی  
قوی سطح کی قیادت نہ تھی جس کے ارد گرد وہ اکٹھے ہوتے  
اور اُس کی زیر قیادت لڑتے۔ نے دے کر آخری مغل  
حکمران بہادر شاہ ظفر تھا جو بادشاہ سے زیادہ درویش تھا یا  
شاعر تھا۔ اُس میں بڑی فوج کی قیادت کرنے کی  
صلاحیت ہی نہ تھی نہ ہی اُس کے پاس کوئی تجربہ کار جرنیل

بھاری توپیں بھی تھیں۔ اُس زمانے کے مطابق یہ فوج مکمل تربیت یافتہ اور ہتھیاروں سے لیس تھی۔ انگریزی فوج لارڈ کلائیو کی زیرکمان محض 750 برطانوی سپاہیوں، 150 توپخانہ کے لوگ اور تقریباً 2 ہزار مقامی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یہ تعداد ہر لحاظ سے معمولی تھی اور ایک دلیر جرنیل ایک دن میں 50 ہزار کی فوج کے ساتھ اس چھوٹے سے دستے کی تباہی لاسکتا تھا مگر کلائیو نے سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو خرید رکھا تھا۔ لہذا 50 ہزار کی مقامی فوج 750 برطانوی سپاہیوں سے شکست کھا گئی۔ یہی کچھ ٹیپو سلطان کے ساتھ بھی ہوا۔ اسی طرح 1760ء میں اُس وقت کے بادشاہ ہند شاہ عالم اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے مل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہتھیار سکھانے کے لئے 40 ہزار کا جرنی لشکر تیار کیا۔ اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر ہی ایک کمانڈر کا خون خشک ہو جاتا ہے لیکن انگریز ہندوستانیوں کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ لہذا انگریز گھبراہٹ اور پریشانی کے انہوں نے مقابلے کا چیلنج قبول کیا۔ 27 اکتوبر 1764ء کو جیمز منرو Munro محض 850 برطانوی تقریباً 18 ہزار مقامی فوجیوں کے ساتھ میدان جنگ میں خیمہ زن ہوا اور اُس نے اس 40 ہزار کے جرنی لشکر کو بڑی طرح شکست دی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی ہزار آدمی مارے گئے۔

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی فوج کی اتنی بڑی شکستیں ناقابل فہم ہیں۔ اگر 45 ہزار فوجیوں کو بھیس مارنے پر بھی لگا دیا جائے تو وہ پونے دو لاکھ بھیس مار سکتے جو انہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی مارے۔ 1840ء کی دہائی میں جنرل جیکب کی زیرکمان جب انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا تو اُن کے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ ایک انگریز لیفٹیننٹ نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر اُسے ایک کمپنی برطانوی سپاہیوں کی دے دی جائے تو وہ پورا بلوچستان فتح کر سکتا ہے۔ نتیجاً

نوشہروہ مردان میں تقریباً 3 ہزار انگریز فوج اور 12 ہزار ہندو فوج موجود تھی۔ صرف پشاور چھاؤنی میں دس ہزار مقامی فوج موجود تھی۔ یہ سب لوگ بغاوت کر کے بھاگ گئے لیکن انگریز فوج کی بہادری اور جرأت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس تین ہزار فوج نے 10 ہزار بھاگنے والی فوج کا پیچھا کیا اور اکثریت کو مار دیا۔ اسی جرأت مندانہ قدم سے کم از کم اس علاقے میں مزید بغاوت رک گئی اور بعد میں مقامی فوج نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی فوج پنڈی، کوہاٹ، پشاور، نوشہروہ اور جالندھر سے مقامی فوجی یونٹس لے کر مقابلے کے لئے ولی پٹی۔

جنگ کا آخری محاذ دلی شہر تھا۔ 45 ہزار کی انگریز فوج اور اتنی ہی تعداد مقامی افطری کی تھی۔ ان یونٹوں نے دلی کا محاصرہ کیا۔ دلی میں ایک بہت بڑی ہندوستانی فوج موجود تھی۔ اسلئے کی بھی کی نہ تھی۔ انگریزوں نے مقابلہ کرنے سے پہلے دلی کے اندر رہائش پذیر کچھ نوجوانوں اور دیسی افواج کے سپہ سالاروں کو خرید لیا اور جاسوسی کا ایک مربوط نظام قائم کر دیا اور یوں دلی کی خبریں انگریزوں تک پہنچنے لگیں۔ اس کے بعد دلی کا قبضہ محض رسمی کارروائی ثابت ہوئی۔ اس بغاوت میں مقامی فوج کے کئی ہزار سپاہی مارے گئے اور برطانوی فوج کا بہت کم نقصان ہوا۔

برطانوی بیٹھے بٹھائے تو ہندوستان کے مالک نہیں بنے تھے۔ انہوں نے کئی خولناک جنگیں بھی لڑیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ مٹھی بھر انگریز فوجیوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی فوجوں کو نہ صرف شکست دی بلکہ وہ اُن کے سامنے محض ریت کی دیواریں ثابت ہوئیں۔ انگریزوں کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ایک مؤثر نظام جاسوسی اور مقامی سپہ سالاروں کی خرید تھی۔ مثلاً دہلی کی جنگ میں نواب سراج الدولہ کی افواج کی تعداد 50 ہزار پیادہ اور 18 ہزار گھڑسوار تھی۔ جنگ کے لئے 53 ہزار

اپنی آزادی کے لئے خطرہ سمجھا۔ ہذا کرکس کے مقابلے کے لئے آئے۔ اُن کے پاس کوئی خاص ہتھیار بھی نہ تھے نہ ہی فوجی تنظیم تھی۔ انہوں نے فوج کی واپسی کا راستہ بند کر دیا ہے درپے حملے کر کے مکمل فوج کو تباہ کر دیا۔ 18 ہزار کے لشکر میں سے صرف ایک ڈاکٹر زندہ بچا۔

دوسری مثال جاپان کی ہے۔ جاپان اُس دور میں ترقی کے لحاظ سے ہندوستان سے بہت پیچھے تھا۔ 1854ء میں امریکن نیوی کا کوزو در پیری Perri بعد ایک بڑے نیول دستے کے جاپان کے ساحل پر لشکر انداز ہوا۔ اُس کا مقصد بھی تجارت تھا اور تجارت کی آڑ میں قبضہ خوش قسمتی سے جاپان کی قیادت بڑی ہوشیار، عقلمند اور دور رس سوچ کی حامل تھی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ امریکن ان سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ لہذا انہوں نے امریکیوں کو خوش آمدید کہا۔ امریکن طرز کی تعلیم رائج کی۔ ان سے علم و ہنر سیکھا۔ امریکن طرز پر ان کی مدد سے انڈسٹری قائم کی اور نصف صدی کے عرصہ میں اتنی ترقی کی کہ 1905ء میں جب روس نے ایک بہت بڑے بحری جہاز کے ساتھ جاپان پر حملہ کیا تو جاپانیوں نے جاپان کے اپنے بنے ہوئے جہازوں سے نہ صرف اس حملے کا مقابلہ کیا بلکہ تمام روسی بحری جہازوں کو سمندر میں غرق کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم لڑنے اور اپنی جتنی برداشت کرنے کے باوجود جاپان آج بھی آزاد ہے اور ایک معاشی طاقت ہے۔ ہم بالواسطہ طور پر آج بھی غلام ہیں اور معاشی طور پر بھکاری اور مشنوک الحال۔ آئیں اپنی کارکردگی کا تجزیہ کریں اور زمانے کے ساتھ جانے کی کوشش کریں ورنہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے (خدا نخواست)۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ شعنی کی سزا مرگِ مغاجات



ہم سب کے لئے شرم اور ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ برطانوی افواج اپنے اپنی ہتھیاروں کی وجہ سے کامیاب ہوئی لیکن یہ دعویٰ بھی صحیح نظر نہیں آتا کیونکہ اُس ابتدائی دور میں فوج کے پاس محض دو قسم کے ہتھیار تھے ایک تو توپخانہ تھا اور اُس زمانے میں توپ کی جدید فائر محض ایک ہزار گز تک تھی اور رفتار تین منٹ میں ایک گولہ۔ دوسرا ہتھیار ایک بڑوکہ حم کی بندوق تھی جس کی فائر رینج محض پچاس گز تک تھی اور ہر فائر کے بعد کھوکھا نکال کر دوبارہ لوڈ کرنا پڑتی تھی۔ یوں رفتار ایک منٹ میں ایک گولی تھی۔ ان ہتھیاروں کے ساتھ دلیر سے دلیر سپاہی بھی حملہ آور فوج کا بہت زیادہ نقصان نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دلیر حملہ آور کیلوری کمانڈر تین منٹ میں فائر کرنے والے کے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ لہذا یہ مفروضہ غلط ہے کہ انگریزوں کے پاس زیادہ اچھے ہتھیار تھے۔ واحد فرق یہ تھا کہ انگریزوں کے لئے جنگ زمینی اور موت تھی لہذا وہ جرأت سے لڑے اور عقل کا استعمال کیا جبکہ ہندوستانی جگر ان اور افواج آرام پسند اور شدید جنگ کے لئے قطعاً نکل نہ تھے۔ لہذا یا تو افواج دوڑ جاتی تھیں یا گاجر مولیٰ کی طرح کٹ جاتی تھیں۔ دلیرانہ مقابلہ کرنے کے قابل ہی نہ تھیں اور نہ ہی اُن کے کمانڈرز لڑنے کے اہل تھے۔ اس کے علاوہ اہم ہتھیار تلوار تھی جس میں دیسی لوگوں کا پلہ بھاری تھا لیکن پھر بھی یہ کچھ نہ کر سکے۔ یہ بھی غلط ہے کہ یورپی اقوام دیسیوں سے زیادہ عقلمند اور زیادہ دلیر تھیں۔ جہاں جم کر مقابلہ ہوا یورپیوں کی ہار ہوئی۔ یہاں دو مثالیں قابل غور ہیں۔

1841ء میں 18 ہزار برطانوی فوج افغانستان پر حملہ آور ہوئی۔ شدید جنگ لڑی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ نامراد واپس لوٹی۔ کابل سے واپسی پر افغانیوں نے فوج و بہت زیادہ نقصان کیا لیکن جب انہیں ہمارے موجودہ قبائلی مناتے سے گزرنا پڑا تو قبائلیوں نے انگریز فوج کو

## ورودی کا تقدس

میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے معاشرے کو ایماندار پولیس  
مل جاتی تو کم از کم نصف معاشرتی برائیاں ختم ہو چکی ہوتیں۔



ڈاکٹر مہر حسن ملک

☆

کے تمنے سجادے گئے تھے۔ ان تمنوں کے ساتھ اس کی  
کیپ بھی پڑی تھی جو ورودی کے اس تقدس کی غمازی کرتی  
ہے جس کی آن کے دفاع میں شہید نے اپنی جان دی  
تھی۔

وہ سال ابھرے لو کہیں کے تھے۔ اس دور کے  
واقعات ذہن پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ پھر یہ تاثر بڑا دیر پا  
ہوتا ہے، شاید عمر بھر کے لئے اسباق دے جاتا ہے۔ میں

ورودی کی اپنی ایک عظمت ہوتی ہے، تقاضے بھی۔  
ورودی کسی مشن کے تحت پہنی جاتی ہے جو دھرتی  
ماں ہا ورودی سپہوتوں کو سونپ دیتی ہے۔ وہ کڑیل اور جیلا  
جوان تھا، پولیس افسر، جو تھاکئی ڈکیتوں کا مقابلہ کر رہا تھا،  
پھر سینے میں پوسٹ گولیاں سجائے شہید ہو گیا۔ میں نے  
سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا بدن  
ثبوت میں بند کر دیا گیا تھا اور لکڑی کے اس ہاکس پر شہید

دل چاہتا کہ کاش وہ وہو نو پروں کا سہارا مل جائے اور ہم ساتھیوں کا فاصلہ لٹکوں میں طے کر لیں۔ ہوم وزٹ کی یہ سہولت کبھی کبھار ملتی تھی۔ ایسا ہی ایک ناخوشگوار سفر میری یادوں میں جاگزیں اور ان مت نقوش چھوڑ گیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں اپنی کار میں محو سفر تھا کہ ایک چوکی پر پولیس نے میری گاڑی روک لی، وہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

چوکی کا انچارج مجھے یوں گھورنے لگا جیسے میں کوئی جرائم پیشہ شخص تھا۔ میرا تصور کیا تھا، میں نہ جان سکا۔ مجھے گاڑی سے باہر آنے کا حکم دیا گیا، جو میں نے مان لیا۔ میری گاڑی کی تلاشی کے بہانے میرا سامان سڑک پر بکھرا دیا گیا بعد میں علم ہوا کہ میں صوبہ پنجاب کی حد میں داخل ہو رہا تھا اور میں نے دیگر افراد کی طرح جیب سے سو روپیہ نکال کر چوکی کے باسیوں کی منگی گرم نہیں کی تھی۔ اس نے سیدھے سادے لفظوں میں فرمائش دہرائی بھی تھی۔ تاکر وہ جرم کی یہ مزا لی تو میں غصے میں لال چلا ہوا گیا۔

”تم کس سرحد کی بات کرتے ہو، ایک سرحد سے تو میں آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ اس کے بعد میں لگا تار بولنے لگا۔ ”سرحد تو وہ ہے، جہاں ماؤں کے توبہ مند لعل ارض وطن اپنے لہو سے سنبھل رہے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ تم جیسے حشرات الارض عوام الناس کی حلال کمائی جیبوں سے نکلوا کر ان کے لئے جہنم کا سامان پیدا کریں۔ خدا کا خوف کرو، تم تو نار میں جاؤ گے ہی، ان کو بھی مرہٹی کے خطرہ ساتھ لے جاؤ گے۔“

اگلے لمحے ”محافظ“ کی بھری، مگر جرم سے نتھری ہوئی آواز میری سچائی کے نسخے میں دب کر محجف ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے میرے دل و ذہن میں سنا ہوا ہیرد چیخ مار کر رہ پڑا ہو اور امن کا جوان لاش قبر میں ترپ گیا ہو۔ سفر کے دوران اس کی شہادت کا منظر میرے ذہن میں بار بار تازہ

اس شہید کا نام نہ جان سکا۔ جانتا تو بھی شاید نہ لکھتا کیونکہ وہ میرا ہیرو تھا، عرف ہیرو، جو اپنا نصب العین میرے وقت حیات میں بن گیا تھا۔ میں ایسے تمام جاں نثاروں کو سلام پیش کرتا ہوں جو اپنی جان انسان اور وطن پر قربان کر دیتے ہیں۔

کبھی زندگی میں محافظان وطن کا تصور ابھرا تو وہی شہید میرے ذہنی آفاق پر مسکرانے لگا، پھر عجب سی خواہش ہو میں سرایت کرتی تھی کہ کاش اتمام وردی پہننے والے قربانی کے اسی سانچے میں ڈھل جائیں جسے اہل وطن بے ساختہ محرم دے سکیں۔ پھر ایک روز قسمت نے مجھ کو بھی فوجی وردی زیب تن کرا دی مگر میں اپنے لڑکپن کے ساتھی ہیرو کو کبھی نہ بھول سکا بلکہ اس کو ان تمام شہیدوں کی جمعیت میں احترام دیتا رہا جو فوجی اقدار میں میری کتاب زیست پر اپنے نقوش چھوڑتے رہے۔

مجھے اپنا ہیرو زندگی میں کئی بار یاد آیا، ان وقتوں میں بھی جب میں اسے خیالوں سے دور رکھنا چاہتا تھا بلکہ شاید یادوں سے محو کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے شرمندگی کے اس لہادے میں نہ دیکھ سکوں جو معاشرے کی ہوس ناکوں نے گزرتے اقدار میں شعبہ ہائے زندگی کو پہنا ڈالا ہے کیونکہ مجھے اپنا ہیرو جب بھی کرب میں نظر آیا، بے حد ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔

ان دنوں کی بات ہے جب ہم ریگزاروں میں دفاع وطن کر رہے تھے۔ مشکل دور تھا گری اپنے زوروں پر تھی۔ صحرا میں قدرتی سائے ناپید تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ شمس کی حدت نے ہمارے رنگ و روپ کو جھلسا دیا تھا۔ تہتی دھوپ میں کبھی ریمک صحرا پر نکلتے تو اس طور دیکھتے کہ دشمن ہمارے گرد منڈلاتی صحرائی کھیاں بھی کھوج لیا کرتا تھا۔ ہمیں سوئے گئے فرائض اور ان کی بجا آوری کے باعث اہلیان وطن چین کی فینڈ سو سکتے تھے۔

کبھی چھٹی ملتی تو ہمیں گھر بے تماشا یاد آنے لگتا۔

سپاہی نے تقریباً چلا تے ہوئے کہا۔  
"جی مجھے خبر ہے روزانہ اتنے ہی ملتے ہیں۔"

نوجوان نے دوبارہ معصوم سا جواب دیا۔  
"اوتے، کوئی پٹرول، ڈیزل کے پمپ نہیں ملتے؟  
گاڑی ہے، راستے میں اچانک خراب بھی ہو سکتی ہے؟"  
"میرے پاس اسے ٹی ایم کارڈ موجود رہتا ہے۔"

نوجوان نے معصوم رویہ برقرار رکھا۔  
"کسی دوست وغیرہ کو بلاؤ، اس کے ہمراہ جاؤ اور  
کم از کم چارہ ہزار کے نوٹ ساتھ لے کر آؤ۔" سپاہی  
نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ اپنی مخلوق وصول کر رہا  
تھا۔ "نفع آدر اشیاء کا گاڑی سے نہ آدھوان بڑا کیس بن  
سکتا ہے۔" اس نے نوجوان کو گھورتے ہوئے بات ختم  
کی۔

تمام معاملہ دیکھ کر میرا جی کڑھنے لگا۔ مجھے نوجوان  
پر بہت ترس آیا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک طرف روکی اور  
آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں عموماً نہیں کہتا مگر  
اس دم موقع کی مناسبت سے ضروری تھا۔ اس روز  
میرے ذہن میں بسا سپاہی کا تصور آئی روپ ایک بار پھر  
چکنا چور ہوا۔ میں دیر تک بے حد بے چین رہا۔ وہ کام بھی  
نہ کر سکا جس کے لئے عازم سفر ہوا تھا۔

اب میں اس واقعے کی طرف چلتا ہوں جس کی وجہ  
سے میں نے یہ تحریر مرتب کی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس غیر  
متوقع حادثے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور اس میں مجھے  
معاشرے کا گھناؤنا چہرہ عیاں نظر آیا۔

ڈرامے کا مرکزی کردار میرا انیس سالہ بیٹا شرجیل  
تھا جو ایک بڑے شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے  
اسے کالج کے قریب چھوٹا سافلیٹ کرائے پر دلا رکھا تھا۔  
اس کے پاس اپنی بھولی سی گاڑی بھی تھی۔ عمارت میں  
اس کے کالج کے چند دیگر طلباء بھی مقیم تھے۔

ایک محسوس پہر مجھے اجنبی نمبر سے ٹیلی فون کال

رہا۔  
اس واقعے کو بہت سالی گزر گئے میرے عروج کا  
سورج غروب ہو گیا اور ایک نئی نسل میں کر جان ہو گئی مگر  
ظالم اور مظلوم کا رشتہ بہ درجہ اتم موجود رہا بلکہ شاید بڑھتا  
گیا۔

میں اپنی گاڑی پر پنجاب کے ایک بڑے شہر میں  
داخل ہو رہا تھا۔ ایک بڑا ہی عبور کر کے موٹروے سے شہر  
کی طرف اتر رہا تھا۔ سیدھا محافظ پولیس کے "مستند"  
ٹاکے میں گھر گیا۔ وہی منظر درپیش ہوا جسے میں وٹنی نہاں  
خالوں میں عمارت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ ایک طالب  
علم ٹاکے کا شکار ہو رہا تھا۔ نوجوان مجھے اپنے بیٹے کی طرح  
دکھائی دیا، جس کے گرد قانون کے محافظ بھینچوں کی طرح  
جمع تھے۔

"مگر میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی؟" نوجوان کے  
چہرے پر پریشانی کا پسینہ جھلک رہا تھا۔

"تمہاری کار سے یہ پاؤڈر برآمد ہوا ہے۔" ایک  
سپاہی نے اسے لفافہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "نفع کرتے  
ہو؟" سپاہی کی آواز بلند ہو گئی۔ ڈانٹ کا لہجہ سن کر  
حاضرین کا پتہ پانی ہو گیا۔

"مگر یہ لفافہ میرا تو نہیں، آپ کا ہے۔" نوجوان  
نے بھولپن میں اصرار کیا۔

"کار ایک طرف لگاؤ، تلاشی ہوگی۔ تمہاری بھی اور  
گاڑی کی بھی۔" ایک دوسرے بھاری بھر کم سپاہی نے اپنا  
حکم صادر کیا اور پیٹ سنہالنے کی سعی کرنے لگا۔

نوجوان نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔  
پولیس کا بھاری بھر کم سپاہی نوجوان کی تلاشی پر مامور ہو  
گیا۔ چند لمحوں بعد نوجوان کا پرس سپاہی کے ہاتھوں میں  
نقل رہا تھا۔ چند دیگر حریفیں لگا ہیں بھی پرس پر ہل رہی  
تھیں۔

"اوتے، اس میں تو صرف پانچ سو روپے ہیں۔"

سلجھانے لگی۔ بے رہاسی کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں۔  
شرجیل پر بڑے خطرناک الزامات تھے۔ اس نے  
شراب پلائی کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی دوران دھریا  
گیا تھا۔ بات سن کر میں چکرا سا گیا۔ شرجیل پڑھنے والا  
لڑکا تھا۔ سمجھدار بھی ہو رہا تھا۔ ایسا گھٹیا کام کیسے کر سکتا  
تھا؟ جبکہ اسے اخراجات کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ ہم اس کی  
ضروریات پوری کر رہے تھے۔ افکار میرے ذہن میں  
گردش کرنے لگے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میرا بیٹا  
حالات کا شکار ہو چکا تھا اور کسی گہری مصیبت میں پھنس  
گیا تھا۔

پر اے شہر میں مجھے اپنے بھائی کی مدد حاصل ہو گئی،  
وہ پولیس کے سینئر انسپران سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔  
رات ڈھل رہی تھی، ہماری حالت غیر ہو چکی تھی۔  
بھوک اور تشنگی کا گمان یاں ویم کے جذباتوں سے دب چکا  
تھا۔ ہر دم بیٹے کی لڑکھائے جاری تھی۔ اس کی عافیت کی  
دعا میں لیوں پر تھمنے میں نہ آتی تھیں۔  
ٹونی نے بے حد مدد کی۔

"میرا تعلق انڈر ورلڈ ہے۔" ٹونی نے اپنا  
تعارف کرایا۔ "مجھے دیکھ کر پولیس والوں کے بدن میں  
خون کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔" وہ بولا۔ "میں رات  
حوالات میں بند تھا۔ وہیں شرجیل سے ملاقات ہوئی تھی۔  
بے چارہ سندھ پریشان دکھتا تھا۔ بھوکا پیاسا تھا اور بڑی  
طرح رو رہا تھا۔" ٹونی نے تفصیل بیان کی۔ ہماری طرف  
دیکھا، گرد حالات کا جائزہ لیا پھر بات جاری رکھی۔ "آج  
میری ضمانت منظور ہوئی ہے۔ مجھے آپ کا ٹیلی فون نمبر  
شرجیل نے دیا تھا۔ میں نے ازراہ ہمدردی آپ سے  
رابطہ قائم کیا تھا۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ مجھے آپ  
لوگوں کی چتا پر تاسف ہے۔" اس نے کہا۔ اس دم وہ مجھے  
رقت کا فرشتہ دیکھنے لگا۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق کسی  
مانیا سے تھا، میں نے اس پر بھروسہ کر لیا۔ اس کے علاوہ

موجودہ ٹونی کہ میرا بیٹا گزشتہ شام سے لاپتہ تھا۔ اس کی  
گاڑی بھی عمارت میں موجود نہیں تھی۔ پیغام سن کر میرے  
اوسان خطا ہو گئے اور پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔  
"مجھے تفصیلات معلوم کر کے بتائیں۔" میں نے  
اجنبی کالر سے درخواست کی اور اپنے دل کی دسڑکن پر قابو  
پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میری بیگم بے حد پریشان ہو  
گئی۔

"علم میں آیا ہے کہ آپ کے بیٹے کو پولیس نے کل  
شام اٹھایا تھا اور اب کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا ہے۔"  
ٹونی نے ذرا دیر بعد مجھے بتایا۔

یہ کنٹھن وقت ہمت کا تقاضا کرتا تھا۔ بیگم کی کیفیت  
سے آگاہ تھا اس لئے اسے ہمراہ لیا۔ ڈرائیور کو گھر سے  
بلایا، گاڑی نکالی اور بیٹے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس  
نوع کے سفر بڑی مشکل سے کٹا کرتے ہیں۔

بیگم نے مجھے بتایا کہ شام بیٹے سے اس کی بات  
ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اپنے غلیٹ میں موجود تھا۔ کہہ رہا  
تھا کہ وہ ہا ہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بیگم اس سے اداس  
ہو چکی تھی اسے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے اصرار پر بیٹے نے  
اگلے روز گھر آنے کی ہائی بھری۔

میرا ذہن اب کڑیاں ملا رہا تھا۔ میں وقت ضائع  
نہیں کرنا چاہتا تھا، بہت سارا کام باقی تھا۔ دوران سفر  
میل فون سے استفادہ ممکن تھا۔ اسی واسطے سے چند دیگر  
تفصیلات حاصل کر لیں۔

"ہم نے کھڑکی کے راستے دیکھا۔" شرجیل کے  
ہمسائے نے مجھے بتایا۔ "کمرے میں اس کا لپ ٹاپ  
آن ہے۔ غالباً انٹرنیٹ چل رہا ہے۔ اس کے دونوں کی  
یورڈ بھی آن ہیں۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن ہیں۔  
اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ بھر کے لئے کہیں باہر جانا پڑا ہو  
گا۔" مجھے بتایا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وحید کی بڑھ کر ابتدائی گفتیں

بھی جگت میں تھے۔ ان کے ہاتھ میں تھیلا سا تھا، جو قدرے بھاری دکھتا تھا۔ مغل صاحب سے قریبی ریسٹوران میں گا ہے بگا ہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ دوستی قطعاً نہیں تھی، بس معمولی سی جان پہچان تھی۔ کہنے لگے کہ مجھے بھی ہمراہ لے جاؤ۔ اگلے چوک پر کچھ کام ہے، ضروری جانا ہے، سواری نہیں مل رہی۔ میں نے ہادل نا خواست انہیں ساتھ بٹھالیا۔

اے ٹی ایم سہولت زیادہ دور نہیں تھی۔ مغل صاحب میری کار سے اترے تو فوراً قریب کھڑی دوسری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میں بینک کی سمت چلا گیا۔ پیسے نکلا کر لوٹا تو لواح میں افراتفری مچی نظر آئی۔ مغل صاحب پولیس کے نرغے میں تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھٹا سا ہوا۔ پولیس نے چھاپا کالی کروڑا کار پر مارا تھا۔ چند لمحوں میں چمکتی بوتلیں دیکھ کر میں اور بھی حیران ہوا۔ معاملہ سمجھتے ہالانکا۔

یہ ایک کالی گاڑی سے ایک نوجوان اترتا اس نے پرس میں سے ڈیڑھ ساری رقم نکالی اور پولیس کے حوالے کر دی۔ پھر بوتلوں سمیت کار دوڑاتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ مغل صاحب کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اس دوران میں اپنی کار کے قریب لوٹ چکا تھا۔ نظر آتا منظر پر ایسا معاملہ سمجھ کر میں اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلے لمحے پولیس میری کار پر بھی حملہ آور ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری کٹش پر ہسپتال تھا اور میں گاڑی انجانہ راہوں پر چلا رہا تھا۔ سفر کتنی دیر جاری رہا، میں نہیں جانتا۔ اسی دم سے طویل مذاہب میرے اوپر جاری ہے۔ معلوم ہوا کہ چند بوتل شراب شرجیل کی گاڑی پر لائی گئی تھی مگر اس پہلو اسے قطعی یقین نہیں تھا، نہ ہی اسے احساس ہوا کہ مغل مہربان اسے ہاتھ دکھا چکے تھے۔

اگلے روز شرجیل کو ضمانت مل گئی۔ عدلیہ نے اس کی کہانی درست مان لی۔ پولیس سے سوال کیا گیا کہ آپ

شاید اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر ٹونی کی موٹر ہائیک ویرے دھیرے چل رہی تھی۔ ہماری گاڑیاں اس کے عقب میں رواں دواں تھیں۔ اس تو اتر میں ہم نے کئی راہیں روند ڈالیں، کئی لمحوں کا عذاب جھیل ڈالا۔ مسافت تھی کہ ہر موٹر پر بڑھتی نظر آتی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم آخر منزل شناس ہوئے۔ اوتھتی سڑکوں نے آخر ہمارے درد کا درماں کر دیا۔

بے شکم کی عمارت پر رات کی پرچھائیاں پھیل چکی تھیں۔ ہم بوجھل قدموں کے ساتھ عمارت کے پچھلے دروازے میں داخل ہوئے۔ بجلی کے چند تھپتھپ چھائی گہری ظلمت کے خلاف نبرد آزما نظر آتے تھے۔ میں چوکی انچارج کے دفتر کی جانب لپکا۔ ملحقہ چھوٹی سی حوالات میں میرا بیٹا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ میرا دل اچھل کر گردن میں اکٹ کیا۔ میں نے چوک کر بڑھتے قدم روک لئے۔ نیم تاریکی میں مجھے بیٹے کا سراپا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے قریب پا کر وہ رو پڑا۔

”ابو، میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ کوئی غلط کام نہیں کیا۔“ رعدی ہوئی تھکی مامی صدا شب کے سکوت میں ابھری اور دیواروں سے ٹکرا کر میرا دل پاش پاش کر گئی۔ بیٹے کو اس طرح اس مقام پر دیکھا تو میں روح تک کاہنے لگا۔

شرجیل نے داستان الم مجھے سنائی جو خوفناک تھی۔ تجزیہ کریں تو کچھ اس طرح بھائی دیتی تھی۔

”ای نے مجھے گھر آنے کو کہا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس نقد پیسے کم ہیں۔ شام گہری ہو چکی تھی، سوچا کہ قریبی اے ٹی ایم مشین سے تین ہزار روپیہ نکلوا لیتا ہوں تاکہ سفر کے دوران مشکل پیش نہ آئے۔ اندازہ تھا کہ دس منٹ میں واپس لوٹ آؤں گا۔ گاڑی پارکنگ سے نکال رہا تھا کہ مغل صاحب نظر آ گئے۔ میری طرح وہ

اسے مٹھاؤ کھا ادنیٰ۔

دو سپاہیوں نے میری نیگم کا تھیراؤ کر لیا۔ ہم نے آپ کے شہزادے کو جھکائی نہیں اٹھایا۔ وہ جھک کر ہم سے ہٹ کر یاں پہنارہ۔ یہ تو اس کا بیٹا تھا خراب ہوتا اور ہاں، ہم نے اسے عزت دی۔ میں وہ انجی نہیں۔ دو بیک ڈان ہو کر پورے۔

نیگم نے انہیں بساطت پر جا کر ادا کر دیا۔

اب گاڑی واپس لینے کا مرحلہ درپیش تھا۔ ایک سپاہی ہاتھ میں ڈنیل پائنا اٹھائے دارو ہوا، بولا "صاحب! پولیس کے پاس آئی ہوئی گاڑی بھی سالم نہیں ملتی۔ اب کھوکھا سا دیکھتے ہوئے واپس لے جاتے ہیں۔ ہم نے آپ کی گاڑی چلائی ضرور ہے مگر صحیح سالم واپس کر رہے ہیں۔" میں نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور کچھ پیسے دے دیے۔

چوکی انچارج اسے اس آئی جوان اصرار تھا۔ تعاون پر آمادہ نظر آیا، اس نے کسی بھی فرمائش سے اجتناب برتا بلکہ میرے بیٹے کو نصائح کرتا رہا اور احترام ہمیں گیٹ پر آ کر خدہ حافظہ کیا۔

ہم واپسی کا سفر شروع کرنے والے تھے کہ چوکی کا سب انچارج سرعت سے رداں دوبارہ ہمارے پاس چلا آیا۔ اس نے ہمیں شرجیل کا پرس واپس کیا۔ پرس میں تمام کارڈ موجود تھے، درست حالت میں۔ نقدی البتہ ہرن ہو چکی تھی۔ اس نے ہمیں شرجیل کا سیل فون بھی واپس کیا مگر اس دم میرا ڈالٹی پرس پیسوں سے خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا جیتی پرس اسے دے دیا۔

پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے معاشرے کو ایسا ظالم پولیس مل جاتی تو کم از کم نصف معاشرتی برائیاں ختم ہو چکی ہوتیں۔



بڑے فکر چھوٹوں پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ مثل حضرت نے اعتراض جرم کر لیا۔ شرجیل کی رہائی پر پولیس چوکی میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب میں محاذ نظام وطن کے بارے میں اصل موضوع کی طرف لوٹا ہوں۔

بیٹے کی جان خلاصی ہوئی تو سب سے پہلے میرے پاس ایک کھڑا سا پولیس من آیا جسے کبڑا عاشق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا احسان کچھ اس طرح تھا۔

"سرا میں نے حوالات میں بند شہزادے کو رات تین بجے پیشاب کروایا ہے، جب بھی اس نے کہا۔ میں اسے ٹائلٹ لے گیا۔ سوچیں، اگر میں یہ نہ کرتا تو آپ کے سا جہز اسے کا کیا حشر ہو سکتا تھا؟"

مجھے اس کی بات معقول لگی یا نامعقول، میں نے مٹھائی کے لئے پیسے اسے دے دیے۔ اس نے مجھے سیوٹ کیا اور دعا میں دیتا ہوا چلا گیا۔ چند تاکیدیں بھی کیں۔

"ابو! آپ جو ڈھیر سا کھانا رات میرے لئے چھوڑ گئے تھے، وہ اسی شخص نے کھا یا تھا۔ اس دوران مجھے یہی کہتا رہا کہ میں کھانا چیک کر رہا ہوں کہ کہیں زہریلا تو نہیں۔ ابو یہ تین بڑی بوتلیں مشروب کی بھی ایک ہی سائلس میں پی گیا تھا۔" شرجیل نے مجھے بتایا، میں قطعاً حیران نہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد چوکی کا سب انچارج میرے قریب آیا کہنے لگا۔ "آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بچے کو رہائی ہمارے بنانے ہوئے کاغذات کی بدولت ملی ہے۔ کاغذ بنانے والے کا ہزار روپیہ "مقرر" ہے۔ اگر آپ نے وہ نہ دیا تو اس غریب کا دل خراب ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔ ہم آپ سے رشوت نہیں مانگ سکتے۔" اس نے کہا اور کبھی ملی بن گیا۔

میں نے رقم ادا کر دی۔ "اور میری مٹھائی؟" اب بلا کی بے شری اس کے چہرے پر ناج رہی تھی۔ میں نے



## دینی و تاریخی مغالطے اور ان کی حقیقت

ہمارے معاشرے میں ایسی بہت سی باتیں اور تصورات رائج ہو چکے ہیں جو کہ سرے سے غلط ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بعض غیر محترمت میں درج ہیں اور غیر محققین علماء و محققین اور اساتذہ انہیں بغیر سوچے سمجھے بیان کر دیتے ہیں۔

☆ ..... مجاہد ادیب شیخ

ذیل میں ہم کچھ ایسی مشہور باتیں اور ان کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مشہور ہے کہ "سیدنا عبداللہ بن جش" جو اپنی بیوی ام حبیبہ بنت ابوسفیان کے ہمراہ رسول اللہ کے غم سے حبشہ ہجرت کر گئے تھے وہاں جا کر عیسائی ہو گئے اور اسی حال میں مر گئے تو نجاشی نے ان کی بیوہ کا نکاح رسول کریم سے کرادیا۔ اس سلسلے میں مختلف دینی کتب میں جتنی بھی روایات پائی جاتی ہیں ان میں والقدی جیسا ناقابل اعتبار راوی موجود ہے جو کہ علماء محدثین و محققین کے نزدیک جھوٹا، روایتیں گھڑنے والا، احادیث میں ہیر پھیر کرنے والا اور متروک الحدیث تھا (تاریخ کبیر 1: 176، تاریخ اوسط 2: 220، تاریخ صغیر 2: 263، بخاری ترجمہ 3: 334، المغنی والحر وکین، نسائی ترجمہ: 334، العلل و معرفۃ الرجال 3: 264، فقرہ 5166، الجرح و تعدیل 8: 21، سیر الاعلام النبلاء 9: 462، 463، 469، سیرت النبی 1: 27) حافظ ذہبی نے اس کہانی کو منکر کہا ہے (سیر الاعلام النبلاء 2: 221) بعض مؤرخین نے اس روایت کو عروہ بن زہیر کی سند سے بیان کیا ہے جن کی پیدائش سیدنا عمر فاروق کے دور کے اوائل میں ہوئی تقریباً 23 ہجری کے لگ بھگ وہ

اس سے آگے اوپر کا سلسلہ بیان نہیں کرتے اس لئے یہ روایت منقطع ہے اس لئے ناقابل اعتبار ہے۔ لہذا ایک کذاب راوی اور منقطع روایات کی بنیاد پر کسی صحابی کو مرتد قرار نہیں دیا جاسکتا چاہے اسے کسی نے بھی نقل کیا ہو اس سلسلے میں ایک صحیح روایت موجود ہے جسے محدثین نے امام ابن مبارک، از معمر، از زہری، از عروہ، از سیدہ ام حبیبہ کی سند سے نقل کیا جو حدیث کے معیارات کے مطابق کھری ہے کہ "سیدہ ام حبیبہ سیدنا عبداللہ بن جش کی مشکوٰۃ تھیں جو نجاشی کے ملک میں وفات پا گئے اور سیدہ حبشہ میں ہی تھیں کہ ان کا نکاح نجاشی نے رسول اللہ سے کر دیا ان کا مہر چار ہزار درہم نجاشی نے ہی ادا کیا پھر انہیں شرجیل بن حسنہ کی ہمراہی میں مدینہ منورہ بھیج دیا۔" (سنن ابی داؤد احادیث 2086، 21076، 2108۔ سنن نسائی حدیث 3350۔ دلائل النبوة۔ بیہقی 2: 460) اس صحیح حدیث میں ان کے وفات پا جانے کا ذکر تو موجود ہے مگر ان کے عیسائی ہونے کا کوئی ذکر نہیں یقیناً یہ افسانہ دشمنان اسلام کا گھڑا ہوا ہے اس لئے اس پر یقین کرتے اور بیان کرتے ہوئے مذکورہ حقائق کو مد نظر رکھنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اس کی زد کہاں پڑتی ہے؟ کیا ہمارے نبی کی تربیت معاذ اللہ اتنی ہی ناقص تھی کہ پہلی ہجرت حبشہ کی

سعادت حاصل کرنے والے جلیل القدر صحابی ہی مرتد ہو گئے۔

مشہور ہے کہ غزوہ احد میں نبی کریم نے جن تیر اندازوں کو پہاڑی درے پر مقرر کر کے وہاں سے کسی حال میں نہ ہٹنے کا حکم دیا تھا اکثر مال غنیمت اکٹھا کرنے کے لالچ میں درے سے اتر آئے اور ان کے اس عمل کا لشکر اسلام کو ناقابل حلائی نقصان ہوا۔ اس میں ایک درست واقعے کو قلعہ انداز دیا گیا ہے ہوا یوں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو جلد ہی مسلمانوں کا پلہ ابھاری ہو گیا اور کفار کا جرمولی کی طرح کٹنے لگے تو وہ میدان جنگ سے بھاگنے لگے اور پہاڑی لشکر اسلام کی پشت پر تھا جس میں موجود درے پر نبی کریم نے عبداللہ بن جبریل کی قیادت میں پچاس تیر اندازوں کو مقرر کیا تھا تاکہ دشمن پشت سے حملہ نہ کر سکے۔ دشمن نے اس کی کوشش بھی کی مگر تیر اندازوں کی وجہ سے ناکام ہو گئے حتیٰ کہ کفار کو شکست ہو گئی تو کچھ مسلمان ان کے تعاقب میں نکل گئے اور باقی مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے اس وقت درے پر متعین اکثر تیر اندازوں نے سمجھا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے لہذا انہوں نے بھی جوش و خروش میں مال غنیمت اکٹھا کرنے کا سوچا لیکن جب وہ درہ چھوڑنے لگے تو عبداللہ بن جبریل نے ان کو روکا مگر دس کے سوا باقی اتنے جوش و خروش میں تھے کہ وہ نہ رکنے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے کے لئے درے سے اتر آئے۔

یہ دیکھ کر کفار کے دلچسپ جاتے ہوئے لشکر میں خالد بن ولید (جو کہ نہایت بہادر جنگجو تھے اور ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے) نے ساتھیوں کے ہمراہ درے کی جانب سے لشکر اسلام پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں عبداللہ بن جبریل اور ان کے تیر انداز ساتھی سب سے پہلے شہید ہوئے اور پھر انہوں نے نبی کریم پر حملہ کر دیا تو جلیل القدر صحابہ ان کے سامنے ڈھال بن کر شہید ہو گئے۔ خود نبی کریم بھی

زخمی ہو گئے۔ جب کفار کے تعاقب میں جانے والے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے والے مجاہدین کو اس حملے کا علم ہوا تو وہ ہلے اور کفار کو بھاگایا لیکن جب تک لشکر اسلام کا ناقابل حلائی نقصان ہو چکا تھا۔ یہ سب واقعات تیر اندازوں کی غلطی سے ہوا لیکن اس کی وجہ مال کی ہوس ہرگز نہ تھی بلکہ یہ غلط فہمی تھی کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور دوسری وجہ مال غنیمت اکٹھا کرنے کا جوش و خروش تھا اس میں بھی لالچ کا کوئی عنصر نہیں کیونکہ اسلام میں مال غنیمت جمع کرنے والے کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا تھا اور مسلمان اسے لوٹنے نہیں بلکہ اکٹھا کرتے تھے اور اکٹھا کر کے امیر لشکر کے حوالے کر دیتے تھے جو کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ الگ کر کے اسلامی حکومت کی بیت المال کے لئے وارا حکومت روانہ کر دیتے جسے امور مملکت اور قلاع عامہ پر خرچ کیا جاتا۔ باقی چار حصے مجاہدین میں ان کی کارکردگی اور ذمہ داری کو مد نظر رکھ کر تقسیم کر دیے جاتے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ مال غنیمت اکٹھا کرنے میں ہوس کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ صحابہ مال غنیمت کے لئے نہیں بلکہ اللہ و رسول کی خوشنودی کے لئے لڑتے تھے۔ اس معاملے میں مال غنیمت اکٹھا کرنے میں صحابہ کا جوش و جذبہ ظاہر ہوتا ہے جو کفار پر فتح کے باعث سامنے آیا اور وہ اطاعت امیر کے تقاضے فراموش کر بیٹھے غلطی تو ان سے ہوئی کہ وہ فرشتے تھے نہ نبی کی طرح مصوم وہ اپنی غلطی پر نادم ہوئے تو نبی کریم نے ان کی خطا معاف کر دی اور مال غنیمت سے حصہ بھی دیا اور ان میں اولین مجاہدین و انصار اور بدری صحابہ بھی شامل تھے جن کو جنگ بدر میں حصہ لینے کی وجہ سے خوش خبری دی گئی تھی کہ آج کے بعد اگر وہ گناہ بھی کریں گے تو لکھا نہ جائے گا ایسی ہستیوں کے لئے مال غنیمت کے لالچ، ہوس یا لوث کے الفاظ کا استعمال بہت بڑی گستاخی ہے۔

مشہور ہے کہ عزیز مصر کی وفات کے بعد اللہ نے

مشہور ہے کہ جس مکان میں آیت الکرسی پڑھی جاتی ہے شیطین میں دن تک کے لئے اس مکان سے بھاگ جاتے ہیں اور چالیس راتوں تک چاد نہیں ہو سکتا اور آیت الکرسی شفاعت کرے گی۔ جو آدمی جمعہ کے دن سورۃ آل عمران پڑھتا ہے تو اللہ اور اس کے فرشتے غروب آفتاب تک اس پر رحمتیں بھیجتے رہتے ہیں اور جو آدمی ہر رات سورۃ واقعہ پڑھتا ہے اسے بھی فائدہ لاحق نہیں ہوتا نہ اسے قائلین میں لکھا جاتا ہے اور جو آدمی دو سو سورۃ اخلاص پڑھتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ لڑھ ہزار نیکیاں عطا کرتے ہیں اور جو آدمی قرآن پڑھتا ہے تو اسے دو سو دینار ملیں گے اگر دنیا میں نہ ملے تو آخرت میں ضرور ملیں گے اور جو آدمی جمعہ کے دن نماز عصر کے بعد 80 مرتبہ ایک مخصوص درود پڑھے گا اس کے اسی سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور 80 سال کی عبادت کا ثواب اس کے لئے لکھا جائے گا۔ محققین کے نزدیک یہ

زیلغا کو پھر سے جوان اور پاکہ کر دیا اور اس کا نکاح یوسف علیہ السلام سے ہوا۔ محققین کے مطابق یہ قصہ کو لوگوں کی باتیں ہیں ان کی کوئی بنیاد نہیں اور محدثین کے نزدیک یہ قطعاً قابل اعتبار نہیں (روح المعانی صفحہ 5 جلد 3)۔

مشہور ہے کہ زمین پر وہ نبی زندہ ہیں۔ حضرت اور الہام جن میں سے الہام جنگوں میں بانوں میں اور حضرت پانیوں پر بھولے جنگوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ بعض اسرائیلی روایات میں اس کا ذکر ہے جو بعض مفسرین نے بھی درج کر دی ہیں لیکن علماء محققین کے مطابق حیات الہام میں کوئی حقیقت نہیں (روح المعانی صفحہ 139 جلد 23) اور حضرت تو پیغمبر نہیں بلکہ فرشتے تھے جو اللہ کے حکم سے موسیٰ کو کچھ باتوں کی تعلیم دینے آئے تھے اور اس کے بعد وہ واپس آسمان پر چلے گئے۔ اب وہ زمین پر کہیں موجود نہیں (تفسیر القرآن)۔

ISO 9001:2008

رجسٹرڈ

النور

النور لیکچرک انڈسٹریز B-75، سال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات

053-3530447 0300-9702203 0345-6333393

http://www.alnoortans.com

ساتھ لے کر وہاں پہنچے اور ان کو سمجھایا کہ امیر ایک ہی ہو سکتا ہے ورنہ اختلاف پیدا ہو جائے گا اور امیر رسول اللہ کے حکم کے مطابق قریش (مہاجرین) میں سے ہو گا اور قریش میں امارت کے سب سے بڑھ کر اہل صدیق اکبر ہیں جو کہ نبی اکرم کے یارِ عار، علم و عمل اور حیثیت میں ممتاز، افضل الصحابہ نبی کریم کے سرِ اسلام کے لئے سب سے بڑھ کر قربانیاں دینے والے مدبر اور منظم ہیں اور پھر نبی کریم اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں انہیں اپنے مصلے پر کھڑا کر کے اور خود ان کے پیچھے نماز ادا کر کے ہمیں اشارہ دے گئے ہیں کہ ان کے خلیفہ اور ہمارے آئندہ امیر وہی ہوں گے۔

یہ کہہ کر انہوں نے سیدنا صدیق اکبر کی بیعت کر لی دیگر صحابہ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے برضا و رغبت فوراً آگے بڑھ کر بیعت کر لی یہ خاص صحابہ کی بیعت تھیں عام بیعت کا سلسلہ اس کے بعد بھی کئی دن جاری رہا۔ اگر کسی نے بیعت نہیں بھی کی تو اس نے خاموشی اختیار کر لی اجماع صحابہ کا احترام کیا اور اختلاف پیدا نہیں کیا۔ حالات نے ثابت کیا کہ ان کا انتخاب نہایت درست اور بر محل تھا۔

انہوں نے اپنے مختصر دور میں کئی خطرناک فتنوں کی سرکوبی کی اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے مسلمانوں کو دین پر ثابت قدم رکھنے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ پہلا مسئلہ تو وفاتِ نبویؐ پر ہی پیدا ہو گیا تھا جب سیدنا عمر فاروقؓ یہ خبر سن کر فرطِ غم سے ہوش کھو بیٹھے اور ننگی تلوار لے کر گھر سے نکل آئے کہ جس نے کہا نبی کریمؐ فوت ہو گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ صدیق اکبرؓ کو ان کی اس کیفیت کا علم ہوا تو انہوں نے آکر مسجد نبویؐ میں ننگی تلوار لے کر گھومتے سیدنا عمر فاروقؓ کو سختی سے نیچے بٹھا کر یہ مختصر سا خطبہ دے کر حقیقتِ حال واضح کی کہ لوگو! تم میں سے جو کوئی محمدؐ کی عادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ فوت ہو گئے اور جو اللہ کی

تمام اور ایسی سب روایات سن گزرت ہیں سلسلہ الاحادیث الضعیفہ صفحہ 412 جلد 2، صفحہ 305 جلد 1، صفحہ 314 جلد 1، صفحہ 101 جلد 2، صفحہ 138 جلد 2۔ اور یہ روایت بھی موضوع ہے کہ جب کسی قوم کا بچہ سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سنتے ہی چالیس سال تک اس قوم سے عذاب اٹھا لیتے ہیں (الاسرائیلیات والموضوعات صفحہ 144) دراصل کچھ لوگوں نے عوام کو قرآن کی طرف مائل کرنے کے لئے اس قسم کی روایات گھڑیں (الاتقان صفحہ 341 جلد 2) اور ان میں سے کچھ مقصد عوام کو قرآن کی تفہیم سے ہٹا کر محض پڑھنے پر لگا کر دراصل قرآن سے دور کرنا تھا (مذہبی داستانیں از علامہ حبیب الرحمن کابڑھلوی، تفسیری افسانے از عبدالرؤف میاں لوی، انبیائے عظام اور صحابہ کرام پر اعتراضات کا علمی جائزہ از ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف)۔

مشہور ہے کہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد صحابہ میں خلافت کے لئے اختلاف پیدا ہو گیا اور بعد میں صحابہ کے درمیان اقتدار کے لئے جنگیں بھی ہوئیں۔ تو اتنی بات تو درست ہے کہ وفاتِ نبویؐ کے بعد صحابہ میں وقتی اختلاف رائے تو ہوا اور بہت بعد میں ان میں جنگیں بھی ہوئیں مگر ان کی وجہ اقتدار نہیں بلکہ کچھ اور تھی۔ دراصل ہوا یہ کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد صحابہ نے فوری طور پر امیر مقرر کرنا چاہا کیونکہ نبی کریمؐ کا یہ حکم ان کے پیش نظر تھا کہ جماعت کو ایک لمحے کے لئے بھی بغیر امیر کے چھوڑا نہیں جاسکتا کیونکہ تجزیہ و تشخیص تدفین وغیرہ بھی امیر ہی کی ذمہ داری تھی لہذا نبی ساعدہ کے محلے میں مہاجرین و انصار کی ایک جماعت اس مقصد کے لئے اکٹھی ہوئی جس میں یہ تجویز سامنے آئی کہ مہاجرین و انصار دونوں میں سے ایک ایک امیر مقرر کر لیا جائے تاکہ دونوں جماعتیں مطمئن رہیں۔ جب یہ خبر سیدنا عمر فاروقؓ کو ملی تو وہ سیدنا صدیق اکبرؓ کو

کے باعث پسند کیا۔ چند ایک صحابہؓ نے ان کی طبیعت کی سختی کی وجہ سے تحفظات ظاہر کئے تو سیدنا صدیق اکبرؓ نے فرمایا۔ لوگو! میں تم میں سے سب سے بہتر آدمی کو منتخب کر رہا ہوں، ان کی سختی کی وجہ میری نرم مزاجی تھی۔ جب خلافت کی ذمہ داری کا بوجھ ان پر پڑے گا تو وہ مسلمانوں کے معاملات میں نرم ہو جائیں گے۔ اور یہی ہوا آج تک تاریخ ان کے طرز حکمرانی، انتظام اور اداروں کی تشکیل کی مثال پیش نہیں کر سکی، نہ کر سکے گی۔ ان کے دور میں بڑی بڑی اسلام دشمن سپر طاقتیں روم، ایران اور مصر سرنگوں ہو گئیں اور ان کے دور میں کوئی فتنہ سر نہیں اٹھا سکا تو ان فتوحات کا بدلہ لینے اور آئندہ فتوحات سے مدد کرنے کے لئے یہودی، مجوسی اور عیسائی راہنماؤں نے سازش کر کے نماز فجر میں ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ شہادت سے قبل سیدنا عمر فاروقؓ نے جو جلیل القدر صحابہؓ کی کئی ہادی کہ اپنے میں سے ایک لرد کو خلیفہ منتخب کر لینا جنہوں نے باہم مشورے اور عام مسلمانوں کی رائے سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا جس پر کسی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ (صحیح مسلم باب اختلاف، الرضی الختم)

سیدنا عثمان غنی عمر فاروقؓ کے برعکس نرم طبیعت کے مالک تھے اور سزا کی بجائے معافی اور درگزر کو پسند کرتے تھے اور ان کی اس نرمی کا فائدہ دشمنان اسلام نے اٹھایا جو مفتوح ہونے کے بعد بدلے کی آگ میں جل رہے تھے اور منافقانہ طور پر مسلمان ہو کر سازشوں کے ذریعے اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ مسلمانوں کی قوت و شوکت کا راز ان کے اتحاد و ایمان میں ہی مضمر تھا اور عمر فاروقؓ کی شہادت کے باوجود دشمنوں کی توقع کے مطابق مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ رکا نہ تھا اور اسلامی سلطنت روز بروز وسیع ہو رہی تھی اور کفر کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ لہذا عثمان غنیؓ کے

مہادت کرتا تھا وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے۔ پھر انہوں نے سورۃ آل عمران کی آیت 144 کی تلاوت کی کہ "محمد تو ایک پیغمبر ہیں وہ اگر فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم دین سے الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے"۔

یہ سن کر تمام صحابہ اور عمر فاروقؓ اس کیفیت سے نکل آئے اور ان کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ انسانی فطرت میں یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے پیاروں کی موت کو تسلیم نہیں کرتی جب ہستی اتنی عظیم ہو اور اس سے محبت بھی بے انتہا ہو تو یہ کمزوری خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے حسن تدبیر کا ہی نتیجہ تھا کہ اس مسئلے کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دیا پھر لشکر اسامہؓ کو روانہ کرنے کا فیصلہ جس کا حکم نبی کریمؐ نے آخری دنوں میں دیا تھا حالانکہ وفات نبویؐ کے سانچے اور اسلامؐ کی کم عمری کے باعث عمر فاروقؓ جیسے جرأت مند صحابی بھی اس لشکر کی نوری روانگی کے حق میں نہ تھے لیکن صدیق اکبرؓ نے لشکر روانہ کیا اور لشکر فتح یاب ہوا پھر انھیں رکوع سے جگہ کا دلیرانہ فیصلہ حالانکہ عام صحابی بھی اس کے حق میں نہ تھے کہ لوگ اتنی سختی سے اسلام سے خطر نہ ہو جائیں لیکن صدیق اکبرؓ نے اسلام کے ایک ہادی رکن اور حکم کو معطل کرنے کی بجائے اس کے ہانیوں کی سرکوبی کو ضروری سمجھا تا کہ آئندہ کوئی اسلام کے ہادی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے پھر نبوت کے جھوٹے دعوے داروں سے جگہ میں بھی انہوں نے کوئی کمزوری نہ دکھائی حالانکہ یہ تمام نفعی بیک وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور ریاست کی صورت حال نئی کریمؐ کے بعد بے حد ناگزیر تھی۔ پھر ان کی درویشانہ زندگی انہوں نے ہر لحاظ سے خود کو اس انتخاب کا اہل ثابت کیا۔

پھر جب وہ مرضی وفات میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے سیدنا عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جسے عام صحابہؓ نے تو ان کی جرأت مندی، بہادری اور قائمانہ صلاحیتوں

تھے کیونکہ اکثر صحابہ بیعت رضوان میں شہادت عثمان کے بدلے کی بیعت کر چکے تھے چونکہ اس وقت عثمان شہید نہ ہوئے تھے اس لئے سبھی نے سمجھا کہ وہ بیعت اس وقت کے لئے تھی لیکن قاتلان عثمان رکاوٹ بنے ہوئے تھے لہذا مسلمانوں کے درمیان حمل اور صلہ کی جنگیں ہوئیں اور بے شمار مسلمان شہید ہوئے لیکن یہ جنگیں قصاص عثمان کے لئے ہوئیں نہ کہ حکومت کے لئے جیسا کہ عموماً مخالفہ دیا جاتا ہے جنگوں کے باوجود قصاص کا مسئلہ حل نہ ہوا اور مسلمان دشمنوں کی خواہش کے مطابق دو گروہوں (شیعہ اور سنی) میں تقسیم ہو گئے۔ (تاریخ طبری، تاریخ ابن خلدون، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، الریحی الختم)

یہ جنگیں انہی منافقین نے بھڑکانیں مسلمان تو صلح کرنا چاہتے تھے مگر رات ہوتے ہی منافقین دو گروہ ہو کر دونوں لشکروں میں گھس کر تیر اندازی، آتش زنی اور قتل و غارت شروع کر کے جنگ کی آگ دوبارہ بھڑکا دیتے تھے تاکہ وہ پکڑ نہ جائیں اور مسلمان لڑکر کمزور ہو جائیں اور ان کی فتوحات رک جائیں اور ان کا بدلہ پورا ہو جائے۔ یہ یقیناً مسلمانوں کا مخالف گروہ ہی تھا اور مسلمانوں میں ہی شامل تھا۔ اسی گروہ نے سیدنا عثمان بن یاسر کو بھی شہید کیا۔ سیدنا علیؓ جنگ کے باوجود سیدنا امیر معاویہؓ کے گروہ کو مسلمان ہی سمجھتے تھے اس کا ثبوت جنگ بندی کے بعد بھیجے جانے والے ششٹی مراسلے کی یہ عبارت ہے۔

”اور ہمارے معاملے کی ابتدا ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک ہی ایک دعوت اسلام ایک اللہ پر ایمان رکھنے میں اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کرنے میں نہ ہم ان سے زیادہ ندوہ ہم سے زیادہ بس صرف خون عثمان کے معاملے میں ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا حالانکہ ہم اس سے بری تھے“ (بخاری، ج 2، ص 159)

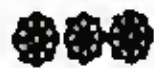
خلاف ایک خلیفہ محال بنایا گیا جس نے ہر وہ بیگنہ و ہم کے ذریعے سیدنا عثمانؓ کی اعمال اور حکومتی ذمہ داریوں پر الزام تراشیاں کیں۔ جب یہ بات سید عثمانؓ تک پہنچی تو انہوں نے تحقیقات کرائیں لیکن حقیقت کچھ بھی نہ نکل۔ اپنا منصوبہ ناکام ہوتے دیکھ ان باغی منافقین نے عین اس وقت سیدنا عثمانؓ کی گھر کا محاصرہ کر لیا جب زیادہ تر مسلمان حج کو گئے ہوئے تھے۔ مدینہ میں جو صحابہ اور فوج موجود تھی انہوں نے عثمانؓ سے ان کے خلاف کارروائی کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اپنی ذات کے لئے خون بہانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ باغیوں کا مطالبہ تھا کہ سیدنا عثمانؓ حکومت چھوڑ دیں لیکن عثمانؓ نے جمیع صحابہ کے اجماع سے سپرد کی گئی امانت کو چند باغی منافقین کے کہنے پر چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ اس سے عظیم فتنے پیدا ہونے اور مسلم سلطنت کی جانی کا شدید خطرہ تھا وہ ان کے اصلی عزائم کو بھانپ چکے تھے کیونکہ ان کی ڈوریں یہودیوں اور مجوسیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ لہذا ان کو چالیس روز محاصرے میں بھوکا پیاسا رکھ کر عین اس حال میں شہید کر دیا گیا جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ پھر ان باغیوں نے مسلمانوں کے عتاب اور مزاسے نہچنے کے لئے سیدنا علیؓ کو زبردستی خلیفہ بنادیا اور بڑے دشمنان ان کے لئے بیعت لینا شروع کر دی۔

زیادہ تر صحابہ نے قاتلان عثمانؓ سے قصاص لینے سے قبل بیعت سے انکار کر دیا جو کہ عملاً سیدنا علیؓ کے لئے ممکن ہی نہ تھا کیونکہ وہی باغی اور قاتل تو اصل حکمران تھے۔ سیدنا علیؓ کو تو انہوں نے ایک طرح سے برہنہ کر دیا تھا۔ انہوں نے بیعت کر کے ہاتھ مضبوط کرنے کو کہا اور وقت مانگا تاکہ وہ قصاص لے سکیں یوں قصاص عثمانؓ کے معاملے پر مسلمانوں میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ سیدنا علیؓ سمیت تمام صحابہ قصاص عثمانؓ لینا واجب سمجھتے

ایسی خلاف حقیقت باتیں درج ہیں ان کی قرآن و حدیث کے سامنے کوئی حیثیت نہیں قرآن تو لاریب ہے جبکہ حدیث کی چھان بھنگ بھی کی گئی ہے اور اس کی صحت کے لئے روایت، جرح و تعدیل اور اسناد الرجال جیسے علوم سے کام لیا جاتا ہے مگر بھی خلاف قرآن روایت کی تاویل قرآن کے مطابق کی جاتی ہے یا رد کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں ایسی کوئی کسوٹی یا جانچ پرکھ نہیں مگر یہ بہت بعد میں لکھی گئیں ان کی بنیاد پر کسی مقدس ہستی کے خلاف الزام تراشی کو قطعاً تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تاریخ میں سچ جھوٹ کس سے اس لئے اس پر کسی عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی گو این خندون اور محمد قاسم لڑشت نے تاریخی روایات کی تشخیص سائنسی بنیادوں پر کی ہے مگر ان کی کوشش کو بھی آغاز کہا جاسکتا ہے عمل نہیں۔

انہی تاریخیوں کی بنیاد پر یہ مشہور ہے کہ سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دور میں اقرباء پروری شروع کر دی تھی اور اپنے عزیزوں کو بڑے بڑے عہدے دے دیئے حالانکہ وہ اپنے عزیزوں کی بددعا اپنے ذاتی مال سے کرتے تھے نہ کہ بیت المال سے اور یہ ان کا خلافت سے پہلے کا معمول تھا۔ اسی لئے تو غنی کہلائے تھے اور عزیزوں کو عہدے انہوں نے نہیں بلکہ زیادہ تر کو عمر فاروقؓ نے اہلیت کی بنیاد پر دیئے اور وہ ان کے خاندان سے ہرگز نہ تھے۔ تاریخ امیر معاویہؓ پر الزام لگاتی ہے کہ انہوں نے بیت المال کو ذاتی مال بنا لیا مگر کوئی مستند شہادت اس پر نہیں ملتی۔ دوسرا بڑا الزام ان پر یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے موروثی خلافت کی بنیاد رکھی تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ باپ کے بعد بیٹے کی خلافت کا آغاز سیدنا علیؓ کے بعد سیدنا حسنؓ کی خلافت سے ہوا۔

(تاریخ اسلام احمد حریری)



یہ مراسلہ جنگ جمل وصفین کے بعد سیدنا علیؓ نے اپنی طرف سے تمام شہروں میں بھجوا یا تھا دونوں طرف کے مقتولین کو انہوں نے شہید کہا اور ان کا اکٹھا جنازہ پڑھایا۔ صحابہ کی پیش قدمی قصاص عثمانؓ کے لئے تھی مگر قاتلوں نے اپنے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا حالانکہ مسلمان آپس میں کوئی جنگ نہ کرنا چاہتے تھے اس لئے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق کچھ صحابہ اگر دونوں گروہوں میں شامل ہو کر جنگ میں شامل ہوئے تو کافی صحابہ غیر جاہلدار بھی رہے، بیعت کی جنگ میں نہ شامل ہوئے کیونکہ وہ انجمن میں پڑ گئے کہ کس طرف جائیں کیونکہ دونوں طرف جلیل القدر صحابہ تھے اور ہمیں ان کے کارناموں اور قرآن و حدیث میں دی گئی ان کو جنت کی بشارتوں کے باعث ان سب کے بارے میں ٹیک بگمان رکھنا چاہئے اور ان کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اپنی اوقات کو ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ان کے بعض میں اپنے اعمال ضائع کر بیٹھیں اور اللہ اور رسول کو ناراض کر بیٹھیں۔

مشہور ہے کہ سیدنا امیر معاویہؓ نے سیدنا حسنؓ اور سیدہ عائشہؓ کو شہید کرایا۔ یہ انتہائی خلاف حقیقت الزامات ہیں جن پر کوئی احمق اور عقل کا اندھا ہی یقین کر سکتا ہے کیونکہ جب سیدنا حسنؓ خود ہی امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے اور بخوشی ان کی بیعت کر لی تھی تو پھر انہیں ان کو قتل کرا کے اپنی ساکھ خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی اور سیدہ عائشہؓ تو جنگ جمل کے بعد سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو چکی تھیں اور امیر معاویہؓ سے ان کی کسی قسم کی کوئی رہنمائی نہ تھی بلکہ سیدنا امیر معاویہؓ کے دور میں وہی مقام حاصل تھا جو خلفائے ثلاثہ کے دور میں تھا اور مستند روایات سے ثابت ہے کہ دونوں کی وفات قطعاً طبعی تھی نہ کہ حادثاتی۔

جہاں تک ایسی تاریخی روایات کا تعلق ہے جن میں

# ہیر و گھنگنی نہیں مرے

☆ -----farrukhahahbaz03@gmail.com ----- فرخ شہباز وڑائچ

روکنے کی کوشش کی۔ اس 15 سالہ بہادر بچے کا شک منجھ  
کھلا مٹھوک نوجوان خود کش بمبار تھا، اس نے جب محسوس  
کیا کہ یہ بہادر بچہ اس کے ناپاک عزائم کو کسی صورت  
کا مہیا نہیں ہونے دے گا تو خود کش بمبار نے اپنے  
آپ کو دھماکے سے اڑالیا۔ اس کے ساتھ ہی بہادر اعتراف  
کے بی پرچے اڑ گئے۔ خود کش بمبار کا مارگٹ سکول اسمبلی  
تھا جس میں ہزار کے لگ بھگ بچے شریک تھے۔ یہ بہادر  
بچہ اپنی ماں کو رلا کر سینکڑوں ماؤں کو رلانے سے بچا گیا۔  
چند روز سالہ اس بچے نے اپنی عمر سے بہت بڑا کام کر دکھایا،  
شجاعت کی ایسی لازوال مثال قائم کی کہ رہتی دنیا اس پر  
غور کرے گی۔

عظیم معلمہ

25 مئی 2013ء کو گجرات کے گاؤں کوٹ لکھ  
روڈ پر منج جٹاچ پرائیوٹ پبلک سکول منگوال کے 24  
بچوں کو اور خاتون لیچر کو عرفان نامی ڈرائیور دین پر سکول  
لا رہا تھا کہ اچانک دین سے آگ اور دھواں اٹھنے لگا اور  
اس کے ساتھ ہی دل دہلا دینے والی چیخوں سے فضاء  
گوشتی ہو گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ اتنی بھڑکی کہ  
17 منٹوں میں کلیاں آگ میں جل گئیں۔ شعلے برساتی آگ  
جب بچوں کو جلا کر مار کر رہی تھی تو دین ڈرائیور نے اپنی  
جان بچانے میں عافیت جانی جبکہ دوسری طرف خاتون

بہادر لڑکا

6 جنوری 2014ء کی صبح کا واقعہ ہے، خیر  
پختونخواہ کے ضلع ہنگو میں گورنمنٹ ہائی سکول ابراہیم زئی  
میں بچے معمول کے مطابق سکول جا رہے تھے۔ انہی  
بچوں میں اعتراف حسن بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ علم  
حاصل کرنے کی تمنا لیے سکول کی طرف روانہ ہوئے  
تھا۔ یہ علاقہ پسماندہ علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کسی  
بڑے شہر کے سکول کی طرح یہ سکول بھی آسائش و  
سہولیات سے محروم نہیں ہے۔ اس دوران اعتراف نے  
ایک انجینی نوجوان کو دیکھا جس نے اسی کے سکول کی  
یوٹیلٹام پہن رکھی تھی، سکول جانے والے بچوں سے  
قریب واقع سکول کا پتہ دریافت کر رہا تھا۔ اعتراف نے  
اس انجینی نوجوان کو مخاطب کر کے کہا آپ تو ہمارے سکول  
کے طالب علم نہیں، جس پر اس مٹھوک نوجوان نے جواب  
دیا وہ اسی سکول کا طالب علم ہے۔

اب وہ مٹھوک نوجوان تیزی سے سکول کی طرف  
بڑھنے لگا تھا، اعتراف کے دوستوں نے اسے خبردار کیا کہ  
یہ خود کش بمبار بھی ہو سکتا ہے تم پیچھے ہٹو، لیکن اس نے  
جواب دیا آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں میں اس کو قابو  
کرنے کی کوشش کرتا ہوں ورنہ یہ سکول کے اندر جا کر  
تباہی مچا دے گا۔ اعتراف نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کو

بچہ سمیعہ لورین جو اپنی جان بچا سکتی تھی، آگ کے شعلوں میں سے بچوں کو نکالتی رہی۔ منشی جانوں کو بچاتے بچاتے اپنی جان بھی ظالم شعلوں کے سپرد کر دی۔ استاد ہونے کا فریضہ کچھ اس طرح سے ادا کیا کہ بچوں کو زندگی دیتے دیتے سمیعہ لورین نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ یہ عظیم معلمہ جماعت اسلامی کی کارکن تھیں۔

اس حادثے کے دن سے آج کے دن تک میں بھی سوچتا رہا اس زوال پذیر معاشرے میں جہاں اساتذہ، ڈاکٹرز، وکلاء، سیاستدان، فریڈیک ہر شیعے میں کرپٹ لوگوں کی بہتات نظر آتی ہے۔ بہت سی طرف تیزی سے جاتے ہوئے اس معاشرے میں کوئی سیاستدان کسی کے لئے اپنی جان قربان کر سکتا ہے؟ ایک لمحے کے لئے نصر اللہ جمیع کو استاد کے روپ میں دیکھئے، وہ بچے کتنے خوش قسمت ہوں گے جن کو ایسا نیک سیرت انسان پڑھاتا ہوگا۔ نصر اللہ جمیع کتنے بڑے انسان ہیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہوئے اس ظالم سماج کو استاد لفظ کا تقدس اور اس کی شان بتائے۔ نصر اللہ جمیع نے صحیح معنوں میں معلم کا فرض نبھایا۔ بھیڑیوں کے جھوم میں آپ جیسے فرشتہ صفت انسانوں کی شدید کمی ہے۔ آپ بارش کا پہلا قطرہ ہیں وہ قطرہ جس سے آغاز ہوتا ہے، وہ قطرہ جو خود ملی میں مل جاتا ہے لیکن جس زور و محاشروں کی لہجہ بدل دیتا ہے، وہ قطرہ جو اپنے آپ کو قربان کر کے تہذیبی کا محرک بناتا ہے۔ شکر یہ نصر اللہ جمیع ہمیں پھر سے بتانے کے لئے کہ آج بھی استاد کا رشتہ زندہ ہے، آج بھی انسانیت سانس لے رہی ہے۔ اعجاز حسن، سمیعہ لورین، نصر اللہ جمیع ہمیں تم پر فخر ہے۔ پاکستان کو تم پر فخر ہے، تم ہمارے ہیرو ہو۔ بتا ہے ہیرو بھی نہیں مرنے، جی ہاں کبھی نہیں.....!

### گلدوزہاں بچہ

"یہ لڑکا کبھی کچھ سیکھ نہیں پائے گا۔" کلاس روم میں استاد کی آواز گونجی، اس کے بعد سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ استاد اس کم سن طالب علم کو گھور رہا تھا۔ طالب علم خاموشی سے ہاتھ باندھے اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ استاد نے قہقہہ قائم رکھتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی۔ "یہ تو

نچر سمیعہ لورین جو اپنی جان بچا سکتی تھی، آگ کے شعلوں میں سے بچوں کو نکالتی رہی۔ منشی جانوں کو بچاتے بچاتے اپنی جان بھی ظالم شعلوں کے سپرد کر دی۔ استاد ہونے کا فریضہ کچھ اس طرح سے ادا کیا کہ بچوں کو زندگی دیتے دیتے سمیعہ لورین نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ یہ عظیم معلمہ جماعت اسلامی کی کارکن تھیں۔

### قابل فخر استاد

2 جون 2014ء کو کراچی کے محلی سکول مٹان پبلک سکول کا ایک گروپ مطالعاتی دورے پر ٹارن کاغان جا رہا تھا کہ ہالا کوٹ کے مقام پر بڑی دوپہر میٹرک کا طالب علم سفیان حاتم پاؤں پھسل جانے کے باعث دریائے کنہار میں جا گرے۔ نصر اللہ جمیع جو سکول کے پرنسپل بھی تھے انہوں نے استاد اور طالب علم کے رشتے کو اتنا مقدس جانا کہ بغیر یہ سوچے کہ میری جان بھی جا سکتی ہے۔ دریا میں ڈوبنے والے طالب علم کی جان بچانے کے لئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ طالب علم کی جان بچاتے بچاتے خود کو سرکش لہروں کے حوالے کر دیا۔

نصر اللہ جمیع 1970ء میں کراچی کے علاقے حیدر آباد کالونی میں پیدا ہوئے۔ دور طالب علمی میں اسلامی جمیعت طلبہ سے منسلک رہے، جو طبی طبیعت کے مالک، امت اور ملت عزم سے بھرپور اس نوجوان نے طلبہ سیاست میں بھرپور کردار ادا کیا۔ نصر اللہ جمیع جماعت اسلامی کراچی کے نائب امیر تھے۔ 2002ء کے عام انتخابات میں ایم ایم اے کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا صرف 30 سال کی عمر میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ سندھ اسمبلی میں متحدہ مجلس عمل کے اپنی پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے رہے ہوئے طبقوں کی گرجدار آواز بنے۔ نصر اللہ جمیع کی زندگی جدوجہد سے بھرپور تھی۔ چاہے وہ طالب علمی کا زمانہ ہو یا سیاست کا دور ہر جگہ

جی ہاں اس معمولی بچے کا دیا گیا فارمولا  $E=mc^2$  دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہٹلر کی حکومت نے اعلان کیا جو شخص آئن سٹائن کو قتل کرے گا اس کو ۲۰ ہزار مارک انعام دیا جائے گا۔ اس زمانے میں یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ مگر آئن سٹائن کی عظمت لوگوں کے دلوں میں اتنی قائم ہو چکی تھی کہ کوئی بھی اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ البرٹ آئن سٹائن اپنی محنت کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتا رپورٹر اس کے پیچھے لگے رہتے۔ ساری دنیا اس کی شکل سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ بادشاہوں کا معزز مہمان بنتا۔ جب وہ کسی شہر سے گزرتا تو لوگوں کا ہجوم اسے دیکھنے کے لیے اٹھ آتا۔ آخری عمر میں اسے ملنے والے لوگوں سے بچانے کے لیے محافظ رکھنا پڑا۔ لوگوں کو اس سے اتنی عقیدت ہو گئی تھی کہ وہ اس کے کوٹ کے بٹن بطور تحفہ اپنے پاس رکھ لیتے کہ ہم اس عظیم شخص سے مل چکے ہیں جس کی دماغی صلاحیت کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔

تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں معمولی زندگی سے آغاز کرنے والے بچوں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ دراصل مشکل حالات ہی عملی محرک بنتے ہیں۔ پیچیدہ ترین صورت حال ہی انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ ہمیشہ زندگی کے بہترین سبق بدترین قسم کے حالات میں ملتے ہیں۔ معمولی حالات زندگی کا مضبوط زینہ ہیں۔ اس کا انحصار آپ پر ہے آپ مصائب اور طوفانوں میں آگے بڑھ کر کامیابی کی سیڑھی چھاتے ہیں یا مایوس ہو کر موقع گنوا بیٹھتے ہیں۔ کامیابی آپ کے سامنے ہے لیکن یہ بھی آسان راستوں پر چل کر نہیں ملتی!

کیا آپ تیار ہیں محنت کرنے کے لیے؟



آسان سے آسان بھی باتیں نہیں کیے سکتے۔ "کلاس روم کے طالب علموں کی نظریں اس لڑکے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ طالب علم طنز پر مسکرا رہے تھے۔

"میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا اس کا جواب دو۔" استاد نے کہا۔

وہ طالب علم کلاس سے مس نہ ہوا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ایسا معلوم ہوا ہاتھ تھا کہ یہ کم سن طالب علم کسی اور ہی دنیا میں گم ہو۔ کلاس روم میں سکوت کا راج تھا۔ لڑکوں میں سسٹنی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے سوچا اب ہر روز کی طرح اس لڑکے کو مار پڑے گی۔ وہ خوش تھے کیونکہ وہ اس لڑکے کو پسند نہیں کرتے تھے اور پھر یہ بھی تو تھا کہ اس طرح ان کو کام سے کچھ فراغت ملتی تھی۔ اسی اثنا میں استاد غصہ سے چلانے لگا تھا۔ "کھڑے ہو جاؤ اور باہر چلے جاؤ اور دو پہر تک دیں کھڑے رہو۔"

کم سن لڑکے نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ مار کھانے سے بہتر تھا کہ وہ باہر ہال میں سخت سردی میں کھڑا رہے حالانکہ یہ بہت مشکل تھا لیکن کلاس روم کے بے تکے سوالوں اور ڈانٹ ڈپٹ سے بہتر تھا۔

اس لڑکے کی زندگی کا آغاز نہایت معمولی تھا۔ تین چار سال کی عمر تک وہ یوں انا شروع نہ کر سکا۔ وہ ایک معمولی بچے کی طرح آسان باتیں بھی نہ کیے سکتا تھا۔ بعد ازاں اسے سکول سے نکال دیا گیا کیونکہ استادوں کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی نااہلی کی وجہ سے وہ دوسرے طالب علموں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ مگر پھر اس بچے نے محنت کرنا شروع کر دی وہ اکثر آدھی رات تک اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس کی ان رات کی محنت اسے اس بلندی پر لے گئی جو اس کے ہمعصرین میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ ایک وقت آیا اس معمولی سے بچے نے لوہے انعام حاصل کیا۔ آج دنیا اس معمولی بچے کو آئن سٹائن کے نام سے جانتی ہے۔

نہ

## ”مجھے طلاق چاہیے“

لوگوں کی

معاشرے میں طلاق کا بڑھتا ہوا رجحان

ہمارے ہاں کا حاکم مرد و عورت کی زبان بند کروانے اور اس پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ہر جھڑپ کے وقت اسی ایک نقطہ کو بطور ہتھیارا استعمال کرتا ہے جو ایسی دھمکی ہے کہ عورت خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔

ایسے امتیاز احمد کراچی

☆

”ط... ل... ق“ اور حروف پر مشتمل یہ مختصر لفظ ایک ایسا ”طمانچہ“ ہے جو کسی اچھے ہوئے گرم لاوے سے گرم نہیں اور جب یہ لاوا ابل کر پھوٹ پڑتا ہے تو بہت سی زہد گیاں اُبڑ جاتی ہیں اور اُبڑنے کے بعد کی بجائے مکی زہد کی کسی قہر سے گرم نہیں ہوتی۔ یہ لفظ اپنے اندر اس قدر رنج، نفرت و عداوت، دوریاں اور کین طعن جیسے جذبات لئے ہوئے ہے جسے سنتے ہی روح تک لرز اُٹھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسے حلال ہونے کے باوجود سب سے منع اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔ کیوں کہ ایک عورت کو طلاق دینے کا مقصد صرف ایک عورت کو طلاق دینا نہیں ہے بلکہ خاندان کو سولی پر لٹکانے کے مترادف ہے۔ پورے خاندان کے جذبات کو بھردرج کرنا ہے، کتنی سی زہد گیاں سے کھیلنے کا نام ہے لیکن سوال

”اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی، جانور نہیں جو تم اس قدر بے رحمی سے مجھے مارتے ہو، گالیاں دیتے ہو، مجھے طلاق (خلع) چاہئے اور اگر تم نے طلاق نہ دی تو میں عدالت تک جاؤں گی اور بچوں کا خرچہ بھی تم سے لوں گی۔“

”تم کیا سمجھتی ہو میں اتنی آسانی سے تمہیں طلاق دے کر بچے بھی تمہیں دے دوں گا۔ تم جیسی عورت بچوں کی کیا خاک تربیت کرے گی، دیکھتا ہوں تم عدالت کیسے پہنچتی ہو؟“ اور پھر شاہد نے حسب معمول روٹی کو مارنا شروع کر دیا۔ پردے کے پیچھے چھپی ہوئی 7 سالہ زویہ کے ذہن میں طلاق کا لفظ گونج رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ طلاق کیا چیز ہے جو ہمارا زمانہ پاپا سے مانگتی ہیں اور پاپا ماما کو یہ چیز لاکر دینے کے بجائے ہر روز مارتے ہیں۔

انداز سے ہمارے معاشرے میں پھیلتی جا رہی ہے کہ ہر چار جانب زد و بدل ہی زوال نظر آ رہا ہے۔ بے حس، ناقدری، بات و برداشت کی کمی اور زبان درازی سے ایسے بگاڑ پیدا ہوئے ہیں کہ اب شیرازے بکھرنے میں چند لمحے نہیں لگتے۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات اس قدر سمجھ بھگت کی صورت اختیار کر جاتے ہیں کہ علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

مہمان لاء کی دفعہ 308 کے مطابق "کوئی مسلمان جو محل صبح رکھتا ہو اور من بلوغت کو پہنچ چکا ہو، جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہمارے"۔ اسلام میں طلاق کی اجازت صرف اس وقت ہے جب میاں بیوی میں ایسی مصالحت کا کوئی امکان نہ ہو، صرف معمولی بات پر طلاق دینا درست نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد رہا ہے۔ "اگر یہ شک پیدا ہو جائے کہ بیوی بدکار ہے تو اسے سمجھایا جائے اور اس پر معمولی تشدد کیا جائے"۔ یعنی انتہائی ناگزیر حالات میں بھی طلاق کی اجازت نہیں دی گئی لیکن آج کل معمولی نوعیت کے اختلاف پر طلاق دینا عام سی بات ہے۔ بیوی شوہر سے محض اس لئے خار کھانے لگتی ہے کہ وہ اس کی آزادی کے خلاف ہے اور اس کی خواہشات پوری نہیں کر رہا۔ دوسری طرف مرد بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے محض ایک مشین بن کر رہ گیا ہے جس نے اس کے مزاج میں بے چینی اور جھڑپا پیدا کر دیا ہے۔

شادی شدہ زندگی کا آغاز دو انسانوں سے ہوتا ہے جو خوشیوں اور غمبختوں سے بھرے گھر کی خواہش اور معاشرے میں اوقار مقام پانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جس کے بعد ایک خوبصورت اور پُر سکون گھر ہر انسان کی اولین اُمید بن جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں 85 فیصد سے زائد شادیاں کامیاب ہوتی ہیں حتیٰ کہ بظاہر بے جوڑ نظر آنے والے جوڑوں نے بھی

پیدا ہوتا ہے کسا خردہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر گھر تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو موجودہ دور میں معمولی نوعیت کے تنازعات کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کی جا رہی ہے اور بچوں کے مستقبل کو پس پشت ڈال کر طلاق دے دی جاتی ہے۔

وہ میاں بیوی جن کے درمیان وہی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث اختلافات پروان چڑھتے ہیں اور جو ہر وقت بچوں کے سامنے اپنے اختلافات یا نفرت کے باعث لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان کے لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے بچوں کے محسوس ذہن پر ایسے نقوش بننے جاتے ہیں جو مستقبل میں تلخ یادوں اور تکلیف دہ عمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ بچے کے سامنے جہاں ماں اپنی زبان درازی سے کام لیتے ہوئے لڑ رہی ہوتی ہے تو باپ صبر و تحمل اور قوت برداشت کو پس پشت ڈال کر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اس ناساز ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کی موثر شخصیت سازی نہیں ہو پاتی اور وہ اپنی زندگی میں بے راہ روی اور بے قاعدگیوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔ طلاق کی صورت میں بچے کو یا تو باپ کی شفقت کے سامنے سے محروم ہونا پڑتا ہے یا ماں کی ممتا کی چھاؤں سے کوسوں دور جانا پڑتا ہے۔ ماں باپ میں سے کسی ایک کی محرومی سے بچے میں خود اعتمادی کی کمی بھی ہو سکتی ہے اور وہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق لڑکپن کی عمر میں جو بچے اپنے اہل خانہ سے قریب ہیں اور جن کی زندگیوں میں ان کے ماں باپ پوری طرح شامل ہیں، ان کا کردار درست رہتا ہے اور وہ آوارگی سے دور رہتے ہیں اور یہی اچھا اثر اچھے اساتذہ یا ایسے بزرگوں کا ہوتا ہے جو انہیں اپنے قریب رکھیں اور ان سے شفقت و محبت کا سلوک کریں۔

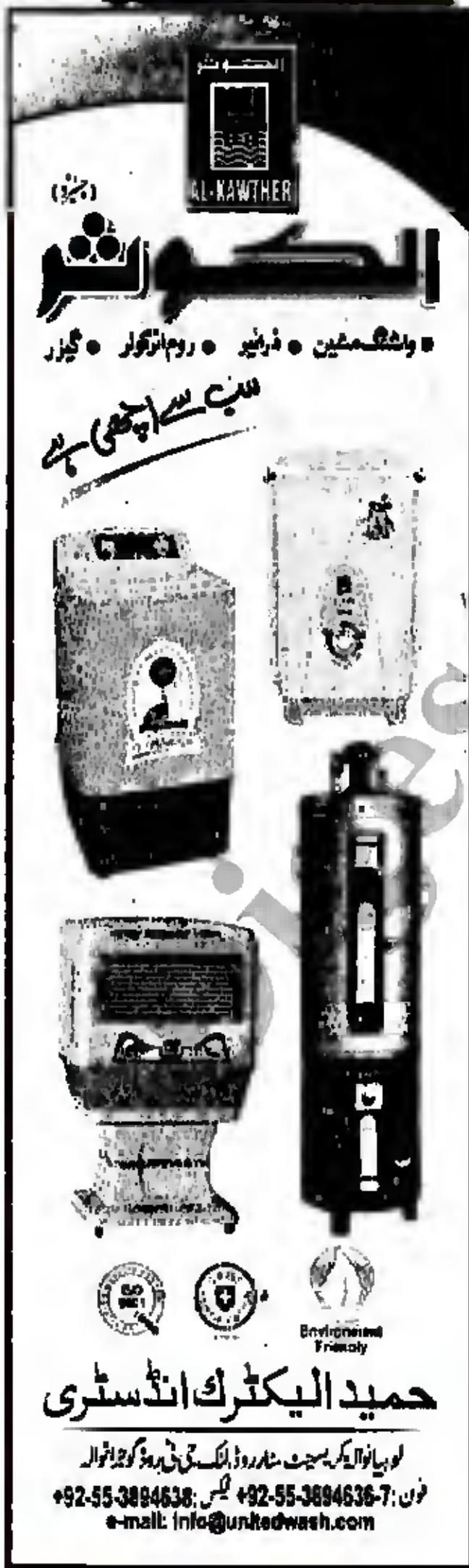
کچھ سالوں سے بے ترتیبی اور بے چینی کچھ اس

AL-KAWTHAR

الحکومت

• واشنگٹن • ڈبئی • روم انکوار • گیار

سب سے اچھی ہے



حمید الیکٹرک انڈسٹری

لوہا نوالہ کمرہ سیٹ سٹار روڈ الیکٹریٹی بریڈنگ کوڈ انوال

فون: +92-55-3894636-7 • فیکس: +92-55-3894638

e-mail: info@unkedwash.com

زندگی کے اختلافات کی گھڑی کو یوں الگ باندھ کے رکھا ہوتا ہے کہ تمام عمر صرف چند خوبوں کو بد نظر رکھ کر ہی زندگی گزار دی تاکہ بچوں کو بہترین ماحول میسر آئے اور خاندان کی مہذب ساکھ بھی متاثر نہ ہو۔

لیکن ایسے والدین بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو اپنے اختلافات کی وجہ سے بچوں کے مفادات کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے عدالت تک جا پہنچتے ہیں اور میاں بیوی جنہیں ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ اپنے مفادات کی خاطر جھوٹ اور سچ کو ملا کر ایک ایسا روپ دیتے ہیں کہ دونوں ہی دنیا کے غیر مہذب افراد دکھائی دینے لگتے ہیں۔ معمولی رنجشوں کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے جان چھڑانے کی تدبیریں ہونے لگی ہیں اور اس سارے عمل میں بچوں کو کسی کھاتے میں بیٹھ نہیں کیا جاتا۔ والدین اپنے درمیان رنجشوں کی جنگ میں ان معصوم بچوں کو بھول جاتے ہیں جنہیں ان کے کسی غلط فیصلے کی بے نیٹ خچہ ہٹا ہوتا ہے۔ والدین آپس کے لڑائی جھگڑوں اور پھر طلاق کے بعد ان کی تقسیم ایسے کرتے ہیں جیسے یہ بچے نہیں کسی جائیداد کا حصہ ہوں۔ بچوں کی اس کھینچا تانی میں یہ بھول مر جھا کر رہ جاتے ہیں اور ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے بچے کم عمری میں سنجیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں جن کے حواس پر خوف اور آنے والے کسی لمحے کا ڈر ایسا سوار ہوتا ہے کہ وہ کبھی مکمل شخصیت بن کر بڑے نہیں ہوتے۔ محرومی ایسے بچوں کی ذات کا ایک حصہ بن جاتی ہے جس کا اظہار بعض اوقات وہ خود کو اور کبھی دوسروں کو اذیت دے کر کرتے ہیں۔ طلاق ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس میں بچے عدم توجہ اور والدین کے درمیان پڑنے والی نفرت کو لے کر پروا نہ دیتے ہیں تو ان میں بے راہروی بڑھنے لگی ہے جس کے بعد وہ جرائم کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں اور کچھ نشہ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

چونکہ بچوں میں میرٹ و کردار کی نشوونما اور تشکیل کا عمل والدین کے زیر سایہ ہو رہا ہوتا ہے چنانچہ ان میں گمراہ راستوں کا اثر اور بے راہ روی کا شکار ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ محبت کرنے والے ماں باپ کے زیر سایہ پرورش پانے والے بچے صالح بڑھن شہری اور نیک کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ مادہ پرستی ذمہ داریوں سے غفلت اور قوت برداشت کی کمی کے علاوہ اپنے ساتھی کو خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرنے کے جذبے کی عدم موجودگی کے باعث پاکستان میں طلاق کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ثقافتی یلغار نے خاندانی روایات کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب لڑکیاں سسرال والوں کی عام باتوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتیں بلکہ ان سے لڑی جھگڑتی رہتی ہیں۔ معاشرے میں خود غرضی بڑھ جانے کی وجہ سے لحاظ، مروت اور احترام ختم ہو رہا ہے۔ اب انسان کی قدر دولت سے ہے۔ فیشن کی دوڑ نے عمدہ تہذیب و روایات کو کمزور کر دیا ہے اور لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کے شعور کی کمی کے باعث بھی لڑکیاں بے پروائی اثرات زیادہ اور جلدی قبول کر رہی ہیں۔ ثقافتی یلغار اور گھریلو جھگڑوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والے لٹریچر کے باعث لومر لڑکیوں کے معصوم ذہن اپنے گھر، بھائیوں، شوہر اور والدین کے خلاف سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں تو کچھ خاندانوں میں والدین بچوں کی پسند کو مد نظر رکھ کر شادیاں نہیں کرتے۔ بے جوڑ رشتے بھی خاندان کے ٹوٹنے کی وجہ ہیں۔ پرانے وقت میں عورتیں سمجھوتہ کر لیا کرتی تھیں لیکن موجودہ حالات میں شعور کی وجہ سے ہمارا خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ہر لڑکی بہترین گھرانے اور ہندسہ مرد کی خواہش کرتی ہے۔ اسی طرح لڑکے بھی خوبصورت لڑکی اور امیر گھرانے میں شادی کرنا چاہتے ہیں اور اگر توقعات پوری نہ ہوں تو اختلافات پروان چڑھنے لگتے

ہیں اور طلاق تک لوٹ آ جاتی ہے۔ پاکستان مسلم لیبل لاہ آرڈیننس 1961ء کے تحت طلاق کا ایک طریقہ کار مقرر کیا گیا ہے جس کے مطابق شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق سے قبل ایک لوٹس بھیجے۔ لوٹس نہ بھیجنے کی صورت میں ایک سال قید یا 5000 روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔ اس کا دروازہ کے آغاز پر ہی متعلقہ چیز میں مصالحتی کمیٹی دونوں فریقین کی طرف سے چند افراد کو جن کو ایک کمیٹی تشکیل دیتا ہے جو فریقین کے درمیان صلح کروانے کی کوشش کرتی ہے اور اگر دونوں صلح پر راضی نہ ہوں تو چیئر مین طلاق مؤثر ہونے کا سرٹیفکیٹ 90 دن میں جاری کرتا ہے اور طلاق ہو جاتی ہے۔

ایک سروے کے مطابق اس وقت عدالتوں میں 30 ہزار کے قریب طلاق کے مقدمات زیر سماعت ہیں جب کہ روزانہ 60 سے زائد نئے دعوے دائر ہوتے ہیں۔ ان قسم کے مقدمات کی تعداد 1800 ماہانہ سے زائد ہے۔ طلاق کے اس قدر بڑھتے ہوئے رجحان کا اولین سبب غیر سنجیدہ رویے ہیں۔ قوت برداشت کی کمی کے باعث معمولی معمولی جھگڑوں پر بھی طلاق جیسی سنگین دھمکی دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کا حاکم مرد عورت کی زبان بند کروانے اور اس پر اپنی بلاذستی قائم رکھنے کے لئے ہر جھگڑے کے وقت اسی ایک لفظ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے جو ایسی دھمکی ہے کہ عورت خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔

پہلے ہمارے معاشرے میں مشترکہ خاندانی نظام رائج تھا جہاں سب مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت، مروت اور احترام کے جذبات دلوں میں پائے جاتے تھے۔ لڑکے والدین کے دباؤ کی وجہ سے طلاق دینے سے گھبراتے تھے اور یہی حال لڑکی والوں کا بھی تھا کہ اگر ان کی بیٹی بھی راضی ہو گئے تھے آ جاتی تو

رجوع کیا۔ آج یاسمین کو دو سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے وہ اپنے والدین کے گھر میں خوش ہے۔ بھائی ہر مہینہ پچاس ہزار روپے بھیجتا ہے جب کہ یاسمین کے شوہر نے اسے واپس لانے کے لئے اپنے والدین کو بھی بھیجا تھا لیکن یاسمین نے جانے سے انکار کر دیا۔ یاسمین کا کہنا ہے کہ خالد بہت اچھا انسان ہے اس نے مجھے خوش رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے میرے والدین سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا اور کراچی شفٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ ویسے بھی حیدر آباد میں میرے بچے اچھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، کراچی سب سے بڑے اسکول میں میرے بچے پڑھ رہے ہیں اور میرا بھائی بچوں کے اخراجات اٹھا رہا ہے۔

یاسمین کے برعکس حسن بانو کا کیس بالکل ہی الگ ہے۔ حسن بانو ایک روایت پسند پنهان خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کی شادی 17 سال کی عمر میں 40 سالہ شادی شدہ شخص گل نواز سے کر دی گئی جو اسے پشاور لے گیا جہاں گل نواز کی پہلی بیوی حسن بانو کو بہت مارتی تھی اور سارے گھر کا کام کاج اسی سے کرواتی تھی۔ جب حسن بانو گل نواز سے اس کی شکایت کرتی تو وہ اپنی پہلی بیوی کو سمجھانے کے بجائے حسن بانو کو مارنا پھینکا تھا۔ اسی دوران حسن بانو کو خدا کی طرف سے جوادثحہ میں ملا جسے پا کر حسن بانو بہت خوش تھی لیکن گل نواز اور اس کی پہلی بیوی اب تک حسن بانو کو مارتے پینتے تھے۔ ایک دن حسن بانو موقع پا کر گھر سے فرار ہو گئی اور والدین کے پاس آ گئی لیکن یہاں بھی اسے سکون و آرام نصیب نہ ہوا۔ ماں باپ نے الگ لعن طعن کی اور بھائیوں نے اپنی بیویوں کے کہنے میں آ کر مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یاسمین اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے ناراض ناراض سی رہنے لگیں تاکہ وہ جلد ہی ہی اپنے شوہر کے پاس لوٹ جائے لیکن حسن بانو کے لئے واپس جانا

والدین بیٹی کو مصالحت پر آمادہ کرتے اور مجبورہ کرنے کی تلقین کرتے اور یوں بگڑتے ہوئے حالات گھر سے سنورنے لگتے لیکن اب حالات یہ ہیں کہ لڑکی والدین کو مسئلہ بتاتی ہے اور والدین مسئلے کا حل نکالنے کے بجائے لڑکی کو گھر بٹھا لیتے ہیں۔

یاسمین جو کہ امیر والدین کی اکلوتی بیٹی ہے، اس کی شادی ڈاکٹر خالد سے 7 سال قبل والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ خالد چونکہ حیدر آباد میں رہتا ہے اور وہیں ایک سرکاری ہسپتال میں کام کرتا ہے، اس لئے شادی سے پہلے یاسمین کے والدین نے اسے کراچی شفٹ ہونے کی شرط رکھی تھی جسے خالد نے بخوشی قبول کر لیا تھا لیکن شادی کے بعد یاسمین کراچی شفٹ ہونے کا ذکر کرتی تو خالد بھانے بازی سے کام لیتا کہ میری مستقل نوکری ہے، اتنی جلدی ٹرانسفر نہیں ہوگی وغیرہ۔ اس دوران یاسمین حیدر آباد کی گری سے بہت پریشان تھی۔ یاسمین کو چیز میں اسے سی بھی ملا تھا۔ جب یاسمین نے اسے اپنے کمرے میں لگانے کا ارادہ کیا تو بڑی جیشانی نے گھر میں جھگڑا ڈال دیا کہ یاسمین کے کمرے میں انٹرکنڈیشن لگنے کی وجہ سے اس کا کمرہ مزید گرم ہو جائے گا کیوں کہ اسے سی سے لگنے والی گرام ہوا براہ راست اس کے کمرے میں آئے گی۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یاسمین اپنے لئے الگ کھانا بناتی تھی۔ یاسمین کا بڑا بھائی امریکہ میں رہتا تھا وہ چینیوں میں کراچی آیا ہوا تھا۔ یاسمین بھائی سے ملنے اپنے میکے گئی جہاں اس نے بھائی کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ بھائی نے جوش میں آ کر اپنی بہن کو گھر میں ہی روک لیا اور یاسمین اور بچوں کا خرچہ اٹھانے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے ڈاکٹر خالد کو مختلف جائز و ناجائز طریقوں سے کراچی شفٹ کرانے کی کوشش کی مگر وہ ناکام ہوا۔

لہذا اس نے بہن کو خلع دلوانے کے لئے وکیل سے

دور نہ تو ہر عورت اپنے بچوں کی خاطر مصالحت کا راستہ اپناتی ہے جب کہ مرد حضرات اسلام کے اس اصول کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ایک مرد چار شادیاں کر سکتا ہے۔ مردوں کے لئے ایک سے زائد شادیاں اہم ہیں اس بات کو قطعی بھول کر کہ کن حالات میں اور کن خواتین سے بوقت مجبوری شادی کی جاسکتی ہے۔

موجودہ دور میں اقدار اور روایات بدلتی جا رہی ہیں۔ بہت سے مہاں بیوی میں جنی ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے۔ دور حاضر کی لڑکیاں باشعور ہونے کی وجہ سے اپنے دفاع کے لئے لڑتی ہیں تو ان کو طلاق جیسی دھمکیاں بھی ملتی ہیں لہذا لڑکیوں کو چاہئے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں ہوئے سسرال والوں کی معمولی نوعیت کی باتوں کو نظر انداز کریں اور اپنے سسرال والوں سے تعاون کریں تاکہ اچھے تعلقات پروان چڑھ سکیں۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ لڑکیاں چاہے مصنوعی روپ دھار کر ہی سسرال والوں کی ہاں میں ہاں ملائیں تاکہ ان کا دل جیتا جاسکے۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ مرد حاکم تصور کیا جاتا ہے اس لئے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ہر حکم مانا جائے اس لئے عورت کو ہی اس کے رنگ میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ لہذا اگر شوہر غصے میں ہو تو بیوی کو خاموش رہنا چاہئے۔ اگرچہ خاوند کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی بیوی سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ قوت برداشت کا استعمال کرتے ہوئے بیوی کو مارنے پٹنے سے گریز کرے کیوں کہ جو شخص محض اپنا غصہ کسی عورت پر اتارتا ہے وہ دنیا میں کمزور کردار کا حامل شخص ہوتا ہے لیکن بعض مرد غصے کے زیادہ تیز ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں بیویاں بھی زبان درازی کرتی ہیں تو معاملہ بگڑنے لگتا ہے اور طلاق جیسی صورت سامنے آتی ہے۔



جہنم میں جانے کے مترادف تھا۔ حسن بالو اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی جس کی بہت مخالفت کی گئی لیکن حسن بالو نے ہتھیار نہیں اٹائے۔

دو سال بعد ایک دن اچانک حسن بالو کا شوہر اپنے بیٹے سے ملنے کے بہانے کراچی آ گیا۔ حسن بالو کے والدین نے صلح کروانے کی کوشش کی اور گل لواز حسن بالو کو ایک کوارٹر میں لے گیا جس کا کرایہ اکثر دیپتھر حسن بالو ہی دیا کرتی تھی۔ گل لواز چونکہ ٹرک ڈرائیور تھا اس لئے مہینے میں ایک دو بار حسن بالو کے پاس آ جایا کرتا تھا۔ اس دوران حسن بالو کی گود میں ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ حسن بالو کچھ ہی سالوں کے لئے خوش رہ سکی تھی کہ ایک دن گل لواز کی جانب سے طلاق کا نوٹس آیا جسے دیکھ کر حسن بالو سکتے میں آ گئی اور اس کی بچی بسائی دنیا اجڑ گئی۔ گل لواز نے پھر بھی مرکز حسن بالو اور بچوں کا حال دریافت نہ کیا۔ اب حسن بالو ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتی ہے اور اس کے بچے نجیال میں ہوتے ہیں جہاں انہیں ڈانٹ ڈھٹ اور طعنوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ حسن بالو کا کہنا ہے کہ اپنے ماں باپ کی غلطی کی وجہ سے آج میں اس حال میں ہوں۔ انہوں نے ایک ایسے شخص سے میری شادی کر دی جو پہلے سے شادی شدہ تھا جس نے مجھ پر بہت ظلم کئے اور آج جب میں ان کی غلطی کی سزا بھگت رہی ہوں تو وہ شرمندہ ہونے کے بجائے مجھے ہی قصور وار ٹھہراتے ہیں کہ گھر بسانے کے قابل نہیں ہوں۔

اکثر خواتین کی بد قسمتی یہ کہ وہ ایسے شخص سے بیاہ دی جاتی ہیں جو یا تو شادی شدہ ہوتا ہے یا نشے کا عادی ہوتا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے اس دور میں سانسوں کی ڈور کھینچنے کے لئے کمانا نہایت ضروری ہے ایسے ہی بعض حالات کا شکار ہو کر اور کئی خواتین روز روز کے درد سے بچنے کے لئے اپنے خاوند سے طلاق لیتی ہیں

## جنت کا دربار

”تمہاری مراد پوری ہو جائے گی لیکن جنت کے اس دربار میں تمہیں جب وہ چاہیں حاضری دینا ہو  
گی اور وہ تمہاری خواہش پوری کر رہے ہیں۔ تمہیں ان کی خواہش پوری کرنی پڑے گی۔“

نی آ کی ساگر



کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ نامہ جیل کا قادری صاحب تھا۔ ”رات کو سونے سے پہلے ایک سو مرتبہ یار رحیم یا کریم کا ورد کر لیا کرو“۔ قادری صاحب نے کہا۔ ”میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے کیا جرم کیا ہے اور تمہیں کتنی سزا ملی ہے۔ میں تمہاری صرف حالت دیکھ رہا ہوں۔ یہ اچھی نہیں۔ قیدی جب جیل میں آتا ہے تو مہینہ دو مہینے اس کی یہی حالت رہتی ہے۔ تم مسلمان ہو اسی لئے تمہیں یہ وظیفہ دیا ہے۔ یہ ضرور کرنا خدا تمہیں سکون عطا کرے گا۔“

اُس کے انداز میں مجھے خلوص اور ہمدردی نظر آئی یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بعض پیشہ ور فراڈ بے کسی فراڈ میں پکڑے جاتے ہیں تو جیل میں آ کر بھی کوئی نہ کوئی فراڈ چلا لیتے ہیں۔ میں نے جیل میں دو تین عادی مجرموں کو پیر اور عامل بنے ہوئے دیکھا ہے۔ جن قیدیوں کے کیس چل رہے تھے یا جن کی اپیلیں ابھی زیر سماعت تھیں وہ ان کو ہاتھ بندھ نذر نیاز دیتے تھے۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ قادری صاحب بھی ایسا ہی فراڈیا ہے لیکن چار پانچ دنوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص کچھ اور ہے۔

پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ اس عرصے میں جیل کے ایک وارڈن اور دس بارہ قیدیوں نے مجھے قادری صاحب کی زندگی کی کہانی سنائی۔ ان قیدیوں میں دو تین ایسے بھی تھے جو قادری صاحب کو باہر بڑی اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ایسے تھے جو ان کی زندگی کی کہانی کے دوسرے کرداروں کو بھی جانتے تھے۔ میں نے اپنے طور پر مختلف ذرائع سے قادری صاحب کی کہانی کی انٹرویو کی اور تصدیق بھی کروائی۔ میں آپ کو یہی کہانی سناؤں گا۔

پاکستان بننے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے بھوپال شہر میں ایک مسلمان لڑکے کی بارات لڑکی والوں کے ہاں گئی۔ بینڈ باجا ساتھ تھا اور گولے بھی بہت چلائے جا

جو جیل سے ملتی ہیں وہ کسی کتاب سے نہیں مل سکتیں۔ ہر قیدی ایک کہانی کا کردار ہوتا ہے۔ ہر جرم کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ وہاں ہر قیدی اپنی کہانی سنانے کے لئے چننا رہتا ہے۔ چار دیواری کی دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتیں جب واردات کی صورت اختیار کر لیں تو جیل میں جا کر سلسلی خیز کہانیاں بن جاتی ہیں۔

میں جب بھارت میں جاسوسی کے جرم میں پکڑا گیا تو تھروڈگری کی بھٹی میں سے گزار کر مجھے نامہ جیل میں پھینک دیا گیا۔ میری ہڈی پہلی ایک ہو چکی تھی۔ سات آٹھ روز بعد جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو میں نے اچھی طرح دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ اگر میں اپنی اس وقت کی حالت اور وہاں کا ماحول بیان کرنا شروع کر دوں تو اصل کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں وہ دھری رہ جائے گی۔ میں مزید تمہید کے بغیر اصل کہانی پر آتا ہوں۔

میں ایک ضعیف العمر قیدی کو پہلے رڈز ہی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دازمی اور سر کا ایک ہال بھی کالا نہیں رہا تھا۔ کیا قیدی اور کیا جیل کا عملہ ہر کوئی اس کی نظیم کرتا تھا اور سب اُسے قادری صاحب کہتے تھے۔ شاید میں ہی تھا جس کے ساتھ ابھی اُس کا تعارف نہیں ہوا تھا۔ ایک روز میں بیرک سے باہر بیٹھا اپنے خیالوں میں گم تھا۔

یہ سوچ مجھے پریشان کر رہی تھی کہ کس غدار نے میری خبری کر کے مجھے گرفتار کر دیا ہے۔ مجھے گرفتاری کا افسوس نہیں تھا۔ میں اس حقیقت کو قبول کر کے جاسوس بنا تھا کہ ایک نہ ایک دن دشمن مجھے گرفتار کرے گا اور اس امکان کو بھی میں نے ذہن میں بٹھا رکھا تھا کہ میں دشمن کی گولی سے مارا بھی جاؤں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جب میں پکڑا جاؤں گا تو مجھے ظالمانہ اذیتیں دی جائیں گی۔ مجھے افسوس اپنے دشمن کا تھا جو ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔

تھے۔ ایسے گھرانوں میں لڑکی کی پسند اور ناپسند نہیں دیکھی جاتی۔ لڑکے کو بھی اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لڑکی کا نام مجھے زریہ بتایا گیا۔ راز یہ کھلا تھا کہ لڑکی کو ایک اور لڑکا اور اس کا گھرانہ بہت ہی پسند تھا۔ اس نے اس لڑکے کو جس کا نام مجھے فہیم بتایا گیا، دیکھا ہوا تھا اور اس کے متعلق وہ بڑی اچھی باتیں سنتی رہتی تھی۔

فہیم کا گھرانہ کشادہ ظرفی اور خلوص کے لحاظ سے مشہور تھا۔ زریہ اور فہیم کا آپس میں کبھی آنا سنا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ دولہا جو گھوڑی سے گرا تھا کمزور اور چھوٹے سے قد کا لڑکا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سا نوا تھا۔ اس کے مقابلے میں زریہ صبح معنوں میں خوبصورت لڑکی تھی۔ چار دیواری کی دنیا میں کسی کا کوئی راز چھپا نہیں رہ سکتا۔ زریہ کا رشتہ جب اس لڑکے کے ساتھ طے ہو گیا تو وہ سہیلیوں کے آگے روٹی تھی۔ اس نے یہاں تک کہا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ کچھ کھا کر مر جاؤں۔

بھوپال شہر کے گرد و نواح میں ایک پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ وہاں ایک عامل رہتا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے پاس ایسا علم ہے کہ وہ ترمیم میں آجائے تو سیاہ کو سفید کر دے۔ ایسے بعض لوگ کالا علم کہتے اور کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں جو اس کا حکم مانتے ہیں۔ وہ جنات کا باقاعدہ دربار لگاتا ہے۔ انہی جنات کی مدد سے وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ زریہ نے عورتوں کی زبانی اس عامل کی کرامات کے بہت قصے سن رکھے تھے۔ اسے محض اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ زریہ ان عاملوں کو نہیں مانتی تھی۔ اُسے دو سہیلیوں نے مشورہ دیا کہ اس عامل کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور اُس کی شادی فہیم سے ہو جائے۔

ایک روز زریہ ان دو سہیلیوں کے ساتھ اپنی ماں کو

رہے تھے۔ بارات جب لڑکی والوں کے گھر کے قریب پہنچی تو دولہا کے ایک دوست نے دولہا کی گھوڑی سے بندرہ میں قدم آگے جا کر تین گولے زمین پر رکھے اور انہیں ہاری ہاری آگ لگا دی۔ گولوں کے پھٹنے تک دولہا کی گھوڑی گولوں کے قریب چلی گئی۔ بینڈ باجے والے گھوڑی کے آگے تھے لیکن وہ سب پیچھے ہٹ آئے کیونکہ تین گولے پھٹنے والے تھے۔ دولہا کی گھوڑی گولوں سے دو تین قدم دور تھی کہ تین گولے پھٹے۔ گھوڑی ایسی تیزی طرح بدکی کہ پیچھے کو مڑ کر دوڑ پڑی اور بے لگام ہو گئی۔ دو بچے کھلے گئے اور دولہا جس نے کبھی گھوڑ سوار کی تصور بھی نہیں کیا تھا، کچھ اس طرح گرا کہ گھوڑی کے آگے جا پڑا اور گھوڑی کا اٹھا پھلا سم اس کے کولہے پر پڑا۔ وہاں سے دولہا کی ٹانگ بہت تیزی طرح کھلی گئی۔

دولہا کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ وہ بے ہوش تھا۔ عین موقع پر یہ جو حادثہ ہو گیا تھا اس کا ہر کسی کو افسوس تھا لیکن شام کے وقت ڈاکٹر نے یہ بتا کر کہ دولہا کی ٹانگ کو لہے کے قریب سے کاٹنی پڑی گی۔ لڑکے والوں کے ہاں صف ماتم بچھا دی۔ پتا چلا کہ ٹانگ پر جہاں گھوڑی کا پاؤں پڑا تھا، وہاں سے ہڈی اس طرح ٹوٹی ہے کہ جوڑی نہیں جاسکتی۔ ٹانگ کا گوشت اس طرح کھلا گیا تھا کہ ٹانگے لگنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر اٹاڑی ہو لیکن ہوا یہ کہ دولہا کی ٹانگ کو لہے کے قریب سے کاٹ دی گئی۔ دولہا میاں کے جسم پر گوشت کی پہلے ہی کی تھی وہ پتھارہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔

لڑکی والوں نے شادی ملتوی نہ کی بلکہ منسوخ کر دی۔ ایک ٹانگ کے آدمی کو کون اپنی اچھی بھلی لڑکی دیتا ہے۔ یہاں سے یہ کہانی چار دیواری کی دنیا کے اندر چلی جاتی ہے۔ جس دہن کو لانے کے لئے یہ بارات جاری تھی وہ اس دولہا کو پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ راز کچھ عرصہ بعد کھلا تھا۔ لڑکی والے درمیانہ درجے کے شریف لوگ

بالکل ویسے ہی ہو گیا لیکن یہ خبر بڑی جلدی عورتوں میں پھیل گئی کہ زریںہ خوش نہیں اور اُس پر ہر دقت خاموشی طاری رہتی ہے۔ اُس کی سہیلیوں سے پتہ چلا کہ زریںہ اپنے آپ میں کوئی ایسا اثر محسوس کرتی ہے جو اُسے نہ ہنسنے سکرنے دیتا ہے نہ بات کرنے دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ رو بھی پڑتی تھی۔ اس کی ساس بہت پریشان ہوئی کہ لڑکی کو کیوں چپ لگی ہوئی ہے۔ زریںہ بڑی شوخ لڑکی ہوا کرتی تھی۔

زریںہ کا خاوند بھوپال سے کچھ دور کسی ضلع کے شہر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں اپر ڈویژن کلرک تھا۔ اُس دقت بھوپال ایک مسلمان نواب کی ریاست تھی۔ اس کی حدود کے باہر انگریزوں کا قانون چلتا تھا۔ فہیم شادی کے دوسرے تیسرے مہینے زریںہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ یہ کون سا شہر بتایا گیا تھا۔ بعض عورتیں کہتی تھیں کہ زریںہ ساس کے ساتھ خوش نہیں رہتی اور وہ فہیم کے ساتھ رہنا چاہتی ہے لیکن فہیم کے ساتھ گئی تو بھی اس کی حالت سدھرنہ سکی۔ فہیم اپنے خاندان کے مطابق بڑے اچھے ذہن اور کھلے دل کا آدمی تھا۔ اس نے زریںہ کو خوش رکھنے کا ہر طریقہ استعمال کیا لیکن وہ خوش ہونے کی بجائے رو پڑتی تھی۔ آخر فہیم ہار گیا۔ اُس نے زریںہ سے کہا کہ تمہاری دو سہیلیوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم مجھے بہت پسند کرتی تھیں لیکن اب مجھ کو شک ہونے لگا ہے کہ تم کسی اور کو چاہتی ہو۔

فہیم کی زبانی یہ بات بھی معلوم ہوئی تھی کہ زریںہ میاں بیوی کے تعلقات میں برف کی مانند سرد رہتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے اندر اس قسم کے جذبات ہیں ہی نہیں یا وہ فہیم کے معاملے میں ان جذبات کو سرد اور غرورہ رکھتی تھی۔ فہیم نے جب جگ آ کر اُسے یہ کہہ دیا کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہے تو زریںہ تڑپ اٹھی۔

"نہیں نہیں"۔ زریںہ نے روتے ہوئے کہا "خدا

بتائے بغیر عامل کے پاس چلی گئی۔ عامل نے اُس سے واجبی سے پیسے لئے اور کاغذ پر کچھ ہندسے سے لکھ کر اُسے دیئے اور کہا کہ اس کاغذ پر اپنا تھوک لگا کر اپنے باہر والے دروازے کے قریب کھیں زمین میں دبا دیتا۔ عامل نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ایک خطرہ مول لے رہا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ اُس نے یہ کام اپنے ایک جن کے سپرد کیا تھا کہ اس دروازے سے میں صرف وہی شخص داخل ہو جسے زریںہ پسند کرتی ہے اور اگر اس کی باپسند کا دولہا آ جائے تو اُس کو ایسا بھگاؤ کہ پھر کبھی اوہر آنے کا نام نہ لے۔ عامل نے زریںہ کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اپنا چہرہ اُس کے بالکل قریب کر کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تمہاری مراد پوری ہو جائے گی لیکن جنات کے اس دربار میں تمہیں جب وہ چاہیں حاضری دینا ہوگی اور وہ تمہاری خواہش پوری کر رہے ہیں۔ تمہیں اُن کی خواہش پوری کرنی پڑے گی۔"

عامل کا کہا ہوا ایک ایک لفظ پورا ہو گیا۔ زریںہ کا ناپسندیدہ دولہا آیا اور گھوڑی سے گر کر ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ زریںہ کے والدین نے اس خدشے کے پیش نظر کہ لڑکے کی ٹانگ کا زخم ملنے کے بعد اُس کے ماں باپ پیچھے نہ پڑ جائیں کہ اب شادی کرو، فوراً کسی اور جگہ زریںہ کی شادی کرنے کے لئے فہیم ہی کو منتخب کر لیا۔ اس سے پہلے فہیم کے ماں باپ نے بھی زریںہ کا رشتہ مانگا تھا لیکن زخمی ہونے والا دولہا ان کی برادری کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اسی لئے اسے رشتہ دے دیا گیا، اب زریںہ کا رشتہ فہیم کو مل گیا۔ دس بارہ دنوں بعد فہیم کی ہارات آئی اور زریںہ کو لے گئی۔

زریںہ پر عامل کی دھاک بیٹھ گئی لیکن معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ وہ دوبارہ عامل کے پاس نہ گئی۔ اس لڑکی سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی

مجھے یہ بات پہلے ہی بتا دینی چاہئے تھی..... میں پہلے دولہا کے ساتھ رشتہ طے ہو جانے پر اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ اس نقشہندی عامل کے پاس گئی تھی اور اُسے کہا تھا کہ یہ رشتہ منسوخ ہو جائے اور میری شادی آپ کے ساتھ ہو جائے۔ اُس نے مجھے ایک تعویذ سادے کر کہا کہ یہ اپنے گھر کے باہر والے دروازے کے قریب زمین میں دبا دینا پھر تھارے گھر میں تمہاری پسند کا آدی بارات لے کر آئے گا۔ اگر کوئی اور دولہا بن کر آ گیا تو میرے جن اُسے ایسے طریقے سے واپس بھیجیں گے کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا.....

"میں نے اُس کا تعویذ اپنے دروازے کے باہر دبا دیا۔ پھر آپ کو بھی معلوم ہے کہ جو آدی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا وہ بارات لے کر آیا تو اُس کے ساتھ کیا ہوا۔ اُس کی ایک ٹانگ ہی کٹ گئی۔ آپ کو میرے رشتے کا جواب مل چکا تھا لیکن میرے ماں باپ نے خود آپ کے ابو اور ای کو پیغام بھیجا کہ ہماری لڑکی کے ساتھ بات چلی کر لو۔ یہ ایک مجبور تھا لیکن یہ مجبور میرے لئے سزا بن گیا۔ وہ اس طرح کہ جب آپ کی بارات آئی تو میں بہت ہی خوش تھی لیکن مجھے جب آپ کے کمرے میں بٹھا کر لڑکیاں باہر نکل گئیں تو میرے دل کو سمجھ ہو گیا۔ میں نے سنا تھا کہ پہلے روز ہر دلہن گھبرا کر رہتی ہے۔ میں بھی یہ بھی کہ پہلے روز والی گھبراہٹ ہے جو آپ کی ملاقات کے بعد ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا.....

"آپ کمرے میں آئے تو میرا دل اتنا بیٹھ گیا کہ رونے کو جی کرنے لگا۔ میں نے اپنے سارے وجود میں سردی محسوس کی۔ میرا خیال تھا کہ آپ جب میرے جسم کو ہاتھ لگائیں گے تو آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ تمہارا جسم اتنا سرد کیوں ہے؟ میرے وہ جذبات جنہیں آپ جگانا چاہتے تھے وہ مر گئے۔ ایک خوف میرے دل پر بیٹھنے لگا۔ میں نہیں جان سکتی تھی کہ یہ کیا خوف ہے۔ آپ شاید یہ

کے لئے مجھ پر یہ اصرام نہ لگائیں۔"

"پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" فہیم نے کہا۔ "اگر نہیں بتاؤ گی تو میں یہی سمجھوں گا کہ تمہیں میری زوجیت پسند نہیں۔ اس کا بھی ایک علاج ہے کہ ہم علیحدہ ہو جائیں۔"

یہ اسکی چوٹ تھی جو زریںہ برداشت نہ کر سکی۔

"مجھ پر کوئی ایسا اثر ہے جس نے میرے خون کو سرد اور میری زبان کو بند کر رکھا ہے۔" زریںہ نے کہا۔ "عورتیں کہا کرتی ہیں کہ دشمن کالے جادو کے تعویذ کرا دیتے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا ہو۔"

"مگر میری ای کا شک منجھ معلوم ہوتا ہے۔" فہیم نے کہا۔ "اگر یہی بات ہے تو یہ ان لوگوں کی کرکوت ہے جن کی بارات آ کر واپس چلی گئی تھی۔ انہوں نے یہ تو نہیں سوچا کہ ان کا لڑکا بیکار ہو گیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں لڑکی مل جائے۔ تم شاید یہ جانتی ہو گی کہ ہمارے شہر کے قریب ایک نقشہندی عامل ہے جو اس قسم کے کالے تعویذ بھی دیتا ہے اور ان کا توڑ بھی کرتا ہے۔ میں آج ہی ابو اور ای کو خط لکھتا ہوں کہ وہ اس عامل کے پاس جائیں اور وہ اس سے بات کریں۔"

اس عامل کا نام سن کر زریںہ گھبرا گئی۔ اُس نے فہیم سے کہا کہ اُس عامل کے پاس نہ جائیں۔ فہیم نے وجہ پوچھی تو زریںہ نے گول مول ہی وجہ بتا کر نالے کی کوشش کی فہیم غصہ نہ جاتی تھی۔ اُسے کچھ شک ہوا اور وہ زریںہ کے پیچھے پڑ گیا کہ اتنے مشہور اور قابل عامل سے وہ کیوں گھبراتی ہے۔

"یہی وہ راز ہے جو میں آپ سے چھپانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔" زریںہ نے کہا۔ "اور یہی راز مجھے اندر ہی اندر کھاتا رہا ہے۔ اب میں یہ راز آپ کے آگے رکھ دیتی ہوں اور میں اب محسوس کر لے گی ہوں کہ

تمہیں کام ہو جانے کے بعد بھی یہاں آنا پڑے گا اور جو جن تمہاری خواہش پوری کرے گا وہ ہو سکتا ہے تم سے اپنی کوئی خواہش پوری کرنا چاہے۔ اگر تم نہ آئیں تو یہ جن تمہیں نقصان پہنچائے گا لیکن میں پھر بھی عامل کے پاس نہ گئی۔ اُس نے ایک عورت کی زبانی پیغام بھیجا کہ تم نے جنات کے دربار میں اپنا پھیرا پورا نہیں کیا۔ یہ فوراً پورا کرو۔

فہیم نے زرینہ سے کہا کہ اُسے وہاں جانا چاہئے تھا۔ زرینہ نے اُسے بتایا کہ عورتوں سے پتہ چلا تھا کہ عورت کے معاملے میں اس عامل کی نیت ٹھیک نہیں ہوتی۔ زرینہ نے فہیم سے کہا کہ اُسے جس طریقے سے عامل نقشبندی نے کہا تھا کہ میں ایک بار اُس کے پاس آؤں، اس سے میں نے اُس کی نیت بھانپ لی تھی۔

"میں نے اس عورت سے کہا تھا کہ انہیں کہنا کہ میرا آنا اب مشکل ہو گیا ہے کیونکہ میری شادی ہو گئی ہے۔" زرینہ نے فہیم کو بتایا۔ "میں نے کہلا بھیجا تھا کہ آپ جتنے پیسے کہیں گے وہ میں بھیج دوں گی۔ عامل نے اپنے جن کو سامنے رکھ کر اپنی خواہش ظاہر کر دی اور اسی عورت کی زبانی کہلا بھیجا کہ تم نہیں آؤ گی تو میں تمہارے پہلے دولہا کے باپ کو بتا دوں گا کہ تم نے مجھ سے اُن کے لڑکے کو جان سے مردانے کے لئے لعویذ کر دائے تھے اور اس کے عوض تم نے مجھے اپنا جسم پیش کیا تھا۔ عامل نے یہ بھی کہا کہ میں تمہارے موجودہ سسرال تک بھی یہ بات پہنچا دوں گا اور میں یہ کام بھی کروں گا کہ جس جن نے تمہارا کام کیا ہے وہ تمہیں چین سے نہ بیٹھنے دے۔"

یہ دوسرا خوف یا وہم تھا جو زرینہ پر آسیب بن کر سوار ہو گیا۔ عامل نقشبندی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ساری عمر ماں نہیں بن سکے گی۔ زرینہ نے فہیم کو بتایا کہ اُسے یقین ہے کہ عامل نے اُسے اس حالت میں لانے کے لئے کوئی عمل کیا ہے۔ زرینہ نے یہ بھی کہا کہ اُس نے

سمجھتے رہے ہو گے کہ میں نے گھر اور نئی زندگی کی وجہ سے گھبرائی ہوئی ہوں.....

"دن کو عورتیں مجھے دیکھنے آتی رہیں۔ اس وقت میں میرا دل ٹھیک رہا لیکن رات کو پھر وہی حالت ہو گئی۔ آپ نے مجھے کہا کہ تم بہت ٹھیک ہوئی ہو اور میں بھی ٹھیک گیا ہوں، آج سو جاتے ہیں..... میں سو گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں اپنے پہلے دولہا کو دیکھنے ہسپتال جاتی ہوں۔ وہ لاش کی طرح بے ہوش بڑا ہے اور مجھے ایک آواز سنائی دی۔ اس شخص کو تم نے قتل کیا ہے۔ میں ڈر جاتی ہوں۔ پھر میرے دل میں یہی خیال بیٹھ جاتا ہے کہ اس آدمی کو میں نے عامل کے تعویذ سے قتل کیا ہے.....

"میری آنکھ کھلی تو دل کی گھبراہٹ سے میرا پسینہ نکل آیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ خوف کیسا ہے۔ جبکہ اُس آدمی کو میں پسند نہیں کرتی تھی جو میرا دولہا بن کر آیا تھا لیکن میں نے اُسے ساری عمر کے لئے ایک ٹانگ سے محروم کر دیا ہے۔ وہ مجھے زبردستی اٹھا کر اپنے گھر لے جانے نہیں آیا تھا۔ اُس نے میرا رشتہ زبردستی نہیں لیا تھا۔"

مختصر یہ کہ زرینہ کے ضمیر پر اس جرم کا بوجھ آ پڑا کہ اُس نے عامل نقشبندی سے کالے جادو کا ایسا سخت تعویذ لے کر اپنے پہلے دولہا کے راستے میں دبایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی۔ فہیم نے مان لیا کہ عامل نقشبندی کے علم اور عمل میں طاقت ہے لیکن اُس کے لئے زرینہ نے مسئلہ کھڑا کر دیا۔ فہیم نے زرینہ کا وہم دور کرنے کی بہت کوشش کی لیکن زرینہ کی حالت بہتر نہ ہو سکی۔

"پھر ایک اثر اور بھی ہے۔" زرینہ نے فہیم سے کہا۔ "میں یہ راز بھی آپ کو دے دوں تو بہتر ہو گا۔ آپ سے کچھ چھپا کر میں محسوس کرتی ہوں جیسے میں آپ کو اپنا نہیں سمجھتی..... بات یوں ہوئی تھی کہ عامل نے مجھے کہا تھا کہ انہں نے میرا کام کرنے کے لئے ایک جن مقرر کر دیا ہے۔ اُس نے مجھے بڑے عجیب طریقے سے کہا تھا کہ

پاکستان میں سچے  
بنانے کے بانی

**SA**

ESTD. 1936

ایس اے سچے



ایس اے - نیکو بکل انڈسٹریز - کمرات  
053 - 3515327, 3535045, 3533478

جذبات اتنے سرد ہو گئے ہیں کہ اُسے کبھی پوچھ نہیں ہوگا۔  
فہیم کے دل میں زرینہ کے خلاف جو غلط فہمی تھی وہ  
کل گئی۔ اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہو گئی لیکن فہیم بھی ڈر گیا  
کہ جس عامل نے ایک آدمی کو گھوڑی سے گرا کر پکار کر  
دیا ہے اُس نے زرینہ پر بھی کوئی عمل کر دیا ہوگا۔ اس نے  
ارادہ کیا کہ عامل نقشبندی کے پاس جائے اور اُسے کچھ  
نذرانہ پیش کرے لیکن اُس نے اس خیال سے ارادہ توڑ  
دیا کہ عامل یہ مطالبہ نہ کر بیٹھے کہ اپنی بیوی کو بھیجو۔

فہیم بہت پریشان ہوا۔ اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ  
مسلمان تھا۔ فہیم نے اُس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ ڈپٹی  
کمشنر کے دفتر کا یہ سپرنٹنڈنٹ جو کوئی رضوی صاحب تھا،  
فہم پڑا۔ کہنے لگا کہ بیشتر عامل نو سر باز ہوتے ہیں اور یہ  
عامل زرینہ کو بلیک میل کر رہا ہے۔

”لیکن اُس نے زرینہ کے پہلے دولہا کو گھوڑی  
سے گرا دیا تھا“۔ فہیم نے کہا۔ ”یہ اس کے تعویذ کا اثر  
تھا“۔

”کالے علم میں اس سے بھی زیادہ طاقت ہے۔“  
بوڑھے رضوی نے کہا۔ ”لیکن یہ نقشبندی جس طریقے  
سے تمہاری بیوی کے پیچھے پڑ گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا  
ہے کہ وہ کالے علم کا عامل تو ہے لیکن شریف آدمی نہیں۔  
کالا علم جاننے والے عموماً شریف نہیں ہوا کرتے۔“

فہیم نے اسے کہا کہ اُس کا مسئلہ ہاتھوں سے حل  
نہیں ہوگا۔ وہ تو پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ورنہ اُس کی  
اتنی اچھی بیوی کی وٹنی حالت بگڑتی چلی جائے گی اور وہ  
پاگل ہو جائے گی۔

ڈپٹی کمشنر کا دفتر ضلع میں سب سے بڑا دفتر ہوتا  
ہے۔ پولیس بھی اس کے تحت ہوا کرتی تھی۔ اُس وقت  
ڈپٹی کمشنر انگریز ہوا کرتا تھا۔ وہ ضلع کا بادشاہ ہوتا تھا۔  
رضوی نے فہیم سے کہا کہ وہ کسی ٹھکانہ آدمی سے معلوم  
کرائے گا کہ یہ عامل ہے کون۔

ہی گزرے تھے کہ رضوی نے فہیم کو اپنے دفتر میں بلا کر خوشخبری سنائی کہ عامل نقشبندی ایک آدمی کو قتل کر کے خود ہی ریوالور سمیت ہمارے ضلع کے ایس پی صاحب کے پاس پہنچ گیا ہے۔

”میں اصل بات تو بعد میں سنوں گا۔“ فہیم نے کہا۔ ”وہ ریاست میں واردات کر کے ہمارے ضلع میں کیوں آ گیا ہے؟“

”مجھے ابھی پوری بات کا پتہ نہیں چلا۔“ رضوی نے کہا۔ ”اتنا ہی پتہ چلا ہے کہ وہ جھانسی جیل کا پرانا مفرور تھا۔ شام تک پوری بات کا پتہ چل جائے گا۔ اپنی بیوی کو بتا دینا کہ جس عامل کا خوف اُس نے اپنے ذہن پر سوار کر رکھا تھا وہ مفرور قاتل تھا اور اب اُس نے قتل کی ایک اور واردات کی ہے اور خود ہی پولیس کے پاس آ گیا ہے۔ اپنی بیوی سے کہنا کہ اُس کے پاس اگر کوئی اتنا طاقت ور علم تھا تو وہ اس واردات کو ہضم کیوں نہ کر گیا اور یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ جو آدمی دعوئی کرتا ہے کہ وہ اپنے کالے علم کے ذریعے جسے چاہے جان سے مار سکتا ہے، اس نے ریوالور سے کیوں قتل کیا؟“

فہیم نے رضوی سے پوچھا کہ پہلے دولہا کا گھوڑی سے گرنا اور اس کی جگہ میرا دولہا بن کر آنا اس عامل کا کرشمہ نہیں تھا؟ رضوی نے اُسے بتایا کہ یہ محض اتفاقات ہوتے ہیں اور بعض اتفاقات معجزے کی طرح لگتے ہیں۔ لوگ چونکہ سمجھ نہیں سکتے کہ ایسے کیوں ہوا اس لئے وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کسی نے اپنے علم کے زور سے معجزہ کر دکھایا ہے۔ ان ہیروں کا عالموں اور ہندوؤں کے منیاسیوں اور سادھوؤں کا کاروبار ایسے ہی اتفاقات پر چلتا ہے۔

چار پانچ روز بعد عامل نقشبندی اور ایک جوان لڑکی کا اقبالی بیان رضوی کے سامنے آیا۔ فہیم اور زرینہ کے لئے یہ معجزہ اس طرح رونما ہوا کہ جب زرینہ ایک وہم

تیسرے چوتھے روز سپرنٹنڈنٹ نے فہیم کو بتایا کہ اُس نے ایک بڑا ذہین اور تجربہ کار مجسٹریٹ کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ یہ مجسٹریٹ کے بہرہ میں اپنا ایک مسئلہ لے کر عامل کے پاس گیا۔ مجسٹریٹ نے آ کر بتایا کہ یہ نقشبندی کا لالچ جاتا ہو گا لیکن وہ ٹھیک آدمی علوم نہیں ہوتا۔ مجسٹریٹ نے عامل کے دو خاص مریدوں یا کارندوں میں ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو عادی مجرم اور مزایافتہ تھا۔ اس آدمی نے وارنٹی منسوخ اور سر کے بال بڑھا رکھے تھے اور سر کے بالوں پر سادھوؤں کی طرح راکھ اور مٹی ڈال رکھی تھی۔ عامل کے متعلق اُس نے بتایا کہ اپنی اصطلاحوں میں بات کرنا تھا جو اس مجسٹریٹ نے اکثر عاملوں کی زبان سے سنی تھیں۔

سپرنٹنڈنٹ نے فہیم سے کہا کہ یہ عامل اگر ضلع میں کسی جگہ ہوتا تو اُس کے متعلق مزید جاسوسی کرا کے اگر اسے نہیں تو اس کے خاص کارندوں کو ہاتھ میں لے کر باقاعدہ تعقیب کرائی جاسکتی تھی مگر وہ ریاست کی حدود میں ہے۔ وہاں صرف اُس ملزم کو پکڑا جاسکتا ہے جس کے خلاف قابل یقین شہادت مل چکی ہو۔

ادھر زرینہ کی حالت سدھرنے کی بجائے بگڑتی گئی۔ اسی سپرنٹنڈنٹ رضوی صاحب نے فہیم کو بہت ہی پریشان دیکھ کر کہا کہ اتنا مت ڈرو۔ اللہ کے کلام سے بڑھ کر اور کوئی تعویذ نہیں تم اپنے گھر میں ختم قرآن کرو اور دو لیکن سپارے پڑھنے کے لئے مولویوں اور اُن کے شاگردوں کو نہ بلانا۔ وہ پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ کے کلام کی توہین کرتے ہیں۔ تم میان بیوی خود قرآن کریم پڑھو۔ رضوی نے انہیں بتایا کہ رات کو سوتے وقت تم دونوں ”یا رحیم یا کریم“ ایک سو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

دونوں نے اگلے ہی روز قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا اور رات کو یہ وظیفہ بھی پڑھنے لگے۔ ابھی دس روز

R.T.M 121987

MASTER

گاسٹر

موٹر سائیکل میپس

مونیٹنگ سسٹم

مونیٹنگ سسٹم

کلیکس آباد

جی۔ بی۔ روڈ گوجرانوالہ

055-3252468

055-3483695

اور ایک خوف کے کنبے میں آئی ہوئی اندر ہی اندر مگھلتی جا رہی تھی، اس وقت ایک روز اس عامل کے پاس ایک نوجوان لڑکی آئی۔ اس لڑکی کو دراصل عامل کے ایک خاص کارندے نے عامل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اُس نے عامل سے کہا تھا کہ تمہارے لئے ایک ایسا تحفہ لایا ہوں جو تم نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ کارندے نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس تحفے کا ذائقہ چکھ لیا ہے اور اب تم بھی پیش سوچ کر لو۔

یہ تحفہ ایک نوجوان لڑکی تھی جس نے اس عامل کی شہرت اور اس کے کرشمے سن رکھے تھے۔ وہ دیہات کی دو تین عورتوں کے ساتھ آئی تھی۔ عامل کے کارندے نے اس لڑکی کو دیکھا تو اُسے الگ لے گیا۔ اس پر اپنی زبان کا جادو چلایا اور بتایا کہ عامل کسی کسی خوش قسمت کی مراد پوری کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ لڑکی کو اپنے جال میں پھانس کر اُس نے بے آبرو کیا اور اُسے یقین دلایا کہ اب تم جو چاہو گی وہ عامل نقشہ بندی کر دے گا۔

عامل نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ وہ جیل سے بھاگا ہوا قاتل ہے، اُس نے جہانسی جیل کا نام لیا۔ یہ چندہ سولہ سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اُسے عمر قید کی سزا ملی تھی۔ ایک روز وہ جیل کے دفتر میں جسے ڈیوڑھی کہتے ہیں کھڑا تھا۔ اُسے کسی سرکاری سلسلے میں بلایا گیا تھا۔ اسنے میں جیل کا بڑا گیٹ راشن والی دہلیز ریڑھی کے لئے پورے کا پورا کھول دیا گیا۔ عامل نے جو اُس وقت عامل نہیں تھا، دروازہ کھلا دیکھا تو جوں ہی ریڑھی اندر آئی تو وہ تیر کی طرح دروازے سے باہر نکلا اور دقتا تیز دوڑا کہ تعاقب سے پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جہانسی کے قریب ہی سے گنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ اس جنگل میں درختوں سے ڈھکی بیٹھا چٹانیں تھیں جہاں کسی کا تعاقب بہت مشکل ہوتا تھا۔ رات کے وقت تو اس جنگل میں کوئی بھولے سے بھی نہیں پھٹکتا تھا کیونکہ وہاں دھاری دار شیر

اور بھیڑیے گھومتے پھرتے رہتے تھے۔

عادل جیل اور پولیس کے لئے چھلواہ بن گیا پھر وہ سولہ سال گزر گئے لیکن اس کا نام و نشان نہ ملا۔ اس نے اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ جیسا عادل وہ بن چکا تھا ویسا ہی ایک عادل اسے فرار کے تیسرے سال مل گیا۔ اُسے ایسے آدمیوں کی ضرورت رہتی تھی جو جرائم پیشہ یا مفرور ہوں اور اُس کی کرامات کا پروپیگنڈہ ایسے طریقے سے کریں کہ لوگ اُس کے جال میں پھنس جائیں۔ یہ مفرور قاتل اس کی شاگردی میں بیٹھ گیا اور نو سربازوں کے ڈھنگ سیکھ لئے۔ اُس نے داڑھی مونچھیں اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھائے اور عاملوں کی اصطلاحیں اور لہجہ کاری بھی سیکھ لی تھی۔ اُس نے اس واقعہ کے سلسلے آٹھ سال پہلے یہاں آن ڈیرہ بھایا اور اپنے استاد کی طرح دو چار جرائم پیشہ اپنے ساتھ ملا لئے۔

بھارت ہو یا پاکستان، لوگ اپنے مسائل اور حالات سے اس قدر مجبور ہوتے ہیں کہ نیکی سہادوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جہاں انہیں کسی نئے پیر فقیر یا کسی شاہ صاحب یا عامل کا پتہ ملتا ہے وہ آٹھ دوڑتے اور اُس کے قدموں میں جا گرتے ہیں۔ یہ بھٹکے ہوئے اور فریب خوردہ لوگ اس نئے عامل کے ذریعے پر پہنچنے لگے۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ اس شخص کا فراڈ اور اس کی نو سربازی کن ذرائع سے اور کن طریقوں سے کامیاب ہوتی رہی۔ بعض لوگوں کی مرادیں اتفاقہ پوری ہو گئیں تو اسے بھی انہوں نے اسی عامل کا کرشمہ سمجھا اور اُس کا خوب پرچار کیا۔ اس طرح ایک مفرور قاتل عادل نقشبندی بن گیا۔

اس شخص نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اُس کے ایک کارندے نے ایک جوان لڑکی جس کی عمر انیس بیس سال تھی اُس کے سامنے بٹھا دی۔ اس کے محتفل کارندے نے عامل کو پہلے کہا تھا کہ ایک تھوڑا پیش کر رہا

ہوں جس کا وہ ذائقہ چمک چکا ہے۔ عامل اُس وقت تک ایسی کئی لڑکیوں اور جوان عورتوں کے ساتھ کھل کھیل چکا تھا لیکن یہ لڑکی اُسے اتنی پیاری لگی کہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے خواہ پوری بتائے یا داشتہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ لڑکی غیر شادی شدہ تھی۔

عادل نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس کے پاس کیوں آئی ہے؟

”میں اپنے باپ کی تلاش میں آئی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔

”کیا تمہارا باپ لاپتہ ہو گیا ہے؟“

”ہاں یہ ہے کہ میرا باپ قتل کے جرم میں گرفتار ہوا تھا۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اُسے عمر قید سزا ہوئی تھی۔ ایک روز پولیس نے ہمارے گھر میں داخل ہو کر سارے گھر کی تلاشی لی اور میری ماں کو تھانے لے جا کر مارا چٹا۔ ہمیں بتایا گیا کہ میرا باپ جھانسی جیل سے بھاگ گیا ہے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”میں اُس وقت پانچ تھی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میری عمر پانچ چھ سال تھی۔ مجھے قتل کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔“

”تمہارے باپ نے کسے قتل کیا تھا؟“

”وہ جنگل کے ٹھکے کا ملازم تھا۔“

”اُس کا نام کیا تھا؟“

”کریم الدین۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”اُسے کا مادا کا کہتے تھے۔“

عادل کو بڑی زور کا دھچکا لگا۔ اُس نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پوچھا۔ ”وہ جنگل کے ڈاک بنگلے کا چوکیدار تھا؟“

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہمیں کیا معلوم نہیں۔“ عادل نے کہا۔ ”کہو تو

رات کو ڈاک بنگلے میں گئی۔ میرا باپ وہاں ڈیوٹی پر تھا اس نے اس عورت سے کہا کہ وہ واپس چلی جائے۔ عورت رو پڑی اور بولی کہ صاحب کا حکم نہ مانا تو کہاں جائیں گے؟ وہ روتی ہوئی ڈاک بنگلے میں صاحب کے کمرے میں چلی گئی۔ صاحب اپنے آپ کو جنگل کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند نہ کیا۔ اس نے سب سے پہلے عورت کو شراب پلائی۔ جب صاحب نشے کی حالت میں اس عورت کے ساتھ بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا تو میرا باپ اندر چلا گیا۔ اس کے پاس بنگلے کی دی ہوئی راتفل گئی اس نے صاحب کو گولی مار دی لیکن بھاگا نہیں وہیں بیٹھا رہا۔ آدمی رات کے بعد دوسرے ملازموں کی اطلاع پر پولیس آئی اور وہ پکڑا گیا۔ میرا باپ جتنا غیرت مند تھا، میں اور میری ماں اتنے عیاں بے غیرت ہو گئے ہیں۔

کریم الدین اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کارندے کو آواز دی۔ کارندہ آیا تو کاہنے نے اس سے پوچھا کہ یہ ہے وہ شخص جس کا تم نے ذائقہ چکھا ہے؟ اس جرم پیشہ کارندے نے مستانہ سے لہجے میں جواب دیا کہ ہاں یہی وہ شخص ہے۔ کاہنے نے اپنے جفن کے اندر ہاتھ ڈالا اور پورا نورنگال کر اس کارندے کو نیچے بعد دیگ سے دو گولیاں مار دیں۔ لڑکی کی چیخ نکل گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر باہر کو بھاگی۔ کاہنے نے لپک کر اسے پکڑ لیا، لڑکی نے جھانا شروع کر دیا۔

”ظہر جا لڑکی!“ کریم الدین نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ ”میں ہوں تمہارا وہ باپ جسے تم ڈھونڈ رہی ہو۔“

اس نے اپنی بیوی کا، اس کے باپ کا اور اپنے گاؤں کا نام لیا۔

لڑکی کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ خشک کھاکر مر پڑے گی۔ کریم الدین عرف کاہنے نے اُسے اپنے

تمہارے گھر کی ساری باتیں بتا دوں۔“

”آپ کچھ بھی نہ بتائیں۔“ لڑکی نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور حال کا ہاتھ چوم کر بولی۔ ”آپ مجھے یہ بتا دیں کہ میرا باپ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اگر زندہ ہے تو بتا دیں کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بھی بتائیں کہ میں اور میری ماں اس تک پہنچ سکتی ہیں یا نہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ آپ نے مجھ سے نقد نذرانہ مانگا تو شاید میں پوری رقم نہ دے سکوں۔ ہم ماں بیٹی بہت غریب ہیں۔ مجھے اپنی لوٹ پوٹی سمجھ لیں، آپ کا ہر حکم بجالاؤں گی۔“

عالم نقشبندی جو دراصل کریم الدین عرف کا ہاتھ، تڑپ اٹھا۔ اس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اُسے یاد آ گیا کہ اس کے ایک خاص کارندے نے کہا تھا کہ وہ اس شخص کا ذائقہ چکھا ہے۔

”مجھے سچ بتاؤ لڑکی!“ کاہنے نے لڑکی سے پوچھا۔

”میرے جس آدمی نے تمہیں مجھ تک پہنچایا ہے، اس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟“

”اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”آپ نہیں جانتے کہ میں اور میری ماں کس طرح زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میری ماں ایک بڑے گھر میں نوکرائی ہے۔ کبھی کبھی مجھے بھی اس گھر سے بلاوا آتا ہے اور مجھے اس گھر کے بڑے بیٹے کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اسی لئے میں اپنے باپ کی تلاش میں نکلی ہوں۔ وہ کہیں مل جائے تو ہماری عزت کا محافظ بنے۔ میرا باپ بد معاش چور یا ڈاکو نہیں تھا۔ اس نے جنگل کے ایک ہندوستانی افسر کو اس لئے قتل کیا تھا کہ اس افسر نے جنگل کے ملازم کی جوانی بیوی کو حکم دیا تھا کہ وہ ڈاک بنگلے میں اس کے پاس آئے۔ اس کا خاوند نوکری سے جواب ملنے کے ڈر سے چپ رہا۔ میرے باپ کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ اس ملازم کی بیوی

کیا۔

”ابھی طرح دیکھ لو بیٹی!“ رضوی نے زریںہ سے کہا۔ ”کیا یہی تھا وہ عامل؟“

زریںہ نے سر ہلا دیا کہ یہی تھا۔

”اسے کہو کہ اس کے ہاتھ میں کسی اٹنے سیدھے علم کی طاقت ہے تو اس جھکڑی کو توڑ دے۔“ رضوی نے زریںہ سے کہا کہ کریم الدین عرف کا مانس پڑا اور بولا۔

”میرا کھیل ختم ہے۔“

رضوی زریںہ اور فہیم کو واپس لے آیا اور زریںہ کو بتایا کہ یہ کیا لوسر بازی تھی اور یہ بھی کہا کہ قرآن حکیم اور ’یار جیم یا کریم‘ کا کرشمہ تم نے دیکھ لیا ہے۔ اس روز سے زریںہ اپنی اصلی حالت میں واپس آنے لگی اور چند روز بعد وہ بالکل نارمل ہو گئی۔

مقدمے کی سماعت روز بروز ہوتی رہی اور بھوپال کے دیہاتیوں کے عامل تشددی کو سزائے موت کی بجائے عمر قید دی گئی لیکن اُسے پہلی عمر قید کی سزا جس سے وہ فرار ہوا تھا پہلے پوری کرنی تھی اس کے بعد دوسری عمر قید کی سزا کو شروع ہونا تھا۔ فرار کی سزا جو آٹھ سال تھی وہ الگ تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی یہ ہوئی کہ فیصلے میں لکھا گیا کہ یہ سب سزائیں ایک دوسری کے بعد پوری کی جائیں گی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کو باقی عمر جیل میں گزارنی تھی۔

اور جب میں نامہ جیل میں جاسوسی کے الزام میں بند تھا وہ عامل تشددی جس کا نام کریم الدین عرف کا تھا، نامہ جیل میں قادی صاحب کہلاتا تھا اور جیل کا تمام عملہ اور قیدی اُس کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ میرے ساتھ پہلی ملاقات میں اُس نے مجھے کہا تھا کہ رات سونے سے پہلے ’یار جیم یا کریم‘ ایک سو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔



ساتھ لیا۔ ریو اور اپنے چنے میں ڈالا اور بھوپال شہر میں آ گیا۔ اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ بھوپال سے وہ گاڑی میں بیٹھا اور اس شہر میں پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اُس نے غیرت کے جوش میں آ کر ایک ایسی عورت کی عزت کے پیچھے جو اُس کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی اپنے جھگے کے ایک انسر کو مار ڈالا تھا۔ یہ تو اس کی اپنی بیٹی تھی۔ میں نے پہلے تو یہ ارادہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو بھی گولی مار لوں کیونکہ اپنی بیوی اور جوان بیٹی کی ذلت اور رسوائی کا مجرم میں ہی تھا لیکن مجھے ایک خیال آ گیا کہ گورنمنٹ نے میری گرفتاری کے لئے دس ہزار روپیہ انعام مقرر کیا تھا۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے میری بیٹی نے گرفتار کروایا ہے۔ میں تو پھانسی کے تختے پر جا رہا ہوں۔ انیس دس ہزار مل جاتے ہیں تو میری بیوی میری بیٹی کو کہیں بیاہ دے گی اور ان کا کچھ سہارا بن جائے گا۔“

اُس زمانے کا دس ہزار روپیہ آج کے سو لاکھ کے برابر تھا۔ ایس بی انگریز تھا اسے کا مے اور اس کی بیٹی پر ایسا ترس آیا کہ اُس نے کانڈوں میں کا مے کی گرفتاری اس طرح لکھوائی جیسے کا مے نے اپنے آدمی کو قتل کیا اور اپنے گاؤں چلا گیا اور اس کی بیٹی نے پولیس کو رپورٹ کر کے اسے گرفتار کروادیا۔ اس طرح اس کی بیٹی کو دس ہزار روپے انعام کا حقدار قرار دے دیا۔

جب کا مے کا کیس کورٹ میں چلا تو ایک پیشی پر رضوی نے فہیم سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے آئے۔ فہیم بیوی کو ساتھ لے گیا۔ رضوی ڈی سی آفس کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ پولیس پر اُس کا حکم چلتا تھا۔ وہ فہیم اور زریںہ کو اپنے ساتھ کورٹ میں لے گیا۔ کریم الدین جھکڑیوں میں وہاں بمآدمے میں دو کاشیلوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ رضوی نے زریںہ کو اُس کے سامنے اکھڑا

## شخصیات

## خوش تر اوصاف شخصیت

حاجی محمد رمضان چشتی نے عوام کے لئے صاف پانی کے دو پلانٹ لگوائے

☆ ..... ابو خالد الحاج محمد رفیع ہاشمی جھیری

ہر ذی شعور انسان کا یہ مکمل ایمان ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا بلکہ دائم کا تو یقین کامل ہے کہ اللہ ابد تک تو کیا بلکہ ہمیشہ رہے گا۔ ابد تک کہہ کر اس کا قائم رہنا تو محدود ہو جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تو لامحدود ہے اور وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ اللہ کریم 6 ہیم میں پوری کائنات کو بنا کر اپنے تخت پر جلوہ گر ہوا۔ قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 30 اور سورہ حجر کی آیت نمبر 29 سے ہمیں آگاہی ملتی ہے کہ جب اللہ کریم نے دنیا آباد کرنا چاہی تو فرشتوں کو اکٹھا کر کے فرمایا ”الہی جاعل فی الارض خلیفۃ“ کہ میں (یعنی اللہ پاک) زمین میں انسان کو اپنا نائب مقرر کرنا چاہتا ہوں۔

رأثم تو خلیفہ کا ترجمہ نائب کی بجائے نمائندہ کرتا ہے کیونکہ نائب سے کچھ اور مطلب بھی نکل سکتا ہے۔ تو فرشتوں نے عرض کی کہ اے اللہ کیا ہم تیری پاکی بیان کرنے کے لئے کافی نہیں؟ انسان تو زمین میں فساد پدا کرے گا (آیت نمبر 30 سورۃ البقرہ)۔ اگر آج کل کی دہشت گردی، بم دھماکوں، خود کش حملوں، ٹارگٹ کلنگ میں خوریزی کے تناظر میں دیکھا جائے تو راقم کروڑ بار اپنے رب سے معافی طلب کرتے ہوئے یہ کہنے کی

جسارت کرتا ہے کہ فرشتوں کے تعظیلات بھی غلط نہ تھے۔ اللہ پاک نے فرشتوں سے فرمایا انہی اعلم مالا تعلمون کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (آیت نمبر 30 سورۃ البقرہ)۔ فرشتوں نے عرض کی کہ اے اللہ بیشک تو بہتر جانتا ہے ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں علم عطا کیا ہے۔ (آیت نمبر 32 سورۃ البقرہ)

خدائے ذوالجلال نے آخر حضرت آدم علیہ السلام کو آب و خاک سے تخلیق فرمایا اور اس سے قبل اللہ پاک نے جنات کو آگ کی لوت سے پیدا کیا۔ جیسا کہ سورۃ الرحمن کی آیت نمبر 15 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وخلق الجنان مین مارج من نار جب اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کے پتے میں روح پھونکی تو راقم کو یقین ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے حالت نزیت میں آگئے ہوں گے۔ جب اللہ کریم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا مگر ابلیس نے جس کا آسمانوں پر نام عزرائیل تھا، حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ ایک طرف تو فرمان الہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کریم

السلام کو سجدہ نہ کرنے کے اپنی حکم عدولی کی وجہ پہنچی تو اس نے جواب دیا کہ مجھے ٹوٹنے آگ سے پیدا کیا جبکہ آدم کو مٹی، گارے سے۔ میں اس سے اٹلی ہوں میں اپنے سے کمتر کو سجدہ کیوں کروں۔ سورہ حجر آیت نمبر 33 جیسا کہ قرآن کریم کی سورہ طہ کی آیت نمبر 118 میں بیان ہے کہ اس پر اللہ کریم نے اسے ملعون قرار دیتے ہوئے حکم دیا کہ تم رانڈہ درگاہ ہو اور نکل جاؤ عرش معلیٰ سے۔ سورہ حجر آیت نمبر 34 میں اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو اور جو چاہو کھاؤ پو کر ایک درخت کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے منع فرمایا (القرآن آیت نمبر 35 البقرہ)۔ شیطان کو عرش معلیٰ سے ملعون قرار دے کر نکالنا اور حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کریم کی جانب سے جنت عطا کرنا شیطان کو کھٹکنے لگا اور یہی بات اس کی حضرت آدم علیہ السلام سے دشمنی کا سبب بنی۔ اسی حسد کی وجہ سے وہ اس کوشش میں لگا رہا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوائے اور آخر کار (سورہ طہ آیات نمبر 116 تا 120) اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے بہکاوے میں پھنسا لیا تو ان سے شجر ممنوعہ کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے کا سہو ہو گیا جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کریم کے حکم کے تحت جنت سے لگنا پڑا۔ انتظار بسیار کے بعد جب حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت محمد کا وادہ دے کر اپنے سہو کی معافی چاہی تو اللہ کریم کو اپنے بندے پر رحم آگیا اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی اسے یہ دعا ”رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا وَلَنْ نَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ“ (القرآن) سکھا کر حضرت آدم علیہ السلام کو معاف فرما دیا (سورہ طہ آیت نمبر 122)۔

آغاز سے لے کر اب تک راقم نے اللہ کریم کے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنانے کا ارادہ فرشتوں سے

خود ہی اپنے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا حکم دے کیونکہ قرآن پاک ہمیں بتاتا ہے کہ لا تہدیٰ لکلمت اللہ یعنی اللہ کریم کے احکامات تبدیل نہیں ہو سکتے (سورہ یونس آیت نمبر 64) بہت سے حضرات نے دیکھا ہو گا کہ جب سار سونے کے زیور میں کچھ بہتری لانے کے لئے ایک موم بتی جلا کر ایک پھونکنی سے جس کا ایک سر انہایت باریک اور دوسرا سراسر اقدارے بڑا منہ سے لگا کر باریک حصہ جلتی ہوئی موم بتی کے شعلے میں رکھ کر پھونک مارتا ہے تو اس شعلے سے آگ نکل کر سونے کے زیور پر پڑتی ہے تو وہ چمک اٹھتا ہے۔ یہ مسئلہ حقیقت ہے کہ اللہ کریم نور ہے۔ جب اللہ پاک نے اپنے نور مبارک سے حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں روح پھونکی ہوگی تو اللہ کریم کا ذاتی نور مبارک حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں داخل ہو گیا۔ جہاں تک راقم کی فہم و فراست کام کرتی ہے اللہ کریم کا حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی سے بنے پتلے کو سجدہ کرانا مقصود نہ ہو گا بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے اس ذاتی نور مبارک کو کرنا تھا جو خدائے ذوالجلال کے نور پاک سے نکل کر حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں داخل ہوا مگر مغرور ابلیس اس راز کو نہ سمجھ سکا اور اس نے تکبر کیا۔

اگر انسانوں اور جنات کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کیا جائے تو انسانوں کو مٹی اور پانی سے تخلیق کیا گیا اور جنات کو آگ کے شعلے سے تو یہ بات عیاں ہوگئی کہ جب آگ جلائی جائے تو اس کا شعلہ اوپر کو سر اٹھاتا ہے جو غرور اور تکبر کی نشانی ہے لیکن مٹی جب بھی گرتی ہے تو وہ نیچے کی جانب آتی ہے جو کہ عاجزی اور انکساری کا مظہر ہے۔ مٹی کو خواہ اوپر کی جانب ہی کیوں نہ اچھالا جائے تو وہ پھر بھی نیچے کی طرف ہی گرے گی جیسے کہ مٹی سے بنا انسان اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے۔

جب اللہ کریم نے ابلیس سے حضرت آدم علیہ

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں

مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب

## ریمینال شربت

تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارضات  
مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا  
نہ آنا، کثرت ریح، سانس کا پھولنا، تیزابیت  
معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا  
ہونے والے امراض کے لیے مفید ہے۔

اپنے قریبی دوا فروش سے طلب فرمائیں

نوٹ

تبخیر معدہ ددگیر امراض کے طبی مشورے کے لئے



ممتاز مطب

سے رابطہ فرمائیں

ممتاز دوا خانہ (رجسٹرڈ) میانوالی

فون: 233817-234816

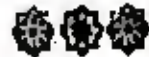
اس پر تحفقات کا اظہار، آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں  
کو آدم کو سجدہ کرنے کا اللہ کا حکم، شیطان کی نافرمانی اور  
راندہ درگاہ ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے اور اجزائے ترکیبی  
کے لحاظ سے انسانوں کا جنات سے خصائل کا موازنہ کیا  
ہے۔ بیشک اللہ کریم نے انسان کو بہترین شکل شبابت  
میں پیدا کیا اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اللہ کریم کی  
اس بہترین تخلیق کا کسی اور مخلوق سے موازنہ بننا ہی نہیں۔  
اللہ کریم نے انسانوں ہی میں سے انبیاء و رسل مبعوث  
فرمائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے  
"لَکَ الرِّسَالُ لَفَضْلًا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ" یعنی  
انبیاء و رسل میں بھی بعض کو کچھ معاملات میں بعض پر  
فضیلت عطا فرمائی۔

اسی طرح انسانوں میں بھی کچھ کو بہترین اوصاف  
عطا فرمائے جو کہ باوجود خوشحالی اور بہتر حالات کے اپنے  
رب کے احسانات نہیں بھولے اور وہ اپنے رب سے  
ڈرتے اور شکر گزار بندے بنے رہے۔ ان خوشتر اوصاف  
لوگوں میں سے ایک جن سے راقم کے تعلقات تقریباً دو  
دہائیوں پر محیط ہیں وہ نہایت ہی محترم شخصیت ہے۔ حاجی  
محمد رمضان چشتی جن کو اللہ کریم نے نہایت اعلیٰ القدر سے  
نوازا ہے جو کہ سبیل مالک، پوش علاقے میں ایک اچھے  
گھر اور دیگر سہولیات کے مالک ہونے کے باوجود نہایت  
مٹے ہوئے، انکساری کے پیکر اور درویش منش انسان  
ہیں۔ ان کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ یہ  
ایک نہایت خوش الحان نعت خواں اور ایک بہت ہی مشہور  
نعت گو اور نعت خواں جناب عبدالرشید چشتی صاحب کے  
فرزند ہیں۔ رواداری، صلہ رحمی، خلق خدا کی خدمت،  
ہمدردی اور غمخواری ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ شہر کے  
چچ جونہر گزرتی ہے اس میں کبھی کبھار کاریں وغیرہ گر جاتی  
تھیں جس سے جانی نقصان بھی ہو جاتا تھا، حاجی صاحب  
نے ان حادثات سے بچاؤ کے لئے نہر کے پستوں پر آہنی

ہے۔ پوچھنا تم کون ہو اور کیا کر رہے ہو۔ جواب دیا کہ میں فرشتہ ہوں اور فہرست بنا رہا ہوں۔ پوچھا کن لوگوں کی فہرست بنا رہے ہو۔ کہا کہ ان لوگوں کی جو اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ پوچھا کیا میرا نام ہے تو فرشتے نے جواب دیا کہ نہیں اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد پھر حضرت ابو بن اوسؓ نے ایسا ہی مظر دیکھا کہ کوئی ان کے کمرے میں موجود کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کون ہو جواب ملا کہ فرشتہ۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ کہا کہ فہرست بنا رہا ہوں ان لوگوں کی جو اللہ کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں تو اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ پوچھا کیا میرا نام ہے تو فرشتے نے جواب دیا کہ آپ کا نام سر فہرست ہے اور چلا گیا۔ تو ثابت ہوا کہ خلق خدا کی خدمت کر کے بندہ اللہ کی محبت حاصل کر لیتا ہے جو کہ کتنے اعزاز کی بات ہے اور یہ کتاب الایمان ہے۔

راقم کوئی درباری قصیدہ گو یا چاہوں انسان نہیں ہے۔ اگر اللہ کریم نے کسی انسان کو اوصاف حسنہ سے نوازا ہو تو انہیں اجاگر کرنا اور بیان کرنا اور تعریف کرنا کوئی معیوب بات نہیں بلکہ یہ تو اوصاف حسنہ عطا کرنے والے خالق اور مالک کی ہی تعریف ہے۔ اس تحریر سے راقم کی منشاء صرف یہی ہے کہ دیگر اہل ثروت صاحبان بھی حاجی رمضان صاحب کی تقلید کرتے ہوئے مخلوق خدا کی خدمت کے لئے میدان میں آئیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ میں اکیلا نکلا تھا لوگ ملتے گئے کارواں بن گیا۔ اس طرح مجبور اور ضرورت مند بندگان خدا کے آلام و مصائب ختم ہو جائیں تو ہمارا ملک جنت ارضی بن جائے گا۔ آمین!

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو  
ورنہ طاعت کے لئے کچھ تم نہ تھے کردیاں



جگے لگائے۔ چنگ بازی کے باعث بچوں اور بڑوں کی ہلاکتیں ان کے لئے سوہنا روع تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر چنگ بازی اور کیمیکل ڈور کے خلاف آواز اٹھائی اور اس پر پابندی کے لئے تحریک چلائی جس کے لئے وہ ہائی کورٹ تک پہنچے۔ اس تحریک میں راقم نے بھی کچھ حد تک حصہ لیا۔ کچھ لوگ حوام الناس کے علاج معالجہ کے لئے ہسپتال بنا رہے تھے لیکن حاجی رمضان صاحب سوچتے اور چاہتے تھے کہ کچھ ایسا کام کیا جائے کہ لوگ بیمار ہی نہ ہوں۔

آلودہ پانی پینے سے لوگوں کا مہلک بیماریوں میں مبتلا ہونا جن میں خصوصاً ہیپاٹائٹس شامل ہے، ان کو بے چین کر دیتا جس کے تدارک کے لئے انہوں نے ٹھان لی۔ سب سے پہلے بادامی باغ میں فلٹرڈ منرل واٹر کا پلانٹ لگا کر لوگوں کے لئے فی سیکل اللہ پانی مہیا کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ جن لوگوں کے پاس کین نہ تھے انہیں کین بھی بلا قیمت فی سیکل اللہ مہیا کئے۔ حاجی صاحب کے ایک شاغ مہر قاری محمد سعید خان صاحب نے جوڑے پل کے قریب کی آبادیوں میں بھی آلودہ پانی کی وجہ سے لوگوں کی زبوں حالی کا رونا رويا تو حاجی صاحب نے وہاں پر بھی ایک فلٹرڈ منرل واٹر پلانٹ لگا دیا اور لوگوں کی بے حد دعائیں لے رہے ہیں۔

حاجی صاحب نعت خوانی کا کوئی نذرانہ وغیرہ نہیں لیتے نہ صرف تمام رفاہی کاموں میں کسی سے چندہ وغیرہ بھی اکٹھا نہیں کرتے بلکہ منرل واٹر پلانٹ بھی لاکھوں روپے اپنی جیب سے خرچ کر کے لگوائے ہیں۔ ابو بن اوسؓ کے بارے میں زمانہ طالب علمی میں پڑھی ہوئی انگریزی نظم کی یاد راقم کے ذہن میں چل رہی ہے۔ حضرت ابو بن اوسؓ ایک اللہ والے بزرگ گزرے ہیں لیکن خلق خدا کی خدمت ان کا شعار تھا۔ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ کوئی ان کے بید روم میں بیٹھا کچھ لکھ رہا

## گپ کا گھاٹ

”سبھا یقین کرو میں تمہارے ساتھ ضرور نکاح کر لیتا۔“  
ایک دن زمان خان نے کہا۔ ”لیکن میری کچھ عجوبری ہے کہ  
میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میری اولاد جوان ہے۔“

عبداللطیف بھٹو



نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ آئندہ تم مجھے اس قسم کی فضول باتیں مت سنایا کرو۔

”میرے مرتاج ایک نہ ایک دن تم ضرور پہچتاؤ گے۔“ عارف رضا کی سعادت مند بیوی اپنے خاوند کی الٹی سیدھی اور بے تکی قسم کی باتیں سن کر کہتی۔ ”اور اس وقت تمہیں میری باتیں ضرور یاد آئیں گی۔ یاد رکھو، وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اگر آج اچھے دن ہیں تو کل کو بُرے دن بھی آ سکتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی میں میانہ روی اختیار کرنی چاہئے۔ ہمارے دین میں بھی فضول خرچی کی ممانعت ہے۔“

عارف رضا لاہور شہر کی ایک جدید قسم کی آبادی میں ایک عالی شان کوٹھی میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا مختصر سا کنبہ تھا۔ بیوی جس کا نام سیما تھا۔ ان کی ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً پانچ چھ سال ہوگی وہ ایک عرصے سے کالے پیرقان کی مرینفٹ تھی اور دو لڑکے ایک کی عمر چار سال اور دوسرے کی عمر دو سال۔

عارف رضا کی ایک اویڑ عمر ماں تھی جو اوائل عمر میں ہی بیوہ بن چکی تھی۔ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اس کے بطن سے صرف ایک لڑکا عارف رضا تھا جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا۔ عارف کی معمر ثانی ماں بھی ان کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ کچھ عرصہ آگے چل کر عارف کی ماں نے اپنے خاندان کے ایک شخص سے نکاح کر لیا۔ جس کو عارف رضا کے ماموں یعنی ماں کے سگے بھائی پسند نہ کرتے اور اپنا شریک سمجھتے تھے۔ وہ چال چلن کا بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ عارف رضا اور اس کے ماموں کو یہ سخت ناگوار گزارا۔ عارف رضا کے دونوں ماموں عرصہ دراز سے بعد اہل واعمال امریکہ میں مقیم تھے۔ عارف کی ماں نکاح کے بعد اس کو چھوڑ کر اپنے خاوند کے گھر چلی گئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس کی ثانی ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔

عارف رضا بچے کے لحاظ سے گورنمنٹ لے کلاس کا کنٹرکٹر تھا۔ وہ بڑا خوش لباس اور خوش خوراک تھا۔ ویسے کہنے کو تو وہ ٹھیکیدار تھا لیکن اپنی چال ڈھال بول چال اور عادات اور شکل و صورت سے بالکل نواب زادہ ہی لگتا تھا۔ وہ ”آج“ پر یقین رکھتا تھا۔ ”کل“ کو بالکل نہیں مانتا تھا۔ اس کی فضول خرچی کا یہ عالم تھا کہ اس نے گھر کی ضرورت کے لئے اگر بازار سے کوئی معمولی چیز بھی خریدنا ہوتی تو وہ بازار اپنی گاڑی پر بی جاتا۔ اس کی شاہ خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ گھر سے اپنی جیب میں جتنے بھی پیسے لے کر نکلتا جب تک وہ ختم نہ کر لیتا واپس گھر نہ آتا۔ جب وہ گھر آتا تو اس کی جیب خالی ہوتی۔ اس کی بیوی اس سے اکثر بحث مباحثہ کرتی کہ انسان کو بُرے دنوں کے لئے کچھ نہ کچھ تو بچا کر رکھنا چاہئے۔ وہ جواب میں بڑے فخر اور غرور سے کہتا۔ ”ہاں یہ بیش کوش، عالم دوبارہ نیست۔“ بیوی جواب دہانس کر کہتی۔

”یہ ضرب الشل بادشاہوں یا پھر بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں پر تو صادق ہو سکتی ہے ایک عام شخص پر اس کا اطلاق ممکن نظر نہیں آتا۔“

عارف رضا اس صورت میں غصے سے جھڑک کر اپنی بیوی کو کہتا کہ تم مجھے اس قسم کی چھوٹی چھوٹی اور دقیانوسی قسم کی باتیں مت سنایا کرو۔ میرا حوصلہ بڑھانے کی بجائے پست کرتی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ سکندر اعظم جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو کیا وہ اپنی دولت اپنے ساتھ قبر میں لے کر اتر گیا؟ نہیں، وہ خالی ہاتھ قبر میں اترتا۔ تمہاری سوچ فکر اور حرکات ایک عام سی گھریلو قسم کی عورت جیسی ہیں جس کو میں ہرگز نہیں مانتا۔ یہ بات جان لو کہ میں ہر وہ کام کروں گا جو میری مرضی ہوگی۔ انسان دنیا میں ایک بار آتا ہے تو پھر کیوں نہ وہ اپنی زندگی کا بھرپور مزالے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ عورتوں میں دائمی

شکار ہو جاتے ہیں۔ جب زمان خان کو پتہ چلا کہ اس کے دوست کی مالی حالت خاصی کمزور ہو چکی ہے تو اسے پریشانی ہوئی لہذا اس نے اس کی مدد کے لئے ایک راہ نکالی۔ زمان خان کی بہن کا ایک پلاٹ تھا۔ زمان خان کا بہنوئی کویت میں ملازمت کرتا تھا۔ اس نے مکان تعمیر کروانا تھا لہذا اس نے زمان خان کو کہا تھا کہ کسی ٹھیکیدار کو تلاش کرو۔

اپنے بہنوئی اور بہن کا مکان تعمیر کرنے کے سلسلہ میں زمان خان نے سوچا کہ اس مکان کی تعمیر کا کام عارف رضا کے سپرد کرتے ہیں۔ اس طرح اس کی مالی مدد بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ زمان خان نے عارف کو اپنے گھر بلایا اور اپنی بہن کے مکان کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیا اور ساتھ ہی اس کو پچاس ہزار کی رقم بھی ادا کر دی کہ وہ اس پیشگی رقم سے مکان کی تعمیر کا کام اس ہفتے کے اندر اندر شروع کر دے۔ ہاں اگر اسے اس سلسلے میں مزید رقم کی ضرورت پڑے تو وہ بھی فوراً ادا کر دی جائے گی۔ عارف رضا یہ سب کچھ جان کر بہت خوش ہوا اور اپنے دوست زمان خان کا شکر گزار بھی ہوا کہ اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی ہے۔

دوسری طرف زمان خان کے دوستوں کو جب یہ پتہ چلا کہ اس نے اپنی ہمسرہ کے مکان کی تعمیر کا کام عارف رضا کے سپرد کیا ہے تو وہ حیران رہ گئے اور چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ زمان خان کا یہ فیصلہ کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہیں، اللہ بہتر کرے۔ زمان خان عارف کے متعلق اس قسم کی باتیں سن کر قدرے پریشان ہو گیا کہ کہیں ان کی باتیں سچ نہ ہوں۔ وہ تو اپنے دوست کی ایک طرح کی مدد کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی مالی حالت سنور جائے اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائے۔

زمان خان نے کسی کی مدد کے لئے عارف رضا

کو بروقت نے اپنی چال بدل لی اور اس چال کی زد میں عارف بھی آ گیا۔ اس کے حالات خراب ہونے لگے۔ آمدنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی مگر اس کی شاہ خرچیاں جاری رہیں۔ اس طرح تو بادشاہوں کے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ یہی عارف کے ساتھ بھی ہوا۔ صبح و شام ماہ و سال گزرتے رہے دیکھتے ہی دیکھتے عارف رضا کی خوشحال زندگی نہایت ہی عسرت اور کمپرسی میں بدل گئی اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔ عارف کی مالی حالت دن بہ دن بدتر ہوتی چلی گئی۔ کوئی جمع پونجی تو اس کے پاس نہ تھی جو کچھ یا پھر جہاں کہیں سے بھی اسے روپیہ پیسہ آتا وہ بند ہو گیا۔ اسے بڑے دنوں کا وہم و گمان تک نہ تھا۔

کچھ عرصہ تک تو اچھا نما وقت گزرتا رہا پھر آگے چل کر اس نے اپنے گھر کا مکن چلانے کے لئے اپنی کار فروخت کر دی۔ کچھ وقت گزرا یہ پیسے بھی ختم ہو گئے۔ حالات نے اسے مزید مجبور کیا پھر اس نے آہستہ آہستہ گھر کا قیمتی سامان مثلاً فریج، اسے سی فریج تک بیچ دیا۔ وقت یوں ہی اچھا نما گزرتا رہا۔

عارف کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اس پر نما وقت بھی آ سکتا ہے۔ وہ جو بھی اپنی بیوی کی باتوں پر غور کرتا تو پھر آنسو بہاتا کہ کاش وہ اس کی باتیں مان کر مکمل کرتا تو پھر شاید اسے یہ وقت دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ویسے بھی گزرا ہوا وقت بھی ہاتھ نہیں آتا اور انسان اپنے کئے پر شرمندہ اور نادم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ عارف کے ساتھ ہوا۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی رحیم و کریم ہے۔ وہ اپنے بندے کے لئے کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دیتی ہے۔ عارف رضا کا ایک بھین کا دوست تھا جس کا نام زمان خان تھا، ایسے حالات میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ بھائی، بہن، رشتہ دار یہ سب رشتے ناطے کچھ دھاگے کی طرح نوٹ پھوٹ کا

رضا سے شکایت کی کہ وہ کام پر پابندی سے کیوں نہیں آتا۔  
تو عارف نے اپنی بیٹی کی بیماری کا بہانہ بنا کر کہا کہ وہ بیٹی  
کے ساتھ ہسپتال گیا تھا۔  
"ایسی بات نہیں۔" زمان نے کہا۔ "تم جھوٹ  
بولتے ہو، یہ بہت بُری بات ہے میں نے تم پر اعتماد کر کے  
ہمیشہ کے مکان کی تعمیر کا کام تمہارے سپرد کیا ہے کہیں تم  
مجھے شرمندہ نہ کروانا۔"

عارف یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ حالات و واقعات  
کیسے بھی درپیش ہوں۔ انسان اپنی فطرت کے ہاتھوں  
مجبور ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو فطرت اسے کہتی  
ہے۔ آہستہ آہستہ عارف رضا نے کام پر آنا چھوڑ ہی  
دیا۔ اس بات کا علم زمان خان کو بھی ہو گیا۔ دوستی یاری کا  
معاہدہ تھا وہ عارف کے ساتھ سخت رویہ بھی اختیار نہ سکتا  
تھا۔ زمان خان خاصا پریشان ہو گیا تاہم اس نے عافیت  
اسی میں سمجھی کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ زمان خان نے دل ہی  
دل میں خیال کیا کہ عارف رضا کو ایسا ہرگز نہیں کرنا  
چاہئے تھا۔ وہ تو اس کی بددکھنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے  
عارف نے یہ سب کچھ کس مجبوری کے تحت کیا۔ اتنے یہ  
بھی خیال آتا کہ جب اس نے عارف کو مکان کی تعمیر کا  
کام سپرد کیا تھا تو اس کے دوستوں نے اسے ٹھیک ہی کہا  
تھا کہ زمان خان نے عارف پر اعتماد کر کے کوئی درست  
فیصلہ نہیں کیا۔ حالات کو سمجھتے ہوئے زمان خان اس نتیجے  
پر پہنچا کہ اب وہ خود مکان کی تعمیر کروائے گا۔ بصورت  
و دیگر اگر اس کی ہمیشہ کو یہ خبر ہوئی تو وہ راضی ہوگی۔

ایک دن زمان خان مکان کی تعمیر کے سلسلے میں  
پلاٹ پر کام کاج میں مصروف تھا کہ ایک اجنبی شخص وہاں  
آیا اور زمان خان سے مخاطب ہوا کہ اس نے عارف رضا  
کو ملنا ہے۔ وہ مکان کی تعمیر کے سلسلے میں اس کی دکان  
سے کچھ عمارتی سامان ادا ہوا لایا تھا۔ زمان خان یہ سن کر  
پریشان ہو گیا اور اجنبی شخص سے جواہا کہا کہ وہ اب یہاں

مکان کی تعمیر کا کام جاری رکھنے کو کہا۔ ہفتے کے اندر اندر  
مکان کی تعمیر عارف رضا نے شروع کرائی۔ دیکھتے ہی  
دیکھتے مکان کا ابتدائی کام عارف نے بڑی ذمہ داری اور  
نگن سے بروقت مکمل کر لیا۔ زمان خان بھی اس کے کام  
سے بہت خوش ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ عارف کے  
متعلق اس کے دوست غلط بیانی کا مظاہرہ کرتے رہے  
ہیں۔

اب لوہے، سریے، سیمنٹ کی مزید ضرورت پڑی  
اور کچھ دیگر عمارتی سامان عارف اپنی ذمہ داری پر مارکیٹ  
سے خرید لایا کہ ادائیگی بعد میں کر دی جائے گی جو تقریباً  
چالیس ہزار کے قریب تھی۔

زمان خان بھی وقت نکال کر دو چار دن بعد پلاٹ  
پر آتا جاتا اور ہلکی پھلکی نگرانی بھی کرتا۔ اس نے نیا خریدا  
ہوا سامان دیکھا، بہت خوش ہوا۔ تاہم بل عارف نے  
زمان کو دے دیا اور ادائیگی کے لئے کہا۔ زمان خان نے  
کہا۔ ٹھیک ہے دوسرے دن عارف رضا کو بل کی ادائیگی  
کر دی گئی۔ بل ادا کرتے وقت زمان خان نے عارف  
سے سرسری طور سے کہا۔ یا دوسریا وزن میں کچھ کم لگتا ہے۔  
یہ وزن ہے یا ڈیڑھ ٹن، کیا تم نے اپنے سامنے وزن کروایا  
تھا؟

"نہیں دوست! ایسی کوئی بات نہیں۔" عارف رضا  
پہلے تو قدرے گھبرایا پھر کہا۔ "جس سٹور سے سریا لائے ہیں  
ان کا تول پورا ہوتا ہے۔ مطمئن رہو کوئی فکر دہلی بات  
نہیں۔" زمان خان نے بھی زیادہ بحث کرنا مناسب نہ  
سمجھا اور اپنے دوست کی بات پر یقین کر لیا۔

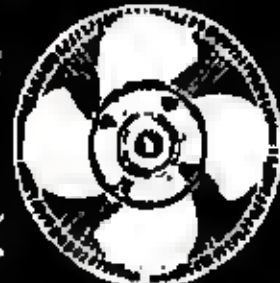
عارف رضا کے ہاتھ مزید نقد چالیس ہزار کی رقم آ  
گئی، وہ بہت خوش اور قدرے مطمئن تھا۔ اب وہ اپنی  
عادت کے مطابق کام پر پابندی سے نہ آتا اور مگھونے  
پھرنے چلا جاتا۔ زمان خان کو بھی خبر مل گئی کہ عارف  
اپنے کام پر اب کم توجہ دیتا ہے۔ جب زمان نے عارف

RTM 234574

بولو  
فین

سیلنگ فین  
پیڈسٹل فین

ایگزاسٹ فین



اے، جے، پکچے

سیلنگ فین پیڈسٹل فین  
ایگزاسٹ فین

اے۔ جے الیکٹرک انڈسٹری

محله نور پور شرقی گجرات

053-3521165, 3601318

نہیں آ رہا۔

”تو پھر اس صورت میں یہ بل کون ادا کرے گا؟“

اجنبی شخص نے زمان خان سے غصے کی حالت میں کہا۔

”کتنا بل ہے؟“ زمان خان نے پوچھا۔

”چالیس ہزار سات سو روپے کی رقم واجب الادا

ہے۔“ اجنبی شخص نے زمان خان کے ہاتھ میں بل دیتے

ہوئے کہا۔

”لیکن یہ رقم تو میں نے عارف رضا کو ادا کر دی

ہے۔“ زمان خان نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے اجنبی

شخص سے کہا۔ ”کیا اس نے تمہیں نہیں دی؟“

”عارف رضا نے یہ بل کی رقم ہمیں بالکل ادا نہیں

کی۔ اگر اس نے ادا کر دی ہوتی تو پھر میں یہاں کیوں

آتا؟“ اجنبی شخص نے جوابا کہا۔

”تو بھائی میرے اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جس

شخص نے تمہاری دکان جسے سودا سلف خریدا ہے اس کو

چرو..... ویسے ایک بات تو بتاؤ۔“ زمان نے باتوں

باتوں میں کہا۔ ”اس بل میں سر یا دوٹن لکھا ہے کیا واقعی

سر یا دوٹن تھا۔ مجھے تو دکان میں کچھ کم لگتا ہے۔“

”نہیں! احب! وزن میں سر یا دوٹن تھا۔“ اس

آدمی نے کہا۔ ”لیکن عارف کے کہنے پر ہم نے بل دوٹن

کا بنا دیا۔ خرید و فروخت کے سلسلے میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

بل کا کم زیادہ کرنا بھی کاروبار کا حصہ ہوتا ہے۔“ اجنبی

شخص نے اپنے حق میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میرے کارندے

عارف رضا نے بے ایمانی کا ارتکاب کیا ہے تو پھر آپ

بھی اس جرم میں برابر کے حصہ دار ہیں۔“ زمان نے کہا۔

”لہذا بہتر یہی ہوگا کہ تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ

کیونکہ میں غلط قسم کے اور بے ایمان لوگوں سے بات

چیت کرنا پسند نہیں کرتا۔ حرام کھانے والوں کی کبھی پوری

نہیں پڑتی۔ جاؤ چلے جاؤ اور عارف رضا کو تلاش کرو اور

ماجرہ ہے اور میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ عارف بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ زمان خان وہاں رکتا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دوست سے پوچھے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اور کس مشکل سے دور چار ہے لیکن زمان خان کے خمیر نے اسے ایسا نہ کرنے دیا کہ اس حالت میں اس کا دوست اسے دیکھ کر کہیں شرمندہ نہ ہو۔

زمان خان کو عارف کی یہ حالت دیکھ کر سخت دکھ ہوا کہ اس کے گھریلو حالات اتنے سخت خراب ہیں کہ اس کے گھر آٹا تک نہیں اور بھیک مانگ رہا ہے۔ تاہم زمان خان نے عارف کو اس حالت میں ملنا مناسب نہ سمجھا کہ اس وقت دیکھ کے وہ میرا سامنا کیسے کر سکے گا۔ لہذا زمان خان اسے ملے بغیر سیدھا گھر آیا اور دیر تک عارف رضا کے متعلق سوچتا رہا۔ پریشانی کی حالت میں پانچ ہزار کی رقم اپنی جیب میں ڈالی اور سیدھا عارف رضا کے گھر پہنچا۔ اس وقت تک عارف اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ اتنی غربت میں بھی وہ کوشی میں رہ رہا تھا۔ دراصل یہ کوشی اس کے ماموں کی تھی اور نہ وہ یہ کوشی بھی بچ دیتا۔

زمان خان نے عارف کے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی، لیکن دروازہ نہ کھلا۔ تاہم دو چار منٹ بعد ڈرتے ڈرتے عارف رضا نے دروازہ کھولا۔ زمان خان کو اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔

”عارف اٹھ کر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں“۔ زمان خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ مت میں تمہارا دوست ہوں۔ تم کیا اندر بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گے؟“

”کیوں نہیں، آؤ آؤ اندر بیٹھتے ہیں۔“ عارف نے کہا۔ دونوں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور بیٹھک میں جا بیٹھے۔

”میں ابھی تمہارے لئے کولڈ ڈرنک لاتا ہوں۔“ عارف نے کہا۔

”نہیں،..... نہیں دوست! رہنے دو۔“ زمان نے

اسی سے اپنے پیسے وصول کرنا۔ زمان خان نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

اجنبی شخص جو مل کی وصولی کے لئے آیا تھا قدرے ڈر سا گیا کہ اس نے غلطی کیوں بتایا۔

”صاحب! کم از کم اس کے گھر کا کوئی اتنا پتہ بتا دیں۔“ اجنبی شخص نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔“ یہاں بھی زمان خان نے دوستی کا حق نبھایا کہ اگر وہ اس شخص کو اس کے گھر کا پتہ بتائے گا تو ہو سکتا ہے یہ شخص اس کے گھر جا کر کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ ایسی صورت میں عارف رضا مزید مشکل میں پھنس جائے گا۔ وہ تو پہلے ہی زیرِ عتاب ہے اور مسئلے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ کافی دیر تک اجنبی شخص ٹکراتا رہا لیکن زمان خان نے عارف کے گھر کا پتہ اسے نہ بتایا۔ آخر کار مایوسی کی حالت میں اجنبی شخص وہاں سے چلا گیا اور کہہ گیا کہ کبھی نہ کبھی تو عارف رضا سے آنا سامنا ہو گا تو پھر اس صورت میں اس سے ڈبل پیسے وصول کروں گا۔

مکان کی تعمیر کا کام جاری رہا اور دو ڈھائی مہینوں میں مکان کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ جو رقم زمان خان سے عارف رضا لے گیا تھا اس نے اپنی جیب سے ادا کر دیئے کیونکہ وہ اپنی ہمشیرہ کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ یہ رقم اس کا دوست لے اڑا ہے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ اتفاق سے ایک دن زمان خان اپنے دفتر سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا، جب وہ گلبرگ ٹوارہ نمبر ایک سے اپنی کار پر گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ عارف رضا ٹھکن آلود لباس میں ملبوس مردوں کی شکل بنائے لب مزک بھیک مانگ رہا ہے اور ایک آدمی کار روک کر اپنی جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کو دے رہا ہے۔ زمان خان نے جب یہ منظر دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اس کا دماغ چکر سا گیا کہ یا اللہ یہ کیا

## ارشاد باری تعالیٰ

☆ رات کے وقت جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے تو اللہ کی پناہ مانگا کرو کیونکہ وہ ایسی مخلوق دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے اور جب رات کو ضروری کام نہ ہو باہر کم ہی نکلا کرو کیونکہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے زمین پر پھیلا دیتا ہے۔ بسم اللہ پڑھ کر دروازے بند کیا کرو کیونکہ شیطان وہ دروازے نہیں کھول سکتا جنہیں بسم اللہ پڑھ کر بند کیا گیا ہو۔ پانی کے برتن، خاص طور پر پینے کے پانی کے برتن رات کو ڈھانپ کر رکھا کرو۔ اچھی اور پرسکون نیند کے لئے درود پاک پڑھ کر سویا کرو۔ (شاگرد)

پانچ ہزار کی رقم لے جایا کرے تاکہ اس کے بیوی بچوں کی گزر اوقات باعزت ہوتی رہے۔ اس نے عارف کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس نے اسے بھیک مانگنے دیکھا ہے۔ زمان خان کسی بھی حالت میں اپنے دوست کو بھیک مانگتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے یہ احساس ہونے دیا کہ وہ بھیک مانگتا ہے اور آج کل ایک بھکاری کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ زمان خان نے وہاں سے اجازت لی، میاں بیوی نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

دو تین مہینے اسی طرح تزر گئے کہ عارف زمان خان کے دفتر پر مہینے کی پہلی تاریخ کو چلا جاتا اور وہ اسے وعدے کے مطابق تقریباً تین ہزار کاراشن اور دو ہزار نقد ادا کر دیتا۔

ایک دن زمان خان اپنے دفتر سے گھر پہنچا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ زمان خان نے فون جلدی جلدی اٹھایا۔ دوسری طرف سے فون پر عارف رضا کی بیوی سیمانے

کہا۔ ”میں گھر سے نہ ہاں ہو کر آیا ہوں۔ کسی قسم کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ عارف نے کہا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ زمان نے کہا۔ ”اگر مناسب سمجھو تو شغریٰ پانی کا ایک گلاس پلا دو۔“

عارف فوراً گھر سے پانی کا گلاس لینے چلا گیا۔ زمان خان نے پیٹھے پیٹھے۔ اس کے کمرے کا ایک نظر جائزہ لیا۔ صوفے، کرسیاں، میز وہاں کسی چیز کا نام و نشان تک نہیں تھا صرف اور صرف کمرے میں ایک پھٹی ہوئی چٹائی فرش پر پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سب کچھ بک چکا ہے۔ اس چٹائی پر عارف لیٹا ہوا تھا۔ عارف پانی کا گلاس لے آیا زمان خان نے پیلا اور دوست کا شکریہ ادا کیا۔

”عارف! ذرا ایک آدھ گھنٹے کے لئے میرے ساتھ آؤ۔“ زمان نے کہا۔ ”کینال پارک مارکیٹ تک جانا ہے۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ پھر واپس تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔“

عارف نے پیٹھے ہوئے دل سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔“ دونوں کار میں سوار ہو کر پانچ سات منٹوں میں مارکیٹ پہنچ گئے۔ زمان خان نے پورے مہینے کا راشن خریدا اور بل ادا کیا پھر واپس عارف کے گھر پہنچے۔

”راشن اپنے گھر کے اندر لے جاؤ۔“ زمان نے کہا۔ ”یہ تمہارے بیوی بچوں کے لئے ہے۔“

عارف یہ سن کر حیران ہو گیا۔ وہ ضرورت مند بھی تھا، راشن اٹھایا اور گھر کے اندر لے گیا۔ اس دوران اس کی بیوی بھی آ گئی۔ زمان خان کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی۔ رکی سلام دعا ہوئی۔ زمان نے دو ہزار نقد اس کی بیوی سیمانے کو دیا اور کہا کہ یہ رقم اس کی بچی کے علاج معالجے کے لئے ہے۔ پھر اپنے دوست عارف کو تاکہ اس کے دفتر آ کر

کہ وہ آئندہ سے ہر مہینے یکم تاریخ کو اس کے دفتر آ کر

آخر وہ کون سی وجہ یا پھر کیا محرکات تھے جو عارف بھیک مانگنے پر مجبور ہوا اور یہ سب کچھ عارف کی بیوہ سیما سے بھتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ ایک دین باتوں باتوں میں اس نے عارف کی بیوہ سے پوچھ ہی لیا کہ وہ آج اسے وجہ بتائے کہ اچانک ان کے گھریلو حالات کیوں بگڑے حالانکہ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک آرام دہ اور خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔

”اس کی وجہ صرف ایک ہے۔“ سیما نے کہا۔ ”اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگ یہاں جس کوٹھی میں رہائش پذیر ہیں یہ دراصل میرے مرحوم شوہر عارف کے ناموں کی ملکیت ہے۔ وہ لوگ ایک عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں، پاکستان سے روانگی پر وہ لوگ یہ کوٹھی اپنی بہن کے سپرد کر گئے جو عارف کی ماں تھی۔ اس کے بطن سے صرف ایک لڑکا تھا عارف اور ایک مرحوم عارف کی بیٹی۔ وہ لوگ اپنی کوٹھی کرائے پر دینے کے حق میں نہ تھے۔ ازراہ ہمدردی انہوں نے اپنی بیوہ بہن کو وہاں رہنے کی اجازت دی اور ساتھ ہر ماہ وہ مبلغ پچاس ہزار روپے کی رقم بھی اپنی بیوہ بہن اور بیٹی کی ماں کو بھیجتے تھے۔ آپ اس کو مدد دیا خیرات کہہ لیں۔ عارف کی ماں ساری کی ساری رقم اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے عارف کو دے دیتی۔ عارف دل کھول کر ساری کی ساری رقم مہینے کے آخر تک اڑا دیتا۔ جیسے مثال ہے ”مال مفت دل بے رحم“ ٹھیکیداری بھی اس نے ایک قسم کی چھوڑ رکھی تھی اور نہ ہی وہ اس کام میں کوئی زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اس طرح وقت گزرتا رہا اور ہم لوگ ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ پھر کچھ آگے چل کر عارف کی ماں نے اپنی برادری میں ایک آدمی سے دوسرا نکاح پڑھوا لیا۔ جس کا اس کے بھائیوں نے جو امریکہ میں مقیم تھے، بہت سخت بُرا منایا اور اپنی بیوہ بہن سے ناطہ توڑ دیا۔ دوسرا عارف کی ماں بھی عارف کو چھوڑ کر اپنے خاوند کے گھر جا کر رہنے لگی۔ اب عارف کے پاس باقی ماں رہ گئی تھی جو اکثر بیمار رہتی یا

رونے کی آواز سنائی دی۔ روتے روتے کہا۔

”بھائی جان! آپ کے دوست کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں بچوں سمیت بے آسرا ہو گئی میرا اب کون پُرسنان حال ہوگا۔“

زمان خان نے جب عارف کے انتقال کی خبر سنی تو اسے سخت صدمہ پہنچا۔ ایک طرح کا وہ سکتے میں چلا گیا اس کے ہاتھ میں پکڑا لوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اس نے مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنی بیوی کو عارف کے انتقال کی خبر سنائی۔ دونوں میاں بیوی فوراً عارف کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ ارد گرد کے ہمسائے اور رشتہ دار آچکے تھے۔

زمان خان نے سب سے پہلے اپنے مرحوم دوست عارف رضا کی تجہیز و تکفین کے انتظامات مکمل کئے اور مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کو قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ دوسرے دن رسم قلم پر زمان خان نے اپنی بیوی کے ذریعہ عارف مرحوم کی بیوہ کو پیغام بھیجا کہ اس کا خاوند اب اس دنیا میں نہیں رہا لیکن اسے کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں پہلے اپنی عدت پوری کرو، تمہارے بچوں کے لئے راشن خرچہ وغیرہ گھر پر نہیں ہر ماہ پابندی سے ملتا رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مطلع کرنا۔ ان شاء اللہ تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ اپنے آپ کو بے سہارا مت سمجھنا۔

اسی طرح کچھ وقت گزرا سیما جواب بیوہ تھی اس کی عدت کا وقت ختم ہوا۔ اب زمان خان اپنی بیوی کے ساتھ سیما کے گھر منتہ میں ایک آدمہ مرتبہ جاتا اور اس کی اور اس کے بچوں کی خیر و عافیت پوچھتا۔

زمان خان کو بڑا تجسس تھا اور وہ یہ جاننا چاہتا تھا عارف رضا کی زندگی جو بڑی خوشحال تھی دیکھتے ہی دیکھتے کیسے معاشی بد حالی کا شکار ہوئی۔ نہ تو وہ جوا کھیلتا، نہ شراب پیتا اور نہ ہی بظاہر اس میں دیگر کسی قسم کی برائی نظر آتی تھی

ڈائجسٹوں کی دنیا کے معروف قلم کار

## یہ دیانہ بجھنے پائے



☆ سلیم اختر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت سادہ اور سہل لکھتے ہیں اس لئے ان کی تحریر قاری کے دل و ذہن سے براہ راست مکالمہ کرتی ہے۔

☆ مزہ سامانائے بیرو شیرازہ جی کہانیاں

☆ محمد سلیم اختر نثری کائنات میں ایک معتبر نام ہے۔

☆ انہیں قارئین کو اپنے فن میں منہمک رکھنے کا فن آتا ہے۔

☆ ایم اے راحت

☆ محمد سلیم اختر کہانی اور قاری کے ذہن پر غلبہ کی گرفت رکھتے ہیں۔

☆ ہمارا احمد نواب

☆ میں سلیم اختر کی کہانیوں کے بل پر چڑھ کر نکل تصور کرتا ہوں۔

☆ پرویز بگڑی

☆ جاسوسی ڈائجسٹ بلی کیسٹن کراچی

نواب سنتر سبلی کیسٹن

PH: 051-5555175

پھر عارف کے بچے تھے۔ عارف کے ماموں پھر بھی بچپن ہزار کی رقم عارف کو بھیجتے رہے کیونکہ عارف کی نانی امریکہ میں جو دو ماموں تھے ان کی ماں تھی۔ پھر تھوڑا آگے چل کر نانی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی امریکہ سے چپے آنا بھی بند ہو گئے۔ عارف کے ماموں اب یہ سوچنے لگے کہ ان کی ماں بھی انتقال کر گئی اور ان کی بہن نے بھی دوسرا نکاح کر لیا اور اپنے گھر چلی گئی عارف سے اب رشتہ بس نام کا ہے۔ دوسرے وہ لوگ عارف کے خیالات اور حرکات سے بھی کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے لہذا انہوں نے ماہوار خرچہ بند کر دیا۔ کوئی بیع پونجی وہ رکھتا تھا میرا مرحوم خاوند بس یہی تھتھارہا کہ اس طرح پابندی سے چپے آتے رہیں گے اور اس طرح وقت گزرتا رہے گا۔

بس یہی ایک وجہ تھی ہاڑی معاشی بد حالی کا سبب بنی۔ میرے مرحوم شوہر کے انتقال کے بعد ان کے جو ماموں ہیں انہیں یہ گمان گزرا کہ کہیں میں بھی کسی سے دوسری شادی نہ کر لوں تو پھر اس صورت میں وہ لوگ کوٹھی پر قابض ہو جائیں پھر ان سے کوٹھی خالی کروانا مشکل ہو جائے گا۔ اب ایک ماموں ہم سے کوٹھی خالی کروانے آ رہا ہے۔

چنانچہ اگلے ماہ ہی عارف کا ایک ماموں پاکستان آیا اور سیماسے کہا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یہ کوٹھی خالی کر دے اور اپنی رہائش کا بندوبست کسی اور جگہ کر لے۔ انہیں ہر حالت میں کوٹھی خالی چاہئے۔

یہ صورت حال عارف کی بیوہ کے لئے پریشان کن تھی۔ عارف مرحوم کے ماموں اب سارے رشتے نامٹے بھول گئے تھے اور ٹھیک ایک ماہ گزرنے کے بعد عارف کی بیوہ کے گھر کا سامان باہر گلی میں پھینک دیا۔ اور کہا کہ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں جس کے ساتھ رشتہ تھا وہ مر گیا۔ جہاں تجھے پناہ ملے چلی جاؤ۔

جب اس صورت حال کا علم زمان خان کو ہوا تو اس نے مرحوم دوست عارف یاد آیا۔ فوراً عارف کی بیوہ کے

کرتا رہا۔ سکول ماسٹر ایک ادنیٰ عمر شخص تھا، اس کی کوئی اولاد نہ رہی تھی۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی جس کی عمر پانچ سال تھی اور وہ ماسٹر جی کے والدین کے پاس رہتی تھی۔ زمان خان نے یہاں بھی دوستی کا حق سمجھایا۔ اپنے دوست سکول ماسٹر کو عارف کی بیوہ سیمہ کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے رضامند کر لیا۔ ماسٹر جی سے نکاح کر لینے کے بعد سیمہ ماسٹر زہیر کے نام سے منسوب ہو گئی۔ سیمہ اپنے لئے بلکہ اپنے بچوں کے لئے جینا چاہتی تھی۔

ماسٹر زہیر نے بھی نہایت پیار محبت اور شفقت سے سیمہ کو اپنے گھر میں رکھا۔ سیمہ وقتی طور پر اپنے چھپلے سارے غم بھول گئی اسے اب ایک پیار کرنے والا شوہر مل گیا جو اس کی اور اس کے بچوں کی ہر ضرورت پوری کرتا۔ بچے بھی بہت خوش تھے۔ ماسٹر زہیر ان کی تعلیم و تربیت پر پوری پوری توجہ دیتا۔

اس طرح شب و روز گزرتے رہے پھر تھوڑا آگے چل کر سیمہ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا۔ ماسٹر زہیر کی خوشیاں مزید بڑھتی چلی گئیں۔ اب اس کے گھر اسی کی جگہ خوشیاں اور بہاریں ہی بہا رہی تھیں۔ سیمہ نے اپنے خاوند کی جو پہلی بیوی کے بطن سے لڑکی تھی اس کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ زمان خان بھی گا ہے بگا ہے ان کی خبر رکھتا اور گھر میں ان کو ایک خوش و خوش زندگی گزارتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ سیمہ زمان خان کی بہت ممنون تھی کہ اس نے ہر موڑ پر اس کی مدد کی بلکہ اس کا ماسٹر زہیر سے نکاح کروا کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ فراہم کیا۔ وہ زمان خان کو کہتی کہ جو تنگی اس نے کی ہے اس کی جزا وہ تو نہیں اللہ تعالیٰ اسے ضرور دے گا۔ جواب میں زمان خان کہتا اس نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا، اس نے فقط دوستی نبھائی ہے۔



پاس پہنچا اور عارف کی بیوہ اور اس کے بچوں کو حوصلہ دیا کہ نگر نہ کریں ایک ور بند ہوتا ہے تو سوور اوپر والا کھول دیتا ہے۔ زمان خان کا اس کے گھر کے قریب ایک سروٹ کوارٹر تھا جو اس نے اپنے یار دوستوں اور مہمانوں کے لئے خالی رکھا ہوا تھا فوراً عارف کی بیوہ کا سارا سامان اس میں رکھ کر بمحاسب کے بچوں کو اپنے کوارٹر میں لے آیا اور بیوہ سے کہا کہ اب آپ لوگ بے فکر ہو کر اس جگہ قیام کریں۔ اب تمہیں کسی قسم کا کرایہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور حسب توفیق تمہیں بچوں کی پرورش کے لئے ماہوار خرچہ بھی ملتا رہے گا۔ تمہیں یہاں ہر قسم کا تحفظ ملے گا۔

”سیمہ! یقین کرو میں تمہارے ساتھ ضرور نکاح کر لیتا۔“ ایک دن زمان خان نے کہا۔ ”لیکن میری کچھ مجبوری ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میری اولاد و جوان ہے۔ بے شک تم ایک بلند کردار باوقفا اور کفایت شعار عورت ہو، میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی قسم کا نگر رکھنے کی ضرورت نہیں۔“

عارف کی بیوہ کو یہ سب کچھ جان کر قدرے حوصلہ ملا۔ اس دوران عارف مرحوم کی بیٹی جو کالے ریشم کی مریضہ تھی اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ عارف کی بیوہ کے لئے یہ غم بھی کچھ کم نہ تھا۔ تاہم اس نے اللہ کی رضا سمجھ کر برداشت کیا۔ زمان خان نے عارف کی بیوہ کو گھر میں مصروف رکھنے کے لئے بازار سے ایک نئی سلائی مشین خرید کر لادی اور کہا کہ وہ نئی مچلے مین لوگوں کے کپڑوں کی سلائی وغیرہ کیا کرے اس طرح اس کا وقت بھی مصروفیت میں گزرے گا۔ دوسرے آدن بھی کچھ ذریعہ ہوگی۔

اس کے دونوں بچوں کو بھی زمان خان نے محلے کے ایک دوست جو پرائمری کا سکول ماسٹر تھا، اس کے پاس ٹیوشن رکھوا دی تاکہ بچے کئی محلے میں آوارہ نہ پھرتے رہیں۔ بچوں کی ٹیوشن فیس زمان خود اپنی جیب سے ادا

اپنی جوانی کیوں برباد کرتے ہو میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتا رہوں  
کہ جس سے سانب بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ جائے۔

## جب چٹھی ماں کی چھوٹی



محمد نذیر ملک



ہیں ساس اگر ماں بھی ہو جب بھی بیٹی کے حق  
کہتے ہیں ابھی نہیں ہوتی اور بھو اگر بیٹی بھی ہو تو ماں  
کو ساس ہی سمجھتی ہے۔  
یہ ضرب اٹھل اس وقت حقیقت کا روپ دھار گئی  
جب ایک سگی بیٹی اپنی ماں کی بہو بن گئی۔  
ہام تو اس کا ارشاد بی بی تھا لیکن سب اُسے شاداں  
کہتے تھے۔ شاداں اپنے والدین کی اگلی اولاد ہونے  
کے نامے بڑے ہار و خم کے ساتھ پٹی تھی۔ وہ بچپن سے  
عی نہایت خوبصورت تھی۔ اوپر سے جب اس نے جوانی  
کی دھیز پر قدم رکھا تو غضب اُحانے لگی۔ گاؤں کے  
لوجان شاداں کے حسن کے گن گاتے اور اس سے عشق و  
محبت کے سن گھڑت قہے سننے سنانے لگے۔ ہر کوئی اس کا  
سچا عاشق ہونے کا دعویدار تھا اس کی خوبصورتی کی وجہ سے  
اکثر اسے ہیر کہتے۔  
شاداں کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔  
نظر اتفاقات تو دور کی بات تھی۔  
ایک روز شاداں کے ان نام نہاد عاشقوں پر یہ خبر  
بکلی بن کر مگر مگر کہ شاداں کی اپنے ماموں زاد سے شادی ہو  
گئی ہے سبھی کو اس بات سے بے چارے ہو اور حیرانی بھی کہ  
یہ نعل کو کوٹاٹ کا بیوہ کیسے نک گیا۔ کیونکہ شاداں کا منگیتر  
کسی طور بھی شاداں کے قائل نہ تھا۔ وہ پستہ قد، نحیف و  
نزار اور نہایت سادہ سا لڑکا تھا جبکہ ان نام نہاد متوقع  
امیدواروں میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو راجہ یا گروانا  
تھا۔ ان میں سے ہر کوئی اپنے اپنی حق تلفی جاننے لگا لیکن  
چونکہ یہ شاداں کے ماں باپ کا فیصلہ تھا لہذا کوئی کچھ بھی  
نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں سے کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکا  
کہ آیا اس فیصلہ میں شاداں کی اپنی مرضی بھی شامل ہے یا  
نہیں۔ وہ ایسا وقت تھا جب والدین کی اکثریت شادی  
کے بارے میں اپنی بیٹیوں کی مرضی معلوم کرنے کی  
روادار نہ تھی۔ اس بارے سے کہ بیٹی اگر خدا خواستہ نہ کر مانی

نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ان کے اپنے عزیزوں میں  
نڑکا موجود ہے اور یہ کہ بچوں کی نسبت بچپن سے ہی ملے  
ہو چکی ہے۔ ان کا جواب سن کر شفاعت کے گھر والے  
مایوس لوٹ آئے لیکن عشق کی جو آگ دونوں نے اپنے  
دلوں میں جلائی تھی اسے شاداں کی شادی کا بندھن بھی نہ  
بجھا سکا۔ کہتے ہیں نفرت اگر دل میں ہو تو اس کا اظہار کبھی  
نہ کیجی ہو ہی جاتا ہے۔

آخر اسی دوران ایک روز شاداں نے اپنے خاوند  
سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ شوہر شاداں کے منہ سے نکلی یہ  
بات سن کر ہکا بکا رہ گیا اور وہ اپنا منہ کھول کر شاداں کا منہ  
دیکھنے لگا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ تو کسی طور بھی شاداں کو  
طلاق دینے اور اسے کھونے پر آمادہ نہ تھا۔ بات لوگوں  
تک پہنچی تو کبرام مچ گیا لیکن شاداں اب چپ کا روزہ  
توڑ چکی تھی وہ سر عام کہنے لگی کہ اس کا اپنے خاوند کے  
ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ وہ اسے طلاق دے  
دے۔ شاداں کا باپ یہ رسوائی اور جگ ہنسائی سہہ نہ سکا  
اور ایک روز سوتے میں ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

آخر عشق کی آگ جوالہ بن کر پھٹنے لگی اور شاداں  
نے کسی بھی طور سے اپنے خاوند سے چھٹکارہ حاصل کرنے  
کی ٹھان لی اور اپنے عاشق کو راز دار بنالیا۔ پھر ایک روز  
لوگوں نے سنا کہ شاداں کے شوہر کو رات کو سوتے میں  
سانپ نے ڈس لیا ہے اور صبح وہ اور سانپ دونوں بستر پر  
مرے ہوئے پائے گئے۔

امر واقع یہ تھا کہ شاداں کے گاؤں کے قریب ایک  
میدان میں چھلی نکسین آباد تھے جن میں ایک منیاسی بابا بھی  
تھا۔ شفاعت اس سے جا کر ملا اور اس سے زہر طلب کیا۔  
منیاسی بابا سمجھ گیا کہ جوان کے ارادے خطرناک ہیں  
منیاسی نے کہا کہ زہر تو وہ دے سکتا ہے لیکن اکثر یہی ہوتا  
ہے کہ زہر دینے والے خود بھی بچ نہیں پاتے اور پکڑے  
جاتے ہیں۔ اپنی جوانی کیوں برباد کرتے ہو میں تمہیں

تو یہ ان کے لئے دُوب مرنے کا مقام ہوتا اور لوگ طرح  
طرح کی باتیں بتاتے کہ دیکھو فلاں کی بیٹی بول پڑی  
ہے۔ بیٹی کا یہ بول پڑنا شرم اور بے عزتی خیال کیا جاتا۔  
ادھر بیٹیاں بھی اپنے ماں باپ کی عزت کا اپنی پسند ناپسند  
سے پردہ کر خیال کرتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں ان کی  
عزت پر حرف آئے۔ ایک روز شاداں بھی ایسے ہی روتی  
رلاتی ڈولی میں بیٹھ گئی اور اپنے دلہا کے گھر میں جا  
اتری۔

شاداں کی شادی ہو گئی۔ شاداں سے عاشق کا دعویٰ  
کرنے والوں نے مہر کا گھونٹ لی تو لیا لیکن ساتھ ہی وہ  
اس نوہ میں لگ گئے کہ کیا وہ اپنے خاوند کو پسند کرتی ہے یا  
نہیں اور کیا یہ شادی اس کی مرضی سے ہوئی ہے۔ انہوں  
نے دیواروں کے ساتھ کان لگا کر شروع کر دیئے۔ ادھر  
شاداں کے خاوند کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ رات چلتے  
میں اس پر طرح طرح کے آوازے کئے لیکن شاداں کا  
خاوند نہایت دھیمے مزاج کا صابر شا کر انسان تھا وہ ان کی  
چھیڑ چھاڑ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ فارغ تھا اور جانتا تھا  
کہ کھسیانی ملی ضرور کھسا نوچے گی۔ بہر حال بات زیادہ  
دیر چھپی نہ رہی۔ کہتے ہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے  
ہیں اور وہاں تو لوگوں کے گھروں کی چھتیں بھی آپس میں  
مشترکہ اور جگتی ہوتی تھیں۔ گھر کے اندر کئی جانے والی  
باتیں ستر کرتے کرتے دور تک پہنچ جاتی تھیں۔ بات دعویٰ  
نکلی کہ شاداں نے کبھی بھی اپنے خاوند کو پسند نہیں کیا تھا  
اور نہ ہی شادی کے بعد اسے قبول کیا ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ شاداں کے مراسم خلیہ طور پر ایک  
نوجوان کے ساتھ تھے جس کا نام شفاعت تھا۔ وہ ایک  
دوسرے پر جان چڑھتے تھے اور دلوں آپس میں پڑوسی  
تھے۔ وہ چوڑی چھپے ملتے بھی تھے۔ ان کی محبت پاک  
صاف تھی۔ شفاعت کے کہنے پر اس کے گھر والے  
شاداں کے گھر رشتہ مانگنے آئے تو شاداں کے والدین

# حکایت کے نامور قلم کار محمد رضوان قیوم کے قلم سے

## گروہ ماضی

11 انعام یافتہ

کلاسک سچی کہانیوں کا مجموعہ

یہ کہانیاں من گھڑت قصے یا انسا نے نہیں  
بلکہ انسانی زندگی سے لپٹی حقیقی وارداتیں  
ہیں جو لوگ دوسرے سے نہیں، اپنے آپ  
سے بھی چھپاتے ہیں

قیمت  
250/- روپے

ملک بک ڈپو، کمیٹی چوک  
دراکٹی بک، بینک روڈ صدر راولپنڈی

ایک ایسا طریقہ بتاتا ہوں کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور علاج بھی نکل جائے۔ تم مجھ سے ذہر کی بجائے زہریلا سانپ لے لو اور اپنے شکار کو سانپ سے ڈسا دو۔ شفاعت حیران ہو کر سنیا سی بابا کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سانپ کا ڈسنا بھی تو جاتا ہے اور تمہارے جیسے سنیا سی بھی سانپ کے ڈسے کو بچا لیتے ہیں۔ سنیا سی نے کہا کہ میرے پاس ایک ایسا سانپ ہے جس کے ڈسے کو میں بھی نہیں بچا سکتا اور پھر مارگزیدہ مجھ تک پہنچے گا تو میں اس کا علاج کروں گا ناں میرے اس سانپ کا ڈسنا تو پانی نہیں مانگتا۔ لیکن اس کے پیسے بہت لگیں گے۔

پیسوں کی فکر نہ کرو تم ڈسوانے کا طریقہ بتاؤ۔

سنیا سی نے کہا کہ وہ سانپ کو اس ڈولی میں ڈال کر ڈولی کے منہ پر کپڑا رکھ کر اسے سی سے باندھ دے گا۔ تم رات جا کر جس کسی کو بھی ڈسوانا ہے رات کو جب وہ شخص سو جائے تو احتیاط سے ڈولی کے کپڑے کی سی کھول کر سانپ اس کے پہنوں کے ساتھ کے بستر پر ڈال دینا۔ سانپ ذہر کے انشے میں نرم نرم بستر پر پڑا رہے گا جو فی اس شخص نے ذرا سی بھی حرکت کی تو سانپ اس کو ڈس لے گا۔ اس بات کا خیال رہے کہ مطلوبہ شخص کے جوتے بھی اس جانب پڑے ہوں جس جانب سانپ ہوتا کہ وہ شخص بستر پر سے اُس طرف سے اترے جہاں سانپ پڑا ہو گا اور اترتے وقت لامحالہ وہ سانپ کے اوپر سے ہو کر اٹھے گا لہذا سانپ اسے فوراً ڈس لے گا۔ بہر حال یہ ترکیب کامیاب رہی اس کے بعد سنیا سی بابا کے کہنے کے مطابق سانپ کو بستر پر ہی مار دیا گیا اور وہ پڑا رہا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ شاداں کا شوہر مرا پڑا ہے اس کا جسم نیلا پڑ گیا اور منہ سے جھاگ اٹل رہا تھا۔ پاس ہی سانپ مرا پڑا تھا۔ مکانوں کی چھتیں کچی تھیں۔ یہی ہاور کیا گیا کہ سانپ چھت سے بستر پر گرا ہے اور اس نے شاداں کے

شوہر کو اس لیا ہے۔

یہ سب باتیں بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

چنانچہ شاداں طلاق لینے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔ اب شاداں اور اس کے محبوب کے راستے کی رکاوٹ ختم ہو گئی۔ عدت گزرنے کے بعد شاداں شفاعت کی بیوی بن گئی۔ ادھر شفاعت کی ماں کو مرے 8 ماں گزر چکے تھے اور اس کا باپ رٹو تھا چھ مہینوں میں اس نے شاداں کی ماں کے ساتھ نکاح کر لیا۔ یوں دونوں ماں بیٹی کا رشتہ ساس اور بہو کے رشتہ میں بدل گیا۔ شاداں کا نیا خاندان دل و جان سے اس پر نفا تھا۔ ادھر شاداں بھی اس کی بے پناہ محبت میں گرفتار تھی۔

ادھر جب ان ماں بیٹی کا رشتہ ساس اور بہو میں تبدیل ہوا تو ماں ماں نہ رہی اور بیٹی بیٹی نہ رہی۔ وہ روایتی ساس بہو بن گئیں۔ اس وقت جو انک فمیلی سسٹم تھا۔ ایک ہی جگہ کھانا پکنا اور سب اکٹھے بیٹھ کر کھانا کرتے۔ ان باپ بیٹوں کا زمیندارہ تھا۔ باپ بیٹے دونوں مل چلاتے اور موسیٰ پالتے۔ کبھی کھانا لے کر کھیتوں میں ماں جاتی کبھی بیٹی۔ وہ اپنے اپنے خاندانوں کی بظاہر خدمت گار تھیں۔ وہ گھر بار کا کام بخوبی انجام دے رہی تھیں کہ اچانک ایک واقعہ ہو گیا۔

شفاعت کے باپ نے دیگر موسیوں کے علاوہ ایک بہت ہی خوبصورت تیل پال رکھا تھا اس وقت اکثر زمیندار لوگوں نے اس طرح کا ایک آدھ تیل شوقیہ طور پر پال رکھا ہوتا تھا۔ تیل شفاعت کے باپ سے بے حد مانوس تھا۔ دونوں کے درمیان دوستی ہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر دم نہیں سکتے تھے۔ کیا ہوا کہ ایک دن دونوں باپ بیٹا علی الصبح مل چلانے کے لئے نکلے تو اس تیل کو بھی ساتھ لے گئے۔ تیل صبح دن چڑھتے ہی رسی توڑ کر گھر آ گیا۔ شاداں کی ماں نے تیل کو جو اس حالت میں دیکھا کہ اس کے ناک اور گلے میں لالی ہوئی آدمی

ری لٹی ہوئی تیل کے ساتھ لنگ رہی ہے اور تیل مالک کو چھوڑ کر گھر آ گیا ہے تو یہ منظر دیکھ کر شاداں کی ماں نے فوراً کہا کہ آج اس کا خاوند مارا گیا ہے۔ در نہ تیل کبھی یوں اکیلا گھر واپس نہ آتا۔

فی الواقع یہ بات اس وقت صحیح ثابت ہو گئی جب لوگوں نے کھیتوں میں جا کر دیکھا تو شفاعت کا باپ وہاں مرا پڑا تھا اور شفاعت وہاں موجود نہ تھا۔ پتہ چلا کہ وہ ایک پہاڑی چڑھ کر اس کی دوسری جانب سے اتر کر گدھالہ (جگہ کا نام) چلا گیا ہے۔ اسے پیغام بھیجا گیا کہ اس کا باپ مر گیا ہے۔ متونی کو اٹھایا گیا۔ یعنی شاہدین کا کہنا تھا کہ متونی کے سر پر گہرے زخم دیکھے گئے تھے۔ بیٹا بھی راستے بھر میں روتا بیٹنا گھر آ گیا۔ سب نے مل کر متونی کو اندر دھکے (اندروالے کمرے) میں لے جا کر غسل دیا اور جلدی جلدی میں اسے دفنا بھی دیا گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی کہ متونی کو قتل کیا گیا ہے۔ تھانیدار آ گیا اور ساتھ اپنا عملہ بھی لایا۔ متونی کی قبر کشائی کی گئی۔ لاش پوسٹ مارم کے لئے بھجوائی گئی۔ اگلے روز رپورٹ آئی تو متونی کی موت سر پر ناغی یا کسی وزنی چیز کی شدید ضربوں کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ لہذا پولیس نے اپنے طریقے سے قتل کے اس کیس کی تفتیش شروع کر دی۔ تفتیش کی ابتدا مقتول کے بیٹے شفاعت سے کی گئی کہ جب باپ بیٹا دونوں اکٹھے کھیتوں کو گئے تھے پھر کیا ہوا؟ بیٹے نے کہا کہ وہ راستہ سے ہی باپ سے انگ ہو گیا اور لکڑیاں لانے کے لئے گدھالہ چلا گیا تھا۔ وہیں پر اسے اطلاع ملی کہ اس کا باپ فوت ہو گیا ہے۔ موقع کا بیش شاہد کوئی نہیں تھا ماسوائے بے زبان تیل کے۔

تیل نے گواہی دے دی

تھانیدار کوئی سیٹا شخص تھا اس نے کہا کہ اُسے وہ تیل دکھایا جائے جو رسی توڑ کر کھیتوں میں سے گھر آ گیا

## جنگماتی باتیں

ہم اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو سمجھو امن مل گیا اور جب اسلام ہمارے اندر داخل ہو جاتا ہے تو ہم جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ہم وحسد کرنے والے کے لئے یہی سزا کاٹی ہے کہ جب تم خوش ہوتے ہو تو وہ ادا اس ہو جاتا ہے۔

(حضرت علیؓ)

☆ آپ کی زندگی میں آپ کا خیال رکھنے والی شخصیت ایسے ہی ہے جیسے دل کی دھڑکن۔ جو نظر نہیں آتی لیکن خاموشی سے آپ کی زندگی کو تحفظ دیتی ہے۔ (شاگرد)

☆ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں، پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔ (تیم سیکینہ صدف)

☆ تعلیم سے زیادہ ہمارا رویہ اہم ہوتا ہے کیونکہ بعض اوقات ہماری تعلیم ناکام ہو جاتی ہے اور رویے ہی معاملات سدھارتے ہیں۔

☆ محبت زندگی بدل دیتی ہے جناب! اگر مل جائے تب بھی اور نہ ملے تب بھی۔ (حکیم محمود - سہیلوال)

☆ اللہ کے خوف سے گرنے والے آنسو بے شک چھوٹا کیوں نہ ہو، اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ سمندر کے برابر گناہ وجود دیتا ہے۔ (نبیلہ نازش - اوکاڑہ)

☆ سے باپ پر حملہ کر دیا۔ باپ کے منہ سے اتنے الفاظ نکلے کہ بیٹے یہ کیا کرنے لگے ہو۔ پھر دوسرے تیسرے وار پر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ گر گیا اور مرنے لگا۔ میں اسے مرتا دیکھ ہی رہا تھا کہ دیکھا تو بتل ری توڑ کر ہماری طرف بھاگا آ رہا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے ہی نشانہ بنائے گا۔ اس نے نزدیک آ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ مجھے اس

تھا۔ چنانچہ تھانیدار کو اپنے استھان پر بندھے بتل کے پاس لے جایا گیا۔ جب تک بتل کے گلے سے ٹوٹی ہوئی ری نکال کر دوسری ری ڈال دی گئی تھی۔ تھانیدار بتل کے گرد گھوم گیا۔ جب اس کی نظر بتل کے سینگوں پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ ایک سینگ کی ٹوک پر ہلکا سا خون لگا ہے۔ بتل نے کسی کو ڈھی کیا یا یہ خون مقتول کے جسم کا ہے۔ تھانیدار گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اسی دوران شفاعت کو جو تھانیدار کے قریب بیٹھا ہوا تھا کسی نے آواز دی وہ اٹھا اور لنگڑاٹا ہوا چلنے لگا۔ اچانک تھانیدار کی نظر شفاعت پر پڑی تو اسے جھٹکا سا لگا۔ وہ شفاعت کو لنگڑا کر جاتے آتے تھوڑی دیر دیکھا رہا۔ تھانیدار نے اس سے پوچھا کہ تم لنگڑا کر کیوں چل رہے ہو تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شفاعت کا رنگ بدلا۔ فوراً سنبھل کر بولا کہ اسے جب باپ کے مرنے کی خبر ملی تو وہ گھر کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ راستے میں اچانک ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر گر پڑا وہیں سے کولھے پر چوٹ آئی ہے۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ وہ اسے چوٹ یا زخم دکھائے۔ اس نے پس و پیش کی لیکن سرکار کا حکم تھا اسے چادر بٹا کر زخم دکھانا پڑا۔ وہ عجیب طرح کا زخم تھا۔ تھانیدار نے اب تک کئی چوٹیں اور زخم دیکھے تھے کئی پٹی لاشیں بھی دیکھیں تھیں لیکن اس جیسا زخم نہیں دیکھا تھا۔ زخم ایسی جگہ تھا کہ اس کی چادر پر بھی خون لگا ہوا تھا۔

تھانیدار شفاعت کو تھانے لے گیا۔ زیادہ تفصیل تو سامنے نہ آئی کہ کس طرح شفاعت نے راتوں رات اقبال بزم کر لیا کہ باپ کو اس نے قتل کیا ہے اور یہ کہ بیوی کے کہنے پر کیا ہے۔ البتہ اس نے بتایا کہ اس نے کھیتوں میں لے جا کر باپ کو قتل کیا۔ ہم علی آج باپ بیٹھا ڈبہ (بتل) اور مل والے دیگر بتل لے کر کھیتوں میں پہنچے۔ ذہ کو باپ نے ایک چھوٹی سی بیری کے ساتھ باندھا اور اس جو ستے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے اچانک لاشیں

باپ کے خلاف مجز کا شرع کر دیا کہ اس کا باپ اس پر بری نظر رکھتا ہے اور اشاروں کنایوں سے اسے ورغلا تا ہے انہیں یہ بات صحیح ثابت کرانے کے لئے اس نے ایک دو ہار شفاعت کے سامنے اس کے باپ سے جھگڑا مول لیا۔ اس پر تہمت لگائی اور اسے برا بھلا کہا۔ نتیجتاً ماں بیٹی کی منہ ماری ہوئی۔ ماں نے لامحالہ اپنے خاوند کی طرف داری کی اور بیٹی کو برا بھلا کہا۔ ادھر شاداں برابر باپ کے خلاف شفاعت کے کان بھرتی رہی اور اسے مجز کا بیٹی رہی۔

یہ کہ اس کے باپ کی نظر اس کے بارے میں صاف نہیں اور وہ بہت تنگ ہے اس گھر میں۔ یہاں تک کہ شاداں نے باپ بیٹے کو آپس میں لگرا دیا۔ بیٹے نے باپ پر کھلم کھلا بدکاری کا الزام لگا دیا۔ باپ بھی طیش میں آ گیا اس نے کہا کہ تونے بد چلن عورت گھر میں رکھی ہوئی ہے جو خود خراب ہے اور مجھ پر جھوٹا الزام لگاتی ہے۔ اس عورت سے شادی سے پہلے تمہارے ساتھ تعلقات تھے۔ باپ بیٹے کی ٹوٹکار بڑھ کر ہاتھ پائی میں بدل گئی۔ عورتوں کے شور مچانے پر محظوم وار اکٹھے ہو گئے جنہوں نے باپ بیٹے کو چھڑا لیا۔ ادھر شفاعت جوان تھا اور باپ ادھیر عمر کا بوڑھا۔ شفاعت نے فیصلہ کر لیا کہ وہ باپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

آخر موقع ملنے پر شفاعت نے اسے کھیتوں میں لے جا کر لاشی کی ضربوں سے مار ڈالا۔ شفاعت کو عرقید ہو گئی۔ یہ قید خانہ والی اور اسے کافی پڑی۔ پیچھے کچھ عرصہ کے بعد شاداں کی ماں مر گئی اور شفاعت کے گھر آنے تک شاداں کی قابل رشک جوانی بھی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی۔ کچھ عرصہ ہوا شفاعت بھی اس دنیا فانی سے کوچ کر گیا۔ شاداں ابھی بقیہ حیات ہے۔ جوانی میں ہیر کہلاتے والی شاداں کا حسن بڑھاپے میں بھی نہ نہیں پڑا ہے۔



رودت کو لٹ پر لکر ماری کہ میں دور جا کر۔ اس کا نوکیلا سینک میرے کولھے میں اتر گیا تھا اور مجھے زخمی کر گیا۔ تیل پھر میری طرف دوڑا۔ میں اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا اگر میں نہ اٹھتا تو تیل مجھے مار ڈالتا۔ میں دوڑا پڑا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا، میں نے باپ کو مارتے دیکھا تھا۔ وہ بہت اذیت ناک موت مرا تھا۔ میں دوڑنے کے قابل نہیں تھا لیکن موت کے ڈر سے دوڑ پڑا۔ تیل بھی میرے پیچھے بھاگا لیکن تھوڑی دور بھاگنے کے بعد رک گیا اور واپس میرے مرے ہوئے باپ کی طرف چلا گیا اور اسے جا کر چائے لگا۔ میں بھاگ آیا اور گدھالہ چلا گیا۔ وہاں پر گھر سے بھیجے ہوئے شخص نے مجھے کہا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے۔ میں روتا پیتا گھر کو دوڑا دیکھا کہ لوگ باپ کی میت کھڑے آئے تھے۔

اس کا سارا سر زخمی تھا۔ اس پر خون جما ہوا تھا اور دس بھی رہا تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ میں نے کہا جلدی کرو اسے دفن کر دیں۔ میت کو اندر دھو (اندھ والے کمرے) میں لے جا کر غسل دیا اور جلدی جلدی میں میت دفنادی۔

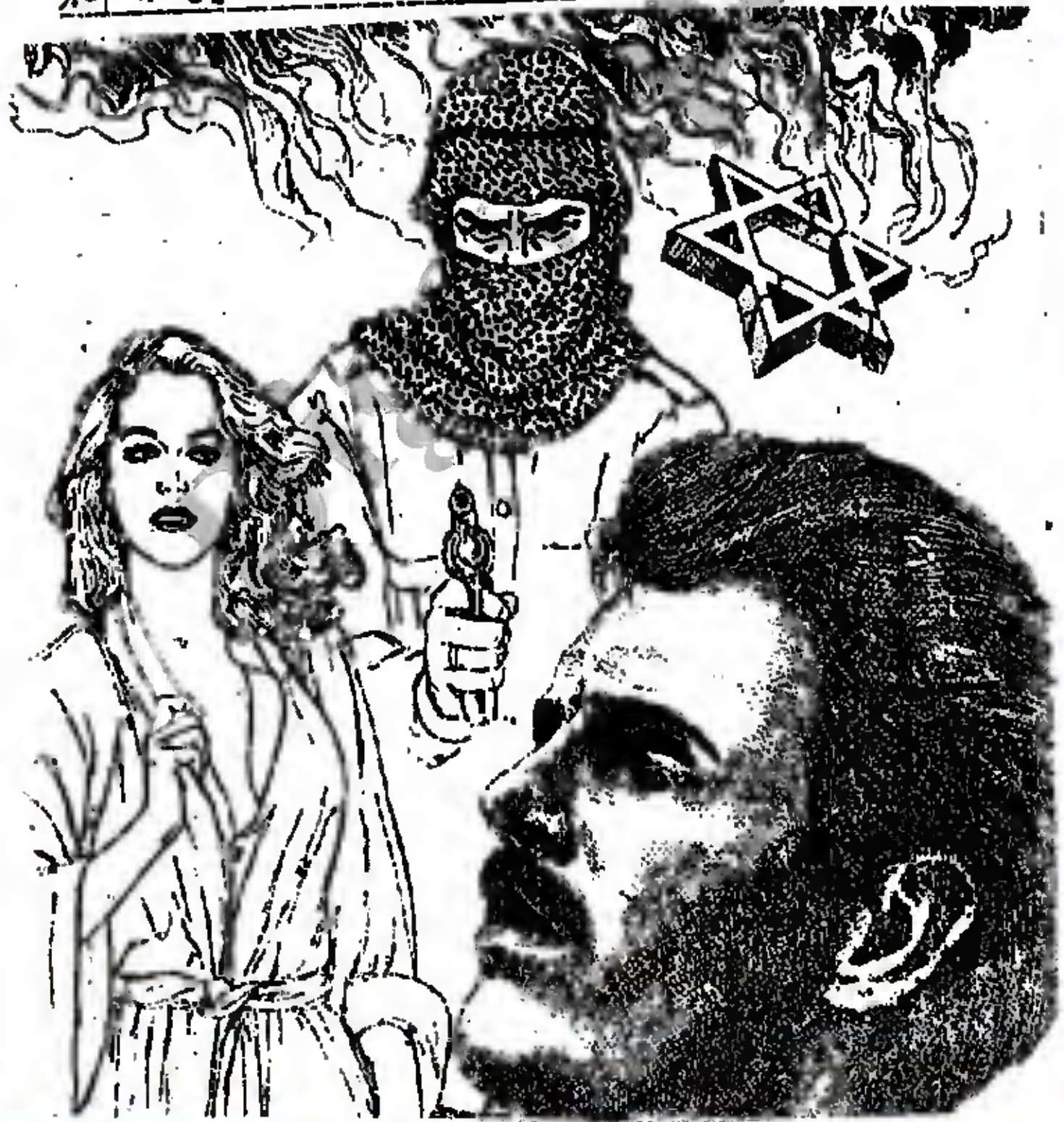
جب قاتل سے پوچھا گیا کہ اس نے باپ کا قتل کیوں کیا؟ تو اس نے بتایا کہ اس نے یہ قتل اپنی بیوی شاداں کے کہنے پر کیا ہے جس کی کہانی کچھ یوں تھی کہ جب ماں بیٹی ساس بہو بن کر اس گھر میں آئیں تو ان کے مابین روایتی رقابت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ برتن سے برتن ٹکرانے لگے۔ وہی آٹا گوندھتے تھیں کیوں ہو والی بات۔ منہ ماری شروع ہو گئی۔ ایک روز باتوں باتوں میں بیٹی نے ماں کو طعن دیا کہ تم تو وہ ہو جو میرا باپ کھا گئی تھی۔ میرے باپ کو تم نے مارا تھا، وہ اپنی موت نہیں مرا تھا اور وہ بھی اپنے اس یار کے پیچھے جواب تمہارا خاوند ہے لیکن تم دیکھنا میں تمہارا یہ ماں بھی توڑ کر رکھ دوں گی۔ میرا نام بھی شاداں ہے۔ اسی روز سے شاداں نے شفاعت کو اپنے

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

# انتقام

"میں حماس کے شیطانی بچوں کو نیست و نابود کر دوں گا"۔ نٹن پاہو نے گرج کر کہا۔ "یہ انتقامی کارروائی ایسے کی جائے کہ اخبارات یہ نہ کہیں کہ اسرائیل نے بدلہ چکایا ہے..... یہ انصاف اور کئے کی سزا نظر آنا چاہئے۔"

قسط: 6 ☆ 00447424014120 ..... مہماں محمد ایمان طاہر



## ”ابو جہاد“ کا قتل

اکتوبر 1995ء کے وسط کی بات ہے، موساد انٹرنل سکیورٹی کا ایک ایجنٹ دینی ٹیکنر کے ذریعے تل ابیب کے نواح میں ہنسکر سٹریٹ (Pinsker St.) پر واقع ایک اپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہا تھا جہاں وہ اندر کی کھنگو اور بات چیت سننے کے لئے ”ہنگ ڈیو آؤٹ“ لگاتا چاہتا تھا۔ یہ اپارٹمنٹ ان بے شمار عمارتوں میں سے ایک تھا جو موساد نے شہر میں اپنی خفیہ سرگرمیوں کے لئے بطور محفوظ ٹھکانے، حاصل کر رکھی تھیں۔ ہنگ ڈیو آؤٹ لگانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہاں کچھ ہی دیر بعد موساد کے یروں کی انتہائی اہم میٹنگ ہونے والی تھی۔

اپارٹمنٹ میں موجود فرنیچر معمولی قسم کا تھا۔ کچھ معمولی قسم کی اسرائیلی سیاحوں کی تصویریں سینے قسم کے فریموں میں لگی دیواروں پر لٹک رہی تھیں۔ ہر کمرے میں الگ ٹیلیفون موجود تھا جس کا کسی ڈائریکٹری میں اندراج نہ تھا۔ ہادرچی خانے میں گھریلو استعمال کے برتنوں کی جگہ کمپیوٹر موڈیم، کاغذات کترنے والی مشین، ٹیکس مشین اور چولہے کی جگہ پر ایک سیف نصب تھی۔

ایسے اپارٹمنٹ یا محفوظ ٹھکانے موساد کے زیر تربیت جاسوسوں کی رہائش، ٹریننگ عملی تربیت، دوسروں کا شہر میں پہنچا کرنے، اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے، ہلاکت خیز لیٹر بکس تیار کرنے، نظر نہ آنے والی سیاسی رپورٹ لکھنے اور اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے کو اطلاعات پہنچانے کی تربیت دی جاتی تھی اور زیر تربیت جاسوس جو میں گھنٹے اپنے اساتذہ کی نظروں میں رہتے تھے۔ عام لوگوں سے دوستی اور پیار محبت کے تعلقات پیدا کرنے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے ٹر سکھائے جاتے تھے۔ انہیں ذہن نشین کرایا جاتا تھا کہ ”وہ کام جو موساد اور اسرائیل کے

مخالف میں ہو غلط یا صحیح کر گزر رہا۔“

1991ء میں موساد کے ایک جوئیرالسر وکٹر اسٹرو وکی کے انکشاف کے مطابق دنیا بھر میں موساد کے تربیت یافتہ جاسوسوں کی تعداد 35000 ہزار تھی۔ ان میں سے عربوں کو بلیک ایجنٹ اور ہاقیوں کو وائٹ ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ ان میں سے 20 ہزار ہمہ وقت اپنی نظریہ کارروائیوں میں مصروف رہتے تھے اور 15 ہزار ایسے تھے جو اشارے کے منتظر رہتے تھے، انہیں سلپہر کہا جاتا تھا۔

اسی روز بعد دوپہر تہذکرہ اپارٹمنٹ یا محفوظ ٹھکانے پر اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سینئر حکام کا اجلاس ہوا جس میں ”ایک شخص“ کے قتل کی منظوری دی گئی اور اس کا طریق کار طے کیا گیا۔ وزیراعظم یزہاک راہن (Yitzhak Rabin) کی طرف سے پہلے ہی اس شخص کے قتل کا منصوبہ منظور کیا جا چکا تھا۔

تین سال قبل، جب سے راہن وزیراعظم بنے تھا، وہ فلسطینی دہشت گردوں کے ہاتھوں اسرائیلی فوجیوں، جاسوسوں اور شہریوں کے جنازوں کو کندھا دیتے دیتے تھک چکا تھا۔ اس قتل کی نگرانی اُس نے اپنے ذمہ لے لی تھی جبکہ وہ 1988ء میں وزیر دفاع تھا۔

یاسر عرفات کا نائب خلیل الوزیر جو عرب دنیا اور اسرائیل انٹیلی جنس موساد کے حلقوں میں ابو جہاد کے نام سے مشہور تھا۔ اسرائیلی جاسوسوں، مجرموں، فوجیوں اور شہریوں کو نشانہ بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ تل ابیب کی ہنسکر سٹریٹ کے اسی اپارٹمنٹ میں ابو جہاد کی ہلاکت کا فیصلہ ہوا تھا۔ ابو جہاد کا معنی تھا ”مقدس جنگ کی آواز“۔

خلیل الوزیر معروف بہ ابو جہاد 1988ء میں تونس (Tunisia) میں رہتا تھا۔ اُس کا رہائشی بنگلہ تونس کے نواح میں سدی بومعید کے علاقے میں تھا۔ وہ سینے تک

ایک جہاز میں وزیر دفاع بن ہاک رابن اور دوسرے اعلیٰ ملٹری افسر تھے۔ ان کا جہاز مسلسل محفوظ ریڈیو کے ذریعے قاتل ٹیم سے رابطے میں تھا جو موقع واردات پر پہنچ چکی تھی۔ اس قاتل ٹیم کے نگران کو ”گوار“ کا کولڈ نام دیا گیا تھا۔ دوسرے جہاز میں جیمزگ اور نگرانی کے آلات گئے ہوئے تھے۔ دوسرے دو بونگ 707 فیول ٹینکر کے طور پر اڑ رہے تھے۔ ابو جہاد کے ہنگلے کے اوپر، انتہائی بلندی پر اب یہ جہاز پتھر لگا رہے تھے اور اپنے محفوظ ریڈیو کے ذریعے زمین پر ہونے والی ہر حرکت کی نگرانی کر رہے تھے اور ابو جہاد کے ہنگلے میں پہلے سے نصب کئے گئے آلات سماعت کے ذریعے ہنگلے کی ہر آواز انہیں صاف اور واضح سنائی دے رہی تھی۔ 17 اپریل کو، آدمی رات کے کچھ ہی دیر بعد انہوں نے اپنے آلات کے ذریعے سنا کہ ابو جہاد اپنی مرسلینز کار کے ذریعے ہنگلے میں آیا ہے۔ یہ مرسلینز کار اسے پاس عرفات نے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اب قاتل ٹیم بھی ہنگلے کے اندر ہونے والی ہر حرکت اور آواز کو سن رہی تھی۔ ٹیم کے لیڈر گوار نے اپنے لیڈوں کے ساتھ لگے مائیکروفون میں سرگوشی کی کہ وہ ابو جہاد کو بیڑیاں چڑھتے ہوئے سن رہا ہے۔ اپنی بیوی سے کھسکھس کر کہتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں اپنے سوئے ہوئے بیٹے کا بوسہ لے رہا ہے۔ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ آخر میں وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں، جو چھٹی منزل پر تھا چلا گیا ہے۔ یہ تمام لمحہ بہ لمحہ کی تفصیل الیکٹرانک آلات سے حرین جہاز کے ذریعے رابن کے کالوں تک پہنچ رہی تھی۔ صبح 12:17 بجے رابن نے حکم دیا۔ ”گو۔“

ہنگلے کے صحن میں ابو جہاد کا ڈرائیور مرسلینز کے اندر ہی سو رہا تھا۔ گوار کی ٹیم کے ایک رکن نے اپنے سلفر لگے بریٹا ہستول کی ایک گولی اس کے کان کے اندر فائر کر کے فرنٹ سیٹ پر موت کی نیند سلا دیا۔ گوار

موساد کے ہخیم ایجنٹ اور جاسوس ابو جہاد کی نگرانی کرتے رہے۔ حرین راستوں سے وہ گھر سے نکلتا تھا، جن سڑکوں سے گزرتا تھا، اس کے ہنگلے کے ارد گرد لگے ہنگلے کی مضبوطی، اونچائی، دروازوں، کھڑکیوں، ٹائلوں کی قسم، حفاظتی حصار، محافظوں کی تعداد، اس کی گھر میں آندورفت کے لوازمات، غرضیکہ موساد کے ہخیم ایجنٹوں نے ہر چیز نہایت احتیاط، ہار یک بینی سے بار بار چیک کی۔ انہوں نے ابو جہاد کی بیوی کو اپنے گھر میں اپنے بچے کے ساتھ کھلتے ہوئے بھی دیکھا اور جب وہ شاپنگ کے لئے بازار گئی اور ہال کٹوانے میجر ڈیریر کی دکان میں داخل ہوئی تو اجتماعی قریب سے اس کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اس کے خاوند کی ٹیلیفون کالیں بھی سنیں اور اس کی خواب گاہ میں خفیہ بات چیت سننے کے آلات (ہلنگ ڈیوائسز) بھی لگا دیں اور میاں بیوی کے ہم بستر ہونے کی آوازیں بھی ریکارڈ کیں۔ جاسوسوں نے ابو جہاد کے گھر کے کمروں کا فاصلہ بھی نوٹ کر لیا اور ان کے مسابو کی سرگرمیوں پر نظر رکھی اور ان تمام گاڑیوں کی رجسٹریشن نمبر، میک اور مالل بھی نوٹ کئے جو اس کے گھر میں آیا جا رہا کرتی تھیں۔

اپنے کام سے مطمئن ہو کر موساد کے ایجنٹوں کی ٹیم واپس تل ابیب چلی گئی۔ اگلا مہینہ انہوں نے اس ہلاکت خیز مشن کی عملی تکمیل کے لئے جیلہ کے لواحق میں ابو جہاد جیسے ہنگلے میں بار بار پریکٹس کی۔ قاتل ٹیم کے ذہن میں یہ بات بنی تھی کہ ابو جہاد کے ہنگلے میں داخلے کے بعد 22 سیکنڈ کے اندر اسے قتل کر کے ٹیم کو ہنگلے سے نکل آنا ہے۔

16 اپریل 1988ء کو مشن کی تکمیل کا حکم صادر کر دیا گیا۔

اس رات اسرائیلی ائرفورس کے بونگ 707، کئی جہازوں نے تل ابیب کی جنوبی اتر میں سے اذان بھری۔

کی امداد سے بائو کیمیکل اٹھیا رہا۔ نے جاسکتے تھے۔ موساد کی طرف سے کید کو اس طرح قتل کیا گیا تھا کہ اس کے دونوں بازو اور ٹانگیں دھڑ سے الگ کر دی گئی تھیں۔

جوہانسبرگ پولیس کے پیپ تحقیقاتی انسٹرکٹل چارلس لینڈ مین نے بتایا کہ اس قتل کا صاف مقصد اسرائیلی کی طرف سے موساد کے ذریعے ایک پیغام دینا تھا کہ اسرائیل دشمنوں کی خفیہ دہشت گردی کے ”مساو“ کی پتلی سے دور نہیں ہیں۔

ابو جہاد کی ہلاکت سے پہلے ہی قتل موساد نے ایک اور قتل عام میں حصہ لیا تھا جبکہ جبل الطارق میں آئرش ری پبلک آرمی (IRA) کے تین غیر مسلح ممبران کو برطانیہ کی سیکرٹریز سرسز کی وردیوں میں لمبوں افراو نے اتوار کی سہ پہر کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ برطانوی انٹیلی جنس کے ممبران کو ایسے قتل کی تربیت گزشتہ سالوں میں مل ایب میں دی گئی تھی اور انہیں دکھایا گیا تھا کہ موساد کے خفیہ ایجنٹ بیروت شہر کی گلیوں اور لبنان کی بقاء ویلی میں کس مہارت اور چابک دستی سے عرب دہشت گردوں کا نشانہ کرتے ہیں۔

آئی آر اے کے ان تین ممبران کے قتل سے چار ماہ پہلے موساد کے ایجنٹوں نے ان تینوں مافی ریڈ فارمل زبان سادق اور دھیل میک کان کی مگرانی شروع کر دی تھی کیونکہ موساد کو شبہ تھا کہ وہ آئی آر اے (IRA) کے لئے عربوں سے اسلحہ خرید کر بلٹاسٹ پہنچا رہے ہیں۔

موساد اور برطانوی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان تعاون اور رابطوں کا آغاز اُس وقت چھپر کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ہوا تھا جب انتہائی خفیہ طور پر موساد کے سربراہ رانی ایتان کو بلٹاسٹ بنایا گیا تھا تاکہ وہ سیکورٹی اداروں کو آئی آر اے اور حزب اللہ کے درمیان بڑھتے ہوئے رابطوں اور تعاون ہارے ثبوت اور معلومات مہیا کر سکیں۔ ایتان کے اپنے الفاظ میں:

اور قاتل ٹیم کے ایک دوسرے ممبر نے رہائش گاہ کا لاسے کا ہماری گیٹ ایک ایسے پلاسٹک دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا ہوا ڈاکٹر ہانکل پیدا نہیں کرتا۔ گیٹ کے اندر ابو جہاد کے ویلف گیت کے اچانک گرنے سے ششدر کھڑے تھے کہ سٹیمر لگے پستول کی دو گولیاں دونوں کے دماغ سے آ رہی ہو گئیں۔ مطالعے کے کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے تلواریں دیکھا کہ ابو جہاد تحریک آزادی فلسطین کی ایک ویڈیو دیکھ رہا ہے۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر جیسے ہی اس نے اٹھنے کی سعی کی تلواریں نے اپنے خاموش پستول کی دو گولیاں اُس کے سینے میں اتار دیں اور جیسے ہی وہ فرش پر گر ا تلواریں نے دو مزید گولیاں اُس کے دماغ کے آ رہا کر دیں۔ تلواریں جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا ابو جہاد کی بیوی اپنا بچہ گود میں اٹھائے سامنے آ گئی۔ تلواریں نے اُسے عربی زبان میں حکم دیا۔ ”واپس اپنے کمرے میں چل جاؤ۔“

پھر قاتل ٹیم رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ جگہ میں داخل ہونے سے لے کر اپنا مشن مکمل کر کے باہر نکلنے تک انہیں صرف 13 سیکنڈ لگے۔ اُس سے نو سیکنڈ کم جس کا انہوں نے اپنی پریکٹس اور ٹریننگ کے دوران اندازہ لگایا تھا۔

اس قتل کے بعد پہلی دفعہ اسرائیل میں رد عمل سامنے آیا۔ کابینہ کے وزیر ایزر وائزمن (Ezer Weizman) نے کہا۔ ”اس طرح کے الطراوی قتلوں سے امن بحال نہیں ہو سکتا۔“

لیکن موساد کی طرف سے قتل و غارت گری کا عمل پھر بھی جاری رہا۔

دو ماہ بعد ساؤتھ افریقہ کی پولیس بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی جسے اسرائیل نے خاموشی اختیار کرنے کے لئے دباؤ ڈالا تھا کہ جوہانسبرگ کے ایک معروف تاجر الان کڈگر (Allan Kidger) کو جو ایران اور عراق کو انتہائی جدید ترین ٹیکنیکی ساز و سامان سپلائی کر رہا تھا جس

بہت سی کھنکھیں موساد نے تجربی کر کے بلٹاسٹ کو جاتے ہوئے رستے میں پکڑوا دیں۔

اکتوبر 1995ء کے جس اجلاس کا ذکر اس باب کے شروع میں کیا ہے اس میں ایک اور عرب مجاہد اور مذہبی رہنما اسلامک جہاد کے قائد فٹی شکا کی (Fathi Shakaki) کے قتل کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ موساد نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اسی سال جنوری میں بیت لد (Belt Lid) کے مقام پر دو خودکش حملہ آوروں کے ذریعے اسرائیلی بس پر حملے کی منصوبہ بندی اس کی عظیم نے کی تھی جس میں 20 سے زائد مسافر ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے تھے اور بس بالکل تباہ ہو گئی تھی۔

دہشت گردی کے اس حملے نے چوتھائی صدی کے دوران ایسے حملوں کی تعداد دس ہزار سے اوپر پہنچا دی تھی۔ اس میں چار صد اسرائیلی مارے گئے اور ہزار سے زائد اپالاج بن گئے تھے۔

اس بے رحم دنیا میں شکا کی (Shakaki) کو اس کے لوگ "شیر" بنا کر پیش کرتے تھے۔ یعنی انتہائی بڑے بہادر اور جی وار۔ اس نے خودکش بمبار لڑکوں کو قرآن کی خودکشی ہار سے پابندی کے خلاف، مغفرت کی دعا دیجے ہوئے دہشت گردی کی اجازت دینی تھی۔ اس نے جواز یہ پیش کیا تھا کہ مظلوموں کے حق کے لئے جان قربان کرنا جائز ہے۔

اس طرح مذہب کی غلط تعبیر سے، مذہبی جوش و جذبے کے تحت دونوں جوان دوسروں کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

بعد ازاں شکا کی نے نہ صرف جہادی اخبارات میں ان کے تعزیت نامے چھوئے بلکہ نماز جمعہ کے بعد دعائیں بھی، ان کی قربانی کی تعریف کی اور ان کے والدین کو یقین دلایا کہ ان کے بچے سیدھے جنت میں گئے ہیں۔

"میں جب آئرلینڈ پہنچا تو ہارٹس میں رہی تھی۔ وہاں ہر روز ہی ہارٹس ہوتی رہتی تھی۔ میں نے برطانویوں کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمارے ظلم میں تھا۔ پھر میں نے صوبے کا دورہ کیا اور ریپبلک کی سرحد تک چلا گیا۔ میں غلط تھا کہ کہیں سرحد پار نہ کر جاؤں۔ اگر ریپبلک واپس مجھے پکڑ لیتے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان کا کیا رد عمل ہوتا۔"

"واپسی سے قبل میں نے سوشل آرمی سروں (SAS) سے کہا کہ وہ اسرائیل آئیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ہم دہشت گردوں سے کس طریقے سے نبھتے ہیں۔"

چنانچہ انہی ابتدائی دنوں سے ایس اے ایس اور موساد کے درمیان قریبی تعاون کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ موساد کے سینئر افسر ایس اے ایس کے ہنر فوروڈ میں واقع ہیڈ کوارٹر کے دورے کر کے موساد کی طرف سے ڈل ایسٹ میں کئے جانے والے آپریشنوں ہارٹس سوشل فورمز کو آگاہ کیا کرتے تھے کم از کم ایک دلدہ موساد اور ایس اے ایس نے باہمی اشتراک سے آئی آر اے کے سینئر رہنماؤں کی بلٹاسٹ سے بیروت تک نگرانی کیا اور حزب اللہ کے رہنماؤں سے ملاقات کرتے ہوئے ان کی تصویریں بھی اتاریں۔

اکتوبر 1987ء میں بیروت میں موساد کے ایجنٹوں نے ایک بحری کشتی ایکسوند (Eksund) کا سراغ لگا یا جو سیڈی میرین سمندر میں محسوس تھی۔ اس کشتی پر 120 ٹن ہتھیار لدے ہوئے تھے جس میں زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل، راکٹ پروپیلنڈ گرینینڈ ناچرز، مشین گنیں، دھماکہ خیز مواد اور ڈیوٹیر وغیرہ شامل تھے اور یہ تمام اسلحہ آئی آر اے کے آدمیوں نے بیروت میں اپنے رابٹوں کے ذریعے خرید کیا تھا۔ اس بحری کشتی کو فرانسیسی حکام نے پکڑ لیا۔ اسی طرح کی اسلحہ کی اور بھی

اُس کا لباس لندن کے سادہ دو سنور کے بہترین کپڑے سے بنا ہوا چنڈ اور پاؤں میں روم سے خریدے ہوئے میچے ترین جوتے ہوتے تھے۔ وہ عام چپل نہیں جو وہ لوگوں کے سامنے آتے وقت پہنا کرتا تھا۔

اپنے پسندیدہ کھانے کی میز پر بیٹھا وہ اپنی اہلیہ کو یقین دہانی کر رہا تھا کہ اُس کا آئندہ کالیسیا کا سفر انتہائی محفوظ اور ہر لحاظ سے کامیاب رہے گا اور وہ لیبیا کے انقلابی لیڈر معمر قذافی سے دس لاکھ ڈالر کی ادائیگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کی اُس نے اپنے ٹیکس پیغام کے ذریعے لیبیا کی انقلابی کونسل کے ہیڈ کوارٹر سے درخواست کر رکھی تھی۔ معمول کے مطابق یہ رقم لیبیا کے سرکاری بینک کے ذریعے ترکیبولی سے مالٹا کے ذریعے ولایتا بینک کی برانچ میں منتقل کر دی جائے گی۔

ٹیکا کی ایک دن کے لئے طیارے پر جائے گا اور رقم لکھوا نراگی ٹلائٹ سے واپس گھر آ جائے گا۔ اُس کے دو کمسن بیٹوں کو جب اپنے ابا کے مالٹا جانے کی بھینک پڑی تو انہوں نے بھی اپنے تحائف کی لہریست اُسے جمادی جس میں آدمی درجن شیش بھی شامل تھیں جو مالٹا کے اس شور کی بنی ہوئی تھیں جہاں سے وہ پہلے بھی خریداری کیا کرتا تھا۔

فاطمہ کو یاد آتا ہے کہ اُس کے میاں کا خیال تھا کہ اگر اسرائیلیوں نے اُس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہوتی تو اب تک کمرچکے ہوتے کیونکہ یہودی انتقام لینے میں دیر نہیں لگاتے۔

فاطمہ ٹیکا کی حریف کہتی ہے کہ "میرے خاوند کو یقین تھا کہ اسرائیلی اُس کے خلاف کوئی ایکشن لے کر شام کی بارانگی کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔" (شام اور اسرائیل کے درمیان امن کا معاہدہ ہو چکا تھا)

تین مہینے پہلے تک تو تل ابیب کا رویہ وہی تھا جس کا ٹیکا نے اندازہ لگایا تھا۔ 1995ء کی گرمیوں کے

چنانچہ جس علاقے اور گلی محلوں میں ٹیکا کی کا اثر و رسوخ تھا وہاں کے والدین بڑے فخر کے ساتھ اپنے نو عمر بچے جہاد کے لئے اُسے پیش کرنے لگے۔ اب تک جو قربان ہو چکے تھے ان کے حق میں ہر اذان کے بعد لاڈلہ سپیکر پر دعائیں کی جاتی تھیں اور جنوبی لبنان کے معتدل مومنوں والے علاقوں میں مسجدوں میں شہدا کو یاد کیا جاتا تھا۔

ٹیکا کی نے اپنے لئے مجاہد تیار کر لئے۔ ان کا ہدف مقرر کر لیا گیا اور ٹیکا کی نے انہیں بم سازوں کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ ماہرین تھے جو اپنے ہدف کی تصویر دیکھ کر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ اس کی پتائی کے لئے کتنا دھماکہ خیز بارود چاہئے۔ وہ اپنے تجربے اور جبلت کے تحت کام کرتے تھے۔ کام کے دوران ان کی زبان پر ہمیشہ الحمد للہ، استغفر اللہ، انشاء اللہ، ماشاء اللہ جیسے کلمات جاری رہتے تھے کیونکہ وہ ٹیکا کی کے معتقد تھے۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ "ہم اسی لئے زندہ ہیں کہ ہم اپنے دشمن اسرائیل کا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

اکتوبر کی اس سہ پہر کو جب کہ تل ابیب کے ایک حفاظتی مرکز میں اُس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ٹیکا کی اپنی بھابی فاطمہ کے ساتھ اپنے گھر دمشق (شام) میں موجود تھا۔ مہاجر کیمپ کے عام گندے ماحول کی نسبت اس کا اپارٹمنٹ بڑا صاف ستھرا اور خوبصورت تھا اور اس کی عزت اور احترام تھا۔ اس کے گھر میں قیمتی قالین اور دیواری سجادیں ایران کے آیت اللہ سے ملے ہوئے تحائف تھے۔ سونے کے فریم میں لگی ہوئی ٹیکا کی اور معمر قذافی کی تصویر لیبیا سے رہنما کا تختہ تھا۔ پابندی کا بیڑا ہوا ایک کافی سیٹ شام کے صدر کا عنایت کردہ انعام تھا۔ اس کے کپڑے اس سادہ سے گون سے بہت اعلیٰ قیمتی تھے جو وہ اپنے جنوبی لبنان کے غریب غلام کے درمیان نماز کے خطبات کے دوران پہنا کرتا تھا۔ گھر کے اندر

موجود اپنے بلیک لیٹنٹ کو حکم دیا کہ وہ شکا کی کے پارلمنٹ کی الیکٹرانک نگرانی شروع کر دے۔ اسرائیلی ایجنٹ کے پاس سرو پبلس اور نگرانی کے امریکن ساختہ جدید ترین الیکٹرانک آلات موجود تھے جبکہ شکا کی کے پارلمنٹ میں لگے ہوئے روسی ساختہ حفاظتی اور وارننگ ویپے والے آلات کم معیار اور گھٹیا قسم کے تھے جنہیں ناکام اور بیکار بنانا اسرائیلی ایجنٹ کے لئے مشکل کام نہ تھا۔

شکا کی نے اپنے دور نیبیا اور مالٹا کی جو منصوبہ بندی کر رکھی تھی اس کی تمام تفصیل موساد کے ایجنٹ نے تل ابیب پہنچا دی کیونکہ ہنگ ڈیوئسز کے ذریعے گھر کے امداد ہونے والی ہر بات اسے سنائی دے رہی تھی۔ اب اکتوبر 1995ء کی سہ پہر کو اسرائیل کی تین نہایت طاقتور ایٹمی جنس ایجنسیوں کے سربراہ ہٹسکر ٹریٹ کی پرتھوم ٹریٹک میں سے راستہ بناتے ہوئے اپنے محفوظ ٹھکانے پر جمع ہوئے تھے۔ ہر ایک نے اسرائیل کے خود ساختہ دشمن کی ہلاکت کے فیصلے کی تائید و توثیق کر دی۔ میئر امیت (Meir Amit) جب موساد کا ڈائریکٹر جنرل تھا (1963-68) تو اس نے ایٹمی ہلاکتوں کے سلسلے میں ایک طریق کار اور رہنما اصول وضع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا۔

”سیاسی رہنماؤں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ان سے سیاسی طریقے سے ہی ختم کیا جائے گا۔ دہشت گردوں کے اہل خاندان کو ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر کسی دشمن سے جتنے وقت اس کے خاندان کا کوئی فرد بچ میں آ جائے تو یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہر قتل کی منظوری اس وقت کا موجودہ وزیراعظم (اسرائیل) دے گا اور ہر اقدام تو اعداد و ضوابط کے تحت اٹھایا جائے گا۔ قتل کے فیصلوں کو تحریر کیا جائے گا۔ ہر کام انہماں سنائی اور عمدگی سے انجام پانا چاہئے۔ ہمارے اقدامات کو ریاستی سرپرستی میں قتل کی نظر

شروع میں رابن (وزیراعظم) نے موساد کا یہ منصوبہ رد کر دیا تھا کہ دمشق کے نواح میں شکا کی کے پارلمنٹ کو آتش گیر مادے سے تباہ کر دیا جائے۔ یوہی ساوکی (Uri Saguy) جو اس وقت اسرائیلی ملٹری ایٹمی جنس کا سربراہ اور تمام غیبی ایجنسیوں کا نگران تھا اور موساد بھی جس کی ماتحتی میں آتی تھی نے رابن کو بتایا تھا کہ اس نے دمشق کے روپے میں بہت بڑی تہدیلی محسوس کی ہے اور (صدر حافظ) اسد (شام) اب بھی ہمیں سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ اس کی قتل کے لئے ہمیں کوئی غیر متوقع اقدام کرنا چاہئے ہمیں گولان ہائیٹ (Golan Heights) کو مکمل طور پر خالی کر کے وہاں سے اپنے ہر آدمی کو نکلنے کا حکم دینا چاہئے۔ اگرچہ یہ بہت بڑی قیمت ہے لیکن دیرپا امن کے لئے ہمیں یہ قیمت ادا کر دینی چاہئے۔“

وزیراعظم نے اس کی بات توجہ سے سنی۔ اسے معلوم تھا کہ گولان کے دفاع کے لئے پوری گولی نے کس قدر قربانیاں دی ہیں اس کے ملٹری کیریئر کا بیشتر حصہ گولان کی پہاڑی چٹانوں کے دفاع میں لڑتے ہوئے گزرا ہے۔ ان دوران وہ چار مرتبہ زخمی بھی ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ سب کچھ بھلا کر اسرائیل کے لئے طویل المدت پائیدار امن حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وزیراعظم نے شکا کی کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے کو اس وقت تک کے لئے سرفہ التوا میں ڈال دیا تھا، جب تک یوہی ساوکی امن کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

لیکن اس ریجن کے گرمائی موسم میں ان کی امن کی امیدیں مرجھا چکی تھیں اور وزیراعظم رابن نے، جواب امن کا نوبل انعام (یا سرعراق کے ساتھ مشترکہ) بھی حاصل کر چکا تھا، شکا کی کے قتل کی منظوری دے دی۔

موساد سربراہ شہجائی شاوٹ (Shavit) جس کا یہ آخری آپریشن تھا، نے دمشق میں

یودی ساگوئی کہنے لگا۔ ”ہم شاید ہی کبھی ایک دوسرے کا مقابل کرتے ہیں۔ میں امان کے سربراہ کی حیثیت سے آپ دونوں پر نظر رکھتا ہوں۔ ہمارے درمیان کام کا مقابلہ رہتا ہے لیکن ہمارے مختلف طریقوں سے کام کرنے کا مقصد وحید وہی ہوتا ہے، اسرائیل کی حفاظت بلحاظ سب ٹھیک رہتا ہے۔“

وہ تینوں دو گھنٹے تک رہائشی کمرے کی میز کے گرد بیٹھے فوجی شکار کی کھیل کے منسوبے پر غور کرتے رہے۔ اس کی ہلاکت محض انتقام ہوگا۔ جیسا کہ اسرائیل کا پائل پر ایمان ہے۔ ”آکھ کے بدلے آکھ“ لہذا ایسے قتلوں کو اسرائیلی جائز اور برحق سمجھتے ہیں لیکن موساد کے ایجنٹ بعض اوقات ایسے ضدی اور خود مر افراد کو بھی قتل کر دیتے تھے جو اپنا ہنر، تجربہ اور علم اسرائیلی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے قتل کہ اس کا ہنر، تجربہ اور علم دشمن کے ہاتھ لگے اسے ختم ہو جانا چاہئے۔

کیونکہ ایک سائنسدان ڈاکٹر گریڈل دیا کا (Dr. Gerald Bull Barrel) کا ماہر تھا۔ اسرائیل اس کی مہارت اور تجربے کو خریدنے کی کئی کوششیں کر چکا تھا۔ ہر دفعہ ہی ڈاکٹر بیل نے یہودی ریاست سے فاسلہ رکھنے کی کوشش کی۔

اس کے برعکس اس نے اپنی خدمات صدام حسین کو ایک ایسی سپر گن بنانے کے لئے پیش کر دیں جو ایٹمی، کیمیائی اور جراثیمی مواد والے گولے عراق سے براہ راست اسرائیل کے اندر تک فائر کرنے کے قابل تھی۔ اس سپر گن کی پہلی 487 ٹن اور 32 ٹن وزنی ایسے خصوصی ٹیل سے بنائی گئی تھی جو ایک برطانوی فرم نے سپلائی کیا تھا۔ 1989ء کے آخر میں شامی عراق کے شہر موصل کے توپ خانے میں اسے ٹسٹ کیا گیا تھا۔

سے نہیں دیکھا جانا چاہئے بلکہ عدالتی فیصلوں پر حکومتی عمل درآمد کا نتیجہ دکھائی دینا چاہئے۔ ہمیں قانون و قواعد پر عمل درآمد کنندگان کے طور پر نظر آنا چاہئے۔“

جب سے 1972ء میں اوپیک گیمز کی اسرائیلی میم کے قاتلوں کو انتہائی کامیابی کے ساتھ تلاش کر کے ہلاک کیا گیا تھا بعد میں قتل کئے جانے والوں کے سلسلے میں عموماً ان ہدایات کو مد نظر رکھا جاتا رہا تھا، میٹر اسیت کی موساد کی سربراہی سے رخصت ہونے کے 23 سال بعد تک اس کی ہدایات پر عمل ہوتا آیا تھا۔ آج کی میننگ میں پہنچنے والا پہلا شخص موساد کا ڈائریکٹر جنرل شامی تھا جس کے بارے میں اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ لباس اور شکل و شبہات سے تل ابیب کے کسی ادنیٰ درجے کے ہوٹل کا استقبال لکر لگتا ہے۔ اکثرے ہوئے احتیاط سے استری شدہ کپڑے اور ہاتھ ملانے وقت مخالف کے ہاتھ کو صرف چھوتا تھا۔ وہ تین سال سے اس عہدے پر کام کر رہا تھا اور ہمیشہ تاثر دیتا تھا کہ پتہ نہیں وہ کب یہ عہدہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

میننگ میں آنے والا دوسرا شخص اسرائیلی دفاعی افواج کا چیف انٹیلی جنس سربراہ میڈیٹر جنرل دوران نامیر تھا۔ تیز طرار، اپنے کیریئر کے انتہائی عروج پر اور اس کی چال و حال سے لگتا تھا کہ اس کی پوری زندگی وہ سروں پر حکم چلانے میں ہی گزری ہے۔

اور آخر میں پہنچنے والا ملٹری انٹیلی جنس کے شعبہ امان کا ڈائریکٹر یودی ساگوئی تھا کسی ہیرو کی طرح نے تھے قدم اٹھاتا۔ نرم خو لیکن خود پسند۔ وہ اپنے ہمراہیوں کو اب بھی اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، عام خیال کے برعکس اور ظاہری پھوں پھوں کے باوجود شام اب بھی امن کی بات چیت کرنے پر آمادہ ہے۔

تینوں انٹیلی جنس سربراہوں کے آپس کے تعلقات، شادت کے الفاظ میں جتنا لیکن بے جوش تھے۔

کے ہر طبقہ خیال کے لوگ قدر، پسندیدگی اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کے اشارہ ابد پر اسرائیل کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ 1960ء کی دہائی میں، جب جرمنی کے نازی سائنسدان، مصر کے ساتھ مل کر لمبی رینج کے ایسے راکٹ بنانے میں تعاون کر رہے تھے جنہیں صحرائے سینائی سے اسرائیل کے اندر تک فائر کیا جاسکے تو موساد نے ان جرمن سائنسدانوں کے قتل کی منصوبہ بندی کے لئے شامیر سے رہنمائی اور تجربہ حاصل کیا تھا۔ آزادی کی جنگ کے دوران برطانوی فوجیوں کو ہلاک کرنے میں اسے خصوصی ماہر بنانا تھا۔ شامیر نے اپنے زیر زمین کام کرنے والی خفیہ تنظیم کے گوریلوں کو جرمن سائنسدانوں کی ہلاکت کے مشن پر بھجوا دیا تھا۔ بعد ازاں قاتل مشن کے ایک ارکان اسرائیل کی آویس خفیہ تنظیم موساد کے بنیادی ممبر بنائے گئے تھے۔

شامیر نے ڈاکٹر بل کے بارے میں تیاری موساد کی فائل پر سرسری نظر ڈالی۔ فائل میں ڈاکٹر بل کی ابتدائی زندگی کا خاکہ اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر بل کو 22 سال کی عمر میں فزکس میں انگریزی دی گئی تھی۔ پھر اس نے کینیڈا کی حکومت میں آرمانٹ اینڈ ریسرچ ڈیولپمنٹ اسٹیمپلنگ میں نوکری کر لی۔ وہاں اس کی اپنے سینئر افسران سے ان بن ہو گئی جس نے اس کے دل میں جو کہ کسی کے خلاف زندگی بھر کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ چنانچہ اس نے اپنا ذاتی مشاورتی ادارہ قائم کر لیا جسے موساد کی فائل میں "کرائے کی توپیں" کہہ کر طرز کی گئی تھی۔

توپوں کی ساخت اور ایجاد میں اس کی شہرت 1976ء میں عروج پر پہنچ گئی جب اس نے 45 کلیمبر کی گن تیاری جو 25 میل کے فاصلے پر اپنے پرف کونشانہ بنا سکتی تھی اس وقت تک نیو کے پاس جو گن تھی اس کی

صدام حسن نے 20 ملین ڈالر کی لاگت سے ایسی گن تو بنائے کا حکم دیا تھا۔ بل کو بطور مشیر اور صلاح کار ایک ملین ڈالر کی تنخواہ پر اس پر جو جیکٹ پر رکھا گیا تھا۔ اس منصوبے کا کوڈ نام "بے بی لون" (Babylon) رکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر بل کی کمپنی، سس ریسرچ کارپوریشن برسل (بجیم) میں رجسٹر تھی اور اسے بطور عمارت اور پارکسٹ کی ڈیزائن کمپنی کے طور پر رجسٹر کرایا گیا تھا۔ وہاں سے کمپنی نے یورپ کے مختلف اداروں اور ٹیکسٹریوں کو اپنی ضروریات کا انتہائی پیچیدہ اور حساس ترین ساز و سامان، کمپنی کی مہیا کردہ تفصیلات کے مطابق آرڈر کیا تھا۔ ان سٹائرز میں برطانیہ کی 20 کمپنیاں اور تیار کنندگان ٹیکسٹریاں بھی شامل تھیں۔

17 فروری 1990ء کو موساد کا برسل میں تعینات ایک ایجنٹ بے بی لون سے متعلقہ دستاویزات اور تفصیلات کی ایک کاپی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہر گن دراصل میڈیم رینج ہیلیکک میزائل دور تک مار کرنے والی انتہائی خطرناک جدید ترین اور دنیا کی سب سے بڑی توپ تھی۔ اس میں آٹھ قسم کے سکڈ میزائل 1500 میل تک مار کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ نہ صرف اسرائیل کے ہر شہر کو نشانہ بنا سکتی تھی بلکہ اس کی پہنچ میں یورپ کے کئی شہر بھی آتے تھے۔ بل کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ ایک ایسی ہر گن بھی بنانے کے قابل ہو جائے گا جو براہ راست بغداد سے لندن تک مار کر سکے۔

موساد کے ڈائریکٹر جنرل ناہوم ادومنی (Nahum Admoni) نے فوری طور پر وزیراعظم یزہاک شامیر (Yitzhak Shamir) ملاقات کی درخواست کی۔ اسرائیل کی آزادی کے لئے برطانوی افواج کے خلاف بے جگری سے گوریلا جنگ لڑنے کی شہرت رکھنے والا شامیر ایک ایسا سیاسی لیڈر تھا جسے موساد

22 مارچ 1990ء کو بوقت 6.45 بجے شام تین افراد ایک کرائے کی کار میں اس اپارٹمنٹ بلائنگ کی طرف روانہ ہوئے جہاں مل کی رہائش تھی۔ تینوں کی جیکٹوں کے نیچے ہوسٹر میں ہستول تھے۔

20 مئی بعد دروازے کی کھٹکی کے جواب میں 61 سالہ مل نے اپنے پڑھائیش اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ ایک وقت 7.65 ایم ایم ہستول کی پانچ گولیاں اس کے دماغ اور گردن کے آر پار ہو گئیں۔ مل اپنے دروازے پر مردہ پڑا تھا۔ بعد ازاں مل کے بیٹے مائیکل نے دعویٰ کیا کہ مل کو وارننگ مل چکی تھی کہ موساوا سے مل کر دے گی۔ وہ یہ وضاحت نہ کر سکا کہ وارننگ کس نے دی تھی اور اس کے باپ نے اس کی پروا کیوں نہ کی؟

جیسے ہی موساوا کی قاتل ٹیم مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد پہنچ گئی۔ موساوا کے نفسیاتی جنگ کے شعبے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اخبارات، ٹی وی، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ پر وردہ گوئی کی یہ کہانی پھیلائی شروع کر دی کہ گیر اللہ مل اس لئے ہلاک ہوا کہ وہ صدام حسین کے ساتھ کئے گئے اپنے معاہدوں سے منحرف ہو رہا تھا۔ جس طرح پانچ سال پہلے گیر اللہ مل کو جو کہ ایک سائنسدان تھا اور جسے اسرائیل نے اپنے خلاف ایک دہشت گرد قرار دے کر قتل کرا دیا تھا۔ بالکل ای طرح اسی شکار کی کوردہشت گرد قرار دے کر ایک نئے وزیراعظم نے ہلاک راہن سے حکم سے ہلاک کرنے کی حکمت عملی بنائی جا رہی تھی۔

24 اکتوبر 1995ء کو دو افراد جن کے کوڈ نام مل (Gill) اور ران (Ran) تھے اور جن کی عمر 28، 29 سال تھیں، دو مختلف فلائٹوں سے تل ابیب سے روانہ ہوئے۔ ران کی منزل اتھنز (Athens) اور مل کی روم (Rome) تھی۔ دونوں ایئرپورٹوں پر انہیں مقامی ایجنٹوں کی طرف سے نئے برٹش پاسپورٹ دیئے گئے۔ وہ شام گئے پہنچنے والی فلائٹوں سے الٹا پہنچے اور ڈیپو میٹ

زیادہ سے زیادہ ریج صرف 17 میل تھی۔ لیکن ایک دلدہ پھر ڈاکٹر مل کو حکومتی روپے نے انتہائی مایوس کیا۔ یورپ کے اسلحہ سازوں کی لابی نے غیہ کو اس حد پر اور موثر توپ کی خریداری روک دیا۔ آخر کار ڈاکٹر مل نے اپنی توپ جنوبی افریقہ کو فروخت کر دی۔

ڈاکٹر مل پھر چین پہنچا اور پہلیز ریپبلک آری کی میزبانوں کی صلاحیت بڑھانے میں مدد کی۔ اس کے علاوہ موجودہ "سک ورم" (Silkworm) راکٹ کی ریج کو بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ دھماکہ خیز مادہ اٹھالے جانے کی طاقت میں اضافہ کیا۔ ان میں سے بیشتر راکٹ چین نے صدام حسین کو فروخت کر دیئے۔ عراق نے یہ راکٹ اپنے ہمسائے ایران کے خلاف اپنی طویل المدت جنگ میں استعمال کئے۔ ایران، عراق جنگ بندی کے بعد بھی عراق کے پاس لاتعداد "سک ورم" راکٹ موجود تھے اور موساوا کو یقین تھا کہ یہ اسرائیل کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔

اس دوران پروجیکٹ نے بی لون میں کافی تیزی آ چکی تھی۔ اس لمبی نالی والی توپ کی آزمائش بھی کی جا چکی تھی۔ صدام حکومت کے مخالفین جنہیں موساوا نے اپنے مخبروں اور جاسوسی کے طور پر بھرتی کر رکھا تھا، نے یہ اطلاع دی تھی کہ اس توپ سے فائر کئے جانے والے راکٹوں کی ایسی ٹانگ (نوز) تیار کی جا رہی ہے جس کے ذریعے کیمیکل اور جراثیمی جتھیا ر فائر کئے جاسکیں۔

20 مارچ 1990ء کی سہ پہر کو وزیراعظم نے ہاک شامیر نے اپنے دفتر میں ناہوم ادموئی کو منظوری دے دی کہ ڈاکٹر گراند مل کو مرنا چاہئے۔

اس فیصلے کے دو روز بعد دو افراد پر مشتمل قاتل ٹیم برسل پہنچ گئی۔ ٹیم کے استعمال کے لئے برسل میں موساوا کا وہ ایجنٹ موجود تھا جو ڈاکٹر مل کے روزمرہ معمولات اور آمدورفت پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مجموعہ خاص کیوں میرے :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ پریم کوالٹی، مارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



پاسپورٹ پیش کیا۔ بندرگاہ سے باہر آنے کے بعد اس نے ڈیوٹی ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور اگلے چند گھنٹے سمندر کنارے واقع چائے خانوں اور ساحلی ریسٹورانوں سے لطف اندوز ہوتے گزارے۔ اس نے جی بھر کر کافی پی اور انتہائی میٹھے عربی کیک کھائے۔ اس نے بہت سی ٹیلیفون کالیں بھی کیں۔

اگلے دن شکار کی اپنے بچوں سے کئے گئے ہندے کے مطابق ان کے لئے ٹریفک خرید کر ساحل سمندر پر چھل قدمی کرتا ہوا اپنے ہوٹل کی طرف چلا آ رہا تھا کہ ایک سوٹر سائیکل جس پر دو افراد سوار تھے، اس کے قریب آ کر آہستہ ہوئی اور سوٹر سائیکل سواروں میں سے ایک نے شکار کی کے سر کا نشانہ بننے لگے کر چھ گولیاں مارنے کے آر پار کر دیں۔ جہادی رہنما فوراً ہی جنت کو سدھار گیا۔ سوٹر سائیکل سوار لکھنؤ میں غائب ہو گئے۔ کسی کا بھی نام بھی کوئی پتہ نہ چل سکا لیکن اس واقعے کے ایک گھنٹہ بعد ایک پھیلیاں پکڑنے والی شکاری کشتی دلیٹا کی بندرگاہ سے نکلے اور زیر مرمت اسرائیلی مال بردار جہاز کے نیچے جا کر رک گئی۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے کپتان نے بندرگاہ کے حکام کو بتایا کہ جہاز کے انجن کی خرابی قریب طور پر درست کر دی گئی ہے اور مزید مرمت کے لئے جہاز دلیٹ کی بندرگاہ واپس جا رہا ہے۔

ایران میں جو شکار کی کا روحانی مرکز تھا، ملاؤں نے ایک روز کے سوگ کا اعلان کیا۔ وزیراعظم اسرائیل، بنہاک راہن سے تل ابیب میں اس قتل ہمارے سوال پوچھا گیا تو اس کا جواب تھا۔ ”مجھے یقیناً کوئی انہوں نہیں ہے۔“

اس کے چند ہی روز بعد اسی محفوظ ٹھکانے کے قریب جہاں راہن نے شکار کی کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ایک امن ریلی کی قیادت کرتے ہوئے تل ابیب میں 4 نومبر 1995ء کو بنہاک راہن کو بھی قتل کر دیا گیا۔ راہن کا قتل

ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں سے دلیٹا (Valletta) کی بندرگاہ کا واضح نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اسی شام کو ایک سوٹر سائیکل ران کے حوالے کی گئی اس نے ہوٹل کے شاف کو بتایا کہ وہ اس پر جزیرے کی سیر کرنا چاہتا ہے۔

ہوٹل کے شاف میں سے کسی کو یاد نہیں کہ دونوں نے کسی سے کوئی رابطہ قائم کیا ہو۔ انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت اپنے ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارا۔ جب کمرے کی گھنٹی سننے والے ایک لڑکے نے کہا کہ گل کا سوٹ کیس بہت بھاری ہے تو اس نے آنکھ مار کر کہا کہ اس میں سونا بھرا ہوا ہے۔

اسی شام کو ایک مال بردار جہاز نے جو گزشتہ روز دلیٹ کی بندرگاہ سے اٹلی جانے کے لئے چلا تھا، بندرگاہ کے حکام کو ریڈیو پیغام بھیجا کہ ان کے جہاز کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے لہذا وہ خرابی دور ہونے تک جزیرے کے قریب ہی ٹھہرے گا۔ اس اسرائیلی مال بردار جہاز کے اوپر خود موساد کا ڈائریکٹر جنرل ہبتائی شادت اور اس کے مواصلات کے ماہر ٹیکنیشن کی ایک چھوٹی سی ٹیم سوار تھی۔ انہوں نے گل کے ساتھ مواصلاتی رابطہ قائم کیا جس کے سوٹ کیس میں ایک چھوٹا طاقتور ریڈیو موجود تھا۔ اس رات گل کو بحری جہاز سے کئی پیغامات موصول ہوئے۔

اسی روز کشتی شکار کی تربیولی سے دلیٹا آنے والی بحری کشتی میں مالٹا پہنچ چکا تھا۔ شکار کی کی اس کشتی پر حفاظت کے لئے لیبیا کی سکیورٹی کے مسلح افراد موجود تھے اور ان کی ذمہ داری شکار کی کو بحفاظت مالٹا کی بندرگاہ دلیٹا تک پہنچانا تھا۔ شکار کی لیبیا کی کشتی سے اکیلا ہی ساحل پر اترا۔ اترنے سے پہلے کشتی پر اس نے اپنی داڑھی اترے سے شیو کر کے صاف کر لی تھی۔ اس نے مالٹا کے ایگریگیشن حکام کو اپنے آپ کو ابراہیم دانش کے نام سے متعارف کرایا اور اسی نام کا لیبیا کا جاری کردہ

اور تجویزے نشر ہوتے رہے تھے اور مدام حسین کی اسرائیل کے بارے آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کا نقشہ پیش کیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسرائیل میں یمن یا ہو کو "بی بی" (Bi Bi) کہا جانے لگا تھا۔ اسی روز اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بی بی جس قدر پتہ سکون، غیر جذباتی اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا اب اپنے مشیروں، سینئر افسروں، انٹیلی جنس اداروں کے سربراہوں بشمول موساد کے چیف یا طوم انتہائی مشتعل، جذباتی اور غصے سے بھرا ہوا، چیخ پلا رہا تھا۔

"میں حماس کے شیطانی بچوں کو محبت دینا بدکرداروں کا۔" اجلاس میں شامل ایک معتبر شخص کے مطابق بی بی نے اپنے سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے سینئر افسران سے کہا۔

"تم مجھے بتاؤ کہ یہ انتہائی کارروائی کیسے کی جائے گی؟ میں اخبارات میں یہ نہیں پڑھتا چاہتا کہ بی بی نے اپنا بدلہ چکا ہے۔ یہ انصاف اور کئے کی سزا نظر آتا ہے۔"

جیسے جیسے اجلاس میں بی بی کی ٹھن گرج جاری تھی موساد کا سربراہ یا طوم کانفرنس ٹیبل پر خاموش بیٹھا رہا تھا کیونکہ وزیراعظم کے بارے کی طرح چڑھتے اترتے موڑ سے اچھی طرح واقف تھا۔

"مجھے اُن کے سر چاہئیں، میں انہیں مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ پروا نہیں کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ میں چاہتا ہوں یہ کام ہر صورت میں ہونا چاہئے اور میں جلد از جلد اس کام کی تکمیل چاہتا ہوں۔"

اجلاس میں اس وقت اور بھی گرما گرمی پیدا ہو گئی جب یمن یا ہونے یا طوم سے مطالبہ کیا کہ وہ بی بی کو حماس کے رہنماؤں کے نام اور موجودہ پتے مہیا کرے۔ آٹن تک کسی بھی وزیراعظم نے ایسی خفیہ اور حساس معلومات کا

ایک ایسا پسند نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے ہوا جو راہن جیسا ہی ہے تم اور جلا وطنیت انسان تھا، ایسے جنونیوں اور جلا وطنوں کی موساد میں پڑی قدر و منزلت تھی۔ بڑا ہاک راہن، جو شکرے سے فائدہ لین گیا تھا (اس نے یا سر عرفات کے ساتھ امن کا ٹوٹل انعام مشترکہ طور پر حاصل کیا تھا)، نے اپنا پسندیدہ کتاب بائبل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"آؤ، امن کی خاطر اپنی تلواریں کا رخ اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ مل کر زراعت اور قیمتی باڑی کی طرف موڑ دیں۔"

بڑا ہاک راہن کو اس کے اپنے لوگوں میں سے ایک نے قتل کر دیا کیونکہ اس کے مخالفین کو اس کی ٹڈل ایسٹ میں امن کی کوششیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔

1998ء میں موساد کی قاتل ٹیم کے ممبران کی تعداد 48 تھی، جن میں چھ خواتین بھی شامل تھیں۔ ان سب کی عمریں 20 سال کے لگ بھگ اور تمام انتہائی فٹ تھے۔ یہ قاتل ایسب میں موساد کے ہیڈ کوارٹر کے باہر قلعہ سحر میں ایک ملٹی چھاؤنی میں رہتے تھے اور وہیں انہیں کل اور ہلاک کرنے کے نئے نئے اور جدید طریقے سکھائے جاتے تھے۔

30 جولائی 1997ء کو یروشلم کے ایک خریداری مرکز میں حماس کے دو خودکش حملہ آوروں نے 15 افراد کو ہلاک اور 157 کو زخمی کر دیا۔ اگلے روز موساد کے ڈائریکٹر دانی یا طوم نے وزیراعظم بنیامین نتھن یاہو (Benyamin Netanyahu) کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کی جس میں وزیراعظم نے واضح لفظوں میں کہا کہ حماس ہمارے انتظام سے نہیں بچ سکے گی۔

گلف وار کے دوران مدام حسین کے بارے میں سی این این (CNN) پر یمن یاہو کی طرف سے جو تبصرے

اگست 2014ء

142

حکایت

## جمہ کی فضیلت

- ☆ جمہ کے دن جہنم کی آگ نہیں جلائی جاتی۔
- ☆ جمہ کی رات دوزخ کے دروازے نہیں کھلتے۔
- ☆ جمہ کے دن مرنے والے خوش نصیب مسلمان کو شہید کا رتبہ پا جاتا ہے۔
- ☆ جمہ کے دن حج ہو تو اس کا ثواب 70 حج کے برابر ہوتا ہے۔
- ☆ جمہ کے دن ایک نیکی کا ثواب 70 نیکیوں کے برابر ہے۔
- ☆ جمہ کے دن نیک پاک خود اپنے کانوں سے درد پاک سنتے ہیں۔
- ☆ جمہ کے دن درد پاک پڑھنے کی 30 حاجتیں دنیا میں پوری ہوتی ہیں۔

(جواد حیدر - تلہ گنگ)

کہانیوں سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔ اس کے لئے اس وقت انتہائی ضروری تھا کہ اپنی اہلیت و قابلیت کا ثبوت دے۔ حماس کے کسی لیڈر کی کئی ہوائی گردن اس کی مقبولیت کو بلند یوں تک پہنچا سکتی تھی۔

ایک سینئر اعلیٰ جنس افسر نے سب کی طرف سے بولتے ہوئے کہا۔

"ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ سانپ کا سر کاٹنے سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، یہ دقت کا انتخاب ہے جو ہماری پریشانی کا سبب ہے۔ لی بی کی طرف سے بار بار "ابھی ایکشن" کی تکرار بے معنی چیز ہے۔ اس قسم کے ایکشن کے لئے انتہائی محتاط منصوبہ بندی اور رازداری شرط ہے۔ لی بی کو فوری نتیجہ چاہئے جیسے کہ یہ کوئی کمپیوٹر گیم ہے یا کوئی ایکشن فلم کا منظر ہے جس کے ہیرو کے ایکشن لی بی کو پسند آتے ہیں لیکن حقیقی

کسی مشن کی ابتدائی سطح پر اور یوں کھلے اجلاس میں مطالبہ نہیں کیا تھا۔

اجلاس میں شامل ایک سے زائد افراد نے محسوس کیا کہ یقین یا دوسرے مشن کی تکمیل اپنی ذاتی نگرانی اور خواہش کے مطابق کرانا چاہتا ہے اور اس کا واضح پیغام دینا چاہتا ہے۔

اس سے موساد کے سینئر افسروں میں بے یقینانہ اور تشویش پیدا ہونا شروع ہو گئی کہ یقین پا ہوا اپنے انتہائی جذبے کی تسکین کے لئے موساد کو اپنے انگوٹھے کے نیچے دبانے رکھنا چاہتا ہے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے باطلوم نے وزیراعظم سے کہا کہ بعد میں کسی وقت حماس کے رہنماؤں کی فہرست اسے مہیا کر دے گا۔ اس کے علاوہ موساد کے سربراہ نے جو پڑیش کی کہ ہمیں مشن کی تکمیل کے عملی پہلوؤں کو بھی زیر غور لانا ہو گا۔ حماس کے لیڈروں کی تلاش کا کام ایسے ہی ہے جیسے حریت شہر کے گٹرروں کے اندر ایک چوہے کو احوال پتہ۔

ایک دفعہ یقین پا ہونے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ کوئی بہانے بازی سننا نہیں چاہتا، وہ صرف ایکشن چاہتا ہے جو ابھی اور اسی وقت شروع ہو جانا چاہئے۔"

میننگ کے ختم ہونے پر اعلیٰ جنس افسروں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ لی بی یقین پا ہونے وہ حماس لائن پار کر لی ہے جہاں سیاسی مصالحت ختم اور عملی اقدامات کا آغاز ہوتا ہے۔ میننگ کے کمرے میں کوئی ایسا بندہ نہ تھا جس نے محسوس نہ کیا ہو کہ یقین یا دوسرے گروہی ختم کر کے اپنے جن دعوؤں کے ساتھ برسرِ اقتدار آیا تھا اب اگر اس نے سخت قسم کے اقدامات نہ اٹھائے تو عوام میں اس کے خلاف بغاوت ہو جائے گی۔ پھر ہر روز منظر عام پر آنے والے سیکندلوں نے، جس کا الزام وہ ہمیشہ دوسروں پر دھرا کرتا تھا، عوام میں اس کی مقبولیت کا گراف انتہائی چلی سگ پر چٹکی چکا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کی

اور عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔

موساد کے سربراہ یا طوم نے تمام عرب ممالک، غزہ اور مغربی کنارے میں موجود اپنے جاسوسوں اور مجبوروں کو حکم جاری کر دیا کہ حماس کو کنٹرول کرنے والی ناپیدہ قوتوں اور افراد کا پتہ چلائیں اور ان کی جائے قیام و رہائش بارے میں معلومات مہیا کریں۔ اگست 1997ء کے پورے مہینے میں یا طوم کو ہار بار وزیراعظم کے دفتر میں بلایا گیا اور اس سے پروگرامس رپورٹ مانگی گئی۔ ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی اس لیے جنس ادارے میں یہ تاثر عام ہو رہا تھا کہ وزیراعظم یا طوم پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ اس کام پر جاسوسوں اور مجبوروں کی لٹری روانہ کرے، جلد نتائج نہ ملنے کی صورت میں وزیراعظم موساد کے سربراہ کے خلاف کوئی اور ایکشن لینے پر مجبور ہوگا۔ وزیراعظم کی طرف سے اگر یہ ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکی تھی تو اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یا طوم نے صرف اتنا جواب دیا۔ ”وہ اپنی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔“ اس میں خاموش اشارہ یہ تھا کہ اگر وزیراعظم اسے ہٹانا چاہتا ہے تو یہ اس کا استحقاق تھا لیکن اس سے پرہیز اور محام میں بحث شروع ہو جانے کی اور یقین یا ہو کی اپنی کارگزاری بارے میں سوالات اٹھائے جائیں گے لیکن وزیراعظم نے اپنا دباؤ جاری رکھا کہ اسے حماس کے کسی ایک لیڈر کا سراپا ہے اور جلد از جلد۔

ستمبر 1997ء کے شروع سے یقین یا ہونے یا طوم سے رات کے کسی بھی وقت پروگرامس رپورٹ مانگی شروع کر دی۔ آخر موساد کے سربراہ کو وزیراعظم کے دباؤ کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ اس نے دوسرے مراکز اور سیشنوں سے اپنے جاسوس اور مجبور بلائے شروع کر دیئے اور بی بی کی خواہش کے مطابق نئے سرے سے ایکشن پلان ترتیب دینا شروع کر دیا۔ یا طوم ایک سخت جان فرد ہے لیکن فوری اور برق رفتاری سے ایکشن لینے میں وہ بی بی کا پاسنگ بھی نہیں ہے اور بی بی نے اپنی انٹی بے ریڈ کی

بابت باتیں شروع کر دی تھیں کہ کتنی تیزی اور پھرتی سے اس نے اپنے بھائی کی مدد سے مشن مکمل کیا تھا۔ حالانکہ دونوں مشنوں کا کوئی تقابل ہی نہیں تھا۔

9 جنوری (1997) کو تل ابیب میں خبر پہنچی کہ حماس نے پھر حملہ کیا ہے۔ اس مرتبہ انہوں نے اردن کے دارالحکومت امان میں نئے کھولے گئے اسرائیلی سفارت خانے کے پھر اتاشی کے دو سٹیورٹ گاؤڈ کو شدید زخمی کیا ہے۔

اس واقعہ کے تین دن بعد جمعہ کے روز شہادت کی نماز شروع ہونے سے قبل یقین یا ہونے یا طوم سے درخواست کی کہ وہ بروٹلم میں دہشت گردوں کے کھانے میں کے ساتھ شریک ہو۔ دونوں آدمیوں کے کھانے میں سوپ، سلاد اور کھجلی شامل تھی جو انہوں نے میز بوتل کے پانی کے ساتھ اپنے شکم میں اتاری۔ وزیراعظم نے فوراً ہی امان کے حملے بارے بات شروع کر دی۔ ”فائرنگ کرنے کے لئے حماس کے دہشت گرد سفارت خانے کے آگے قریب کیسے آ گئے؟ پہلے سے حملے کا پتہ کیوں نہ چلایا جاسکا؟ اس بارے میں موساد کا امان میں سیشن کیا کر رہا تھا؟“

یا طوم نے یقین یا ہو کو یہیں روک دیا اور بتایا۔

”امان میں حماس کے سیاسی دنگ کا کرنا دھرتا خالد مشعل نامی شخص ہے جس نے شہر میں اپنا دفتر بنا رکھا ہے۔ کئی ہفتوں تک مشعل مختلف عرب ملکوں کے سفر پر رہا ہے اور موساد کے امان سیشن نے اطلاع دی تھی کہ وہ واپس امان آ گیا ہے۔“

یقین یا ہو کا چہرہ دھک اٹھا۔ ”جاؤ اور اسے ختم کر دو اپنے آدمیوں کو امان بھیجو جو اسے ختم کر دیں۔“

چھ ہفتے تک ایک ایسے وزیراعظم کا دباؤ برداشت کرنے کے باوجود جسے ایسے آپریشن کے سیاسی عواقب و نتائج کی کوئی پروا نہ تھی۔ موساد کے سربراہ نے یقین یا ہو پر واضح کر دیا کہ امان میں ایسے آپریشن کے نتیجے میں اردن

آوروں کی قوتِ عمر کہ ظاہر کیا گیا تھا جو اسرائیلی سولین پر حملے کر رہے تھے۔

مشعل کی قتل و حرکت اور آمد و رفت کی نگرانی کی جا رہی تھی، اس کے علاوہ امان میں موساد کے شیٹن چیف نے اس کی خفیہ طور پر فوٹو اتار کر بھی تل ابیب کو فراہم کر دی تھی۔ یا طوم نے وزیراعظم کو اپنی رپورٹ کے ساتھ اپنی ذاتی رائے بھی دے دی تھی کہ امان میں شیٹن باہر کی طرف سے مشعل کا قتل، دو سال تک دونوں ملکوں کے درمیان کی جانے والی امن کی کوششوں اور موساد اور اردن کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان تعاون اور معلومات کے تبادلے کے لئے کئے گئے اقدامات کو ملایمیت کر دے گا۔

شیٹن باہر نے موساد کے سربراہ کی اس دلیل کو حقارت سے رد کر دیا اور کہا: ”اس دلیل سے اس مشن کی ناکامی کی بو آتی ہے جو میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔“

اس دوران موساد کی آٹھ افراد پر مشتمل قاتل ٹیم اپنی تیاریوں میں مصروف رہی۔ ان میں سے دو قاتلوں نے روز روشن میں مشعل کو نشانہ بنانا تھا اور باقیوں نے کار سمیت قاتلوں کے حفاظت بھاگنے میں سہولیات مہیا کرنی تھیں اور پوری ٹیم نے مشن کی تکمیل کے بعد یروشلم کے قریب واقع ایلن بی بریگ (Allenby Brighe) پار کر کے واپس اسرائیل آ جانا تھا۔

اس قتل کے لئے موساد نے جو اسلحہ استعمال کرنا تھا وہ ایک معمولی چیز تھی۔ یہ کوئی گن یا ہسٹول نہیں تھی یہ اعصاب کو زوراً مفلوج کر دینے والی نیروائیجٹ (Nerve Agent) سے بھری ہوئی ایک ٹیوب تھی (تو تھ پیسٹ کی ٹیوب کی طرح کی) یہ طریقہ کسی کو قتل کرنے کے لئے کسی اسرائیلی ایجنٹ کی طرف سے کوئی بار آور یا جارہا تھا۔ روسی انٹیلی جنس ایگنسی KGB اور روس کے ذریعہ مرنائٹ

کے ساتھ دوستی اور تعاون کے ان تعلقات کا خاتمہ ہو جائے جس کی بنیاد یمن یاہو کے پشور، یزہاک رابن نے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ امان میں مشعل کے قتل سے موساد کے اردنی انٹیلی جنس سے تعلقات بھی ختم ہو جائیں گے۔ حالانکہ موساد کو شام، عراق اور فلسطینیوں کے بارے سب سے زیادہ خفیہ اطلاعات اسی ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یا طوم نے تجویز پیش کی کہ بہتر ہو گا کہ مشعل کے دوبارہ امان سے باہر جانے کا انتظار کیا جائے اور بیرون ملک اسے ختم کیا جائے۔

یا طوم کی عقل و دانش پر مبنی باتیں سن کر یمن یاہو چلانے لگ گیا۔

”بہانے بازی، تم مجھے صرف بہانے بازی کرتے ہوئے بہلا رہے ہو، مجھے ایکشن اور نتیجہ چاہئے۔ میں فوری ایکشن چاہتا ہوں۔ عوام ایکشن چاہتے ہیں۔ عنقریب روش ہشانہ (Rosh Hashanah) (عید) آنے والی ہے، میں مشعل کے قتل کی صورت میں اپنے لوگوں کو عید کا تحفہ دینا چاہتا ہوں۔“

اس کے بعد یا طوم کو اپنے ہر چھوٹے بڑے اقدام کے لئے یمن یاہو سے ذاتی طور پر منظوری لینا پڑتی تھی۔ آج تک کسی اسرائیلی وزیراعظم نے سرکاری سرپرستی میں ہونے والے قتل کے بارے میں اتنی ذاتی دلچسپی نہیں لی تھی۔

خالد مشعل کی عمر 41 سال تھی۔ اس نے مکمل داڑھی رکھی ہوئی تھی اور مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ وہ ایک انتہائی وقار دار اور قلص خاوند اور سات بچوں کا باپ تھا اور اس کی رہائش بھی سنگ حسین، والی اردن کے محلے کے قریب ہی تھی۔ وہ انتہائی مہذب، خوش گفتار اور نفیس شخص تھا اور اسلام کی بنیاد پرست تحریک میں وہ کوئی معروف شخص نہ تھا لیکن امان میں موجود موساد کے شیٹن نے جو ڈانچہ کر رکھا تھا اس میں مشعل کو ہی خود کش حملہ

کیا گیا تھا۔ جارحی مارکوف کو پاس سے گزرنے والے ایک شخص نے اپنی چھتری کی بالائی نوک اس کی ران میں چھبودی تھی اور وہ فوراً گر کر مر گیا تھا کیونکہ چھتری کی نوک میں ریسن نامی زہر تھا جو اوربڑی کے پودے کے بیجوں سے تیار کیا جاتا ہے اور مارکوف کو شکار کرنے والا KBG، روسی ایگلی جنس ایگلیسی کا کارندہ تھا جو کبھی پکڑا نہیں گیا۔

اپنے قاتلانہ مشن کی کامیابی کا خواب دیکھتے ہوئے بیڈز اور کینڈال آدمی رات کو اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ ہر ایک نے اپنے کمرے میں ہی صبح کے ناشتے کا آرڈر دیا جو کافی، مالے کا جوس، ڈینش، سوئسری پر مشتمل تھا۔ اگلی صبح سب سے پہلے بیڈز ہوٹل کی لابی میں نکلا اور اپنے لئے بک کی گئی دو گاڑیوں میں سے ایک گاڑی، نیلے رنگ کی ٹیوٹا کے کاغذات پر دستخط کئے۔ جلد ہی دوسری گاڑی، ہرے رنگ کی کینڈال بھی آ گئی جس کے کاغذات پر کینڈال نے دستخط کئے۔ اس نے ایک استقبالیہ کلرک کو بتایا کہ وہ اور اس کا دوست ملک کے جنوبی حصے کی سیاحت کے لئے جا رہے ہیں۔

10 بجے مشعل اپنی گاڑی میں، جسے اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا، کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس کے تین کمسن بچے، ایک لڑکا اور دو لڑکیاں بھی موجود تھے۔ بیڈز (Beads) نے کچھ فاصلہ رکھ کر خفیہ طور پر اپنی کرائے کی گاڑی میں اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ قاتل، نیم کے دوسرے ارکان اپنی دیگر گاڑیوں میں اسی سڑک پر ادھر ادھر موجود تھے۔

جیسے ہی وہ شہر کے گارڈن ڈسٹرکٹ میں داخل ہوئے ڈرائیور نے مشعل کو آگاہ کیا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ مشعل نے کار کے فون سے بیڈز کی کار کا میک اور نمبر امان کی پولیس کے ہیڈ کوارٹر کو آگاہ کر دیا۔ کرائے کی ٹیوٹا قریب سے گزری تو مشعل کے بچوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے بھی مرحبا مرحبا کہا جیسے وہ پاس سے

میں ایک عرصے سے یہ طریقہ نہایت کامیابی سے عمل میں لایا جاتا رہا تھا۔ ماضی قریب میں جو روسی سائنسدان مہاجر بن کر اسرائیل آ گئے تھے انہیں موساد نے نوکریاں دے کر ان سے یہ ہلاکت خیز گیسیں تیار کروانی شروع کر دی تھیں جس میں تابون (Tabun)، سارن (Sarin) اور سومن (Soman) وغیرہ شامل تھیں۔ جن پر بین الاقوامی معاہدوں کے تحت سخت پابندیاں تھیں۔ جس شخص کو ان کا شکار بنایا جاتا تھا اس کے حواس معطل، جسم مفلوج اور لہجوں میں موت واقع ہو جاتی تھی۔ مشعل کی موت کے لئے اسی طریقے کا انتخاب کیا گیا تھا۔

24 ستمبر 1997ء کو قاتل، نیم کے ارکان نے امان کے لئے ایٹمنر، روم اور بیڑی سے فلائٹس پکڑیں جہاں وہ کئی روز سے قیام کئے ہوئے تھے۔ نیم کے کچھ ارکان کے پاس فرانس اور اٹلی کے پاسپورٹ اور دستاویزات تھیں جنہوں نے مشعل کو نشانہ بنانا تھا، ان کے پاس کینیڈا کے پاسپورٹ تھے جن پر ان کے نام ہیری بیڈز (Bary Beads) اور سیان کینڈال (Sean Kendall) درج تھے۔ وہ شہر کے انٹرنیشنل ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں انہوں نے اپنے آپ کو بطور سیاح متعارف کرایا۔ قاتل، نیم کے باقی ارکان نے اسرائیلی سفارتخانے میں قیام کیا جو ہوٹل سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا۔ بیڈز اور کینڈال بھی اگلے روز ان میں جا شامل ہوئے۔ دونوں قاتلوں نے ایک دفعہ پھر گیس ٹیوب کا معائنہ کیا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں کہ ٹیوب کے اندر کون سی نزد ایجنٹ (گیس) بھری گئی ہے۔ ان کا قیاس تھا کہ یہ موت سے قبل خفیانہ یا دل کی حرکت بند ہونے کا باعث بنے گی۔ انہیں شیش چیف موساد نے مشعل کی تازہ ترین نقل و حرکت سے آگاہ کیا۔

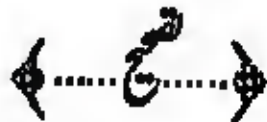
ستمبر 1978ء میں وہ لندن میں تھا جب ایک بگاریں منحرف شہری کو نزد گیس (ایجنٹ) کے ذریعے قتل

حماس کے زہما نے فوراً اپنا کان دہا لیا چونک کر دیکھا اور انگلی سے کان کی صفائی شروع کر دی۔ کینڈال نے دوبارہ کوشش کی۔ اتنے میں جھوم میں بل چل گئی اور وہ دونوں ایکٹوں کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھے۔

”بھاگو.....“ بیڈز نے ہیر یوز بان میں کہا۔ آگے بیڈز، پیچھے کینڈال اس گلی کی طرف بھاگے جہاں بیڈز نے گاڑی پارک کر رکھی تھی۔ مشعل کے ڈرائیور نے جس نے تمام واقعہ دیکھا تھا، وہیں سے گاڑی اس گلی کی طرف موڑ دی تاکہ ٹیونا کا راستہ روک سکے۔ مشعل لڑکھڑا رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ لوگ اسے سہارا دے رہے تھے تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔ دوسرے ایسپرنس کے لئے وہائی دے رہے تھے۔

بیڈز جس کے ساتھ کینڈال بھی اب تک آدمی استعمال کی گئی زہری کی ٹیوب تھامے ہوئے تھا، ڈرائیور کی گاڑی کی ٹکر سے بچنے کے لئے گلی کی دوسری طرف کار کو ہٹا گئے لئے جا رہا تھا۔ دوسری کاریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ایک ڈرائیور کے پاس سیل فون تھا۔ وہ سڑک بلاک کرنے کے لئے کالیں کر رہا تھا۔ مشعل کا ڈرائیور پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطے کے لئے اپنا کار فون استعمال کر رہا تھا۔

اب تک قاتلوں کی امدادی ٹیم کے ارکان بھی پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے بیڈز کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی کار چھوڑ کر اس کی کار میں آ جائے۔ موساد کے دونوں



شمارہ جولائی 2014ء میں کہانی ”قاقتہ اور دل“ درپیدہ“ کا آخری پر اس طرح پڑھا جائے۔ ”قاقتہ کی لاش ہاصر کے سناکت مردہ دل کے برابر پڑی تھی۔“ (ادارہ)

گزرنے والی دیگر گاڑیوں کے مسافروں کو کہہ رہے تھے۔ موساد کے ایجنٹ نے ان کی طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اگلے لمحے کینڈال کی سبز رنگ کی ہینڈ آئی کار ڈرائیور سے آگے نکل گئی اور دونوں کاریں شہر کی ٹریفک کے جھوم میں غائب ہو گئیں۔

اگلے لمحے پولیس ہیڈ کوارٹر سے ایک افسر نے مشعل کو فون کر کے بتایا کہ کار کسی کینیڈین سیاح نے کرائے پر لے رکھی ہے۔ مشعل مطمئن ہو گیا اور دوبارہ اپنے بچوں کو دوسرے مسافروں کے لئے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ ہر صبح بچے ہاری ہاری اپنے باپ کے ساتھ دفتر جاتے ہوئے کار کی سواری کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔ مشعل کو دفتر اتار کر ڈرائیور بچوں کو سکول چھوڑ آیا کرتا تھا۔

10:30 بجے سے کچھ پہلے ڈرائیور واسطی الطال شریٹ میں مڑا تو اس نے وہاں حماس کے دفتر کے باہر ایک جھوم کو اکٹھے ہوئے دیکھا۔ ان لوگوں میں کینڈال اور بیڈز بھی موجود تھے۔ ان کی موجودگی سے کسی نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا کیونکہ اکثر سیاح ”حماس“ اور اس کے مقاصد بارے معلومات کی خاطر وہاں آ جایا کرتے تھے۔

مشعل نے جندی سے اپنے بچوں سے پیار کیا اور انہیں الوداع کہتے ہوئے کار سے باہر نکل آیا۔ بیڈز جندی سے اس طرح اس کی طرف بڑھا جیسے اس سے ہاتھ ملانا چاہتا ہو۔ کینڈال اس کے کندھے کے پاس کھڑا پلاسٹک بیگ میں سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

”مسٹر مشعل!“ بیڈز نے نہایت مہذب طریقے سے مخاطب کیا۔

مشعل نے اس کی طرف مشکوک نظر سے دیکھا۔ اتنے میں کینڈال نے پیس والی ٹیوب نکال لی اور مشعل کے کان میں پیرے کرنے کی کوشش کی۔

دیا تھا۔

امان سے موساد کے سٹیشن چیف نے اسرائیلی سفارتخانے کے خفیہ نوٹ سے اپنے چیف اور ڈائریکٹر جنرل موساد یا طوم کو اس آپریشن کی ناکامی کی اطلاع دے دی تھی۔ دونوں افراد، سٹیشن چیف اور یا طوم غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

جب یا طوم اس ناکامی کی اطلاع دینے وزیراعظم کے دفتر پہنچا، نینن یا ہو کو پہلے ہی کنگ حسین کا ہاٹ لائن پر جو دونوں لیڈروں کے درمیان ہنگامی مصدقہ حال سے نشے کے لئے قائم تھی، نوٹ کال آ چکی تھی۔ نوٹ کال کا لب ولہجہ کیا تھا، اس کا انکشاف بعد میں ایک انٹیلی جنس افسر نے کیا۔

شاہ حسین نے بی بی سی سے دو سوال پوچھے تھے۔  
”دو حرامی کون سا کھیل کھیل رہا ہے؟“ اور ”نرو گیس کا کوئی توڑ (علاج) ہے؟“ والی اردن نے انتہائی اشتعال اور غصے میں کہا۔

”میں اپنے آپ کو ایک ایسا آدمی محسوس کر رہا ہوں جس کے انتہائی بااعتماد دوست نے میری بیٹی کی عزت لوٹی ہو۔ اگر نینن یا ہو اس سارے معاملے کی تردید کرنے کی سوچ رہا ہو تو اسے معلوم ہونا چاہئے اس کے دو جاسوس ہمارے قبضے میں ہیں جو ویڈیو کیمرہ کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر چکے ہیں اور یہ ویڈیو ٹیپ میڈلین البرائٹ، امریکن سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) کے ملاحظہ کے لئے واشنگٹن روانہ کر دی گئی ہے۔“

اب نینن یا ہو اپنے ٹیلیفون کے لوہے پر اس طرح جھکا بیٹھا تھا جیسے اس کی گردن کسی نے مروڑ دی ہو۔ اس کا رنگ ایسے سفید ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو اور اس کی شکل ایسے ہو رہی تھی جیسے اس کا ہاتھ کسی بھاری پتھر کی ریل کے نیچے آیا ہو اور۔

نینن یا ہو اسی وقت جہاز پکڑ کر صورت حال کی

ایکٹ اپنی کار سے باہر کودے ایک دوسری کار نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس کار میں سے کئی مسلح افراد باہر نکلے۔ انہوں نے بیڈز اور کینڈل کو زمین پر گرالیا۔ لمحے بھر بعد پولیس پہنچ گئی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ امدادی قاتل فیم کے ارکان وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور بغیر کسی رکاوٹ کے واپس اسرائیل پہنچ گئے۔

بیڈز اور کینڈل بد قسمت ثابت ہوئے۔ انہیں سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا۔ انہوں نے وہاں پر اپنے کینیڈین پاسپورٹ پیش کئے اور اصرار کیا کہ انہیں کسی گہری سازش کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اردن کے کاؤنٹر انٹیلی جنس چیف سمیچ بیٹی کی آمد نے ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا۔ اس نے بتایا کہ ”وہ جانتا ہے کہ وہ کون ہیں۔ اس کی ابھی ابھی امان میں موساد کے سٹیشن چیف سے نوٹ پر بات ہوئی ہے اور سپاکی ماسٹر نے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ اس کے آدمی ہیں۔ اب اسرائیل شاہ اردن کے ساتھ ان کے بارے میں معاملات طے کرے گا۔“

بیٹی نے حکم دیا کہ موساد کے دونوں ایجنٹوں کو الگ الگ کال کوٹریوں میں بند کیا جائے لیکن انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

اس دوران مشعل کو امان کے مرکزی ہسپتال کے انتہائی تنگداشت پونٹ میں داخل کرایا دیا گیا تھا۔ اس کی شکایت تھی کہ اس کے بائیں کان میں مسلسل گھنٹیاں بج رہی ہیں (اس میں زہر ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی) اور کچھ طاری ہے جیسے پورے جسم سے بجلی کا کرنٹ گزر رہا ہو اور سانس لینے میں دشواری پیدا ہو رہی ہے۔ (زہر کان کے اندر تک نہیں پہنچا تھا ورنہ دماغ ماؤف ہونے سے فوری موت واقع ہو سکتی۔ کان کے باہر بننے کے بھی زہر کے کس قدر شدید اثرات تھے)۔

ڈاکٹروں نے مشعل کو لائف سپورٹ سسٹم پر ڈال

جب اس واقعے کی تفصیلات اسرائیلی اور بین الاقوامی پریس میں آئی شروع ہوئیں تو یمن یاہو کے لئے پریس والوں سے منہ چھپانا مشکل ہو گیا اور اسرائیلی افسروں نے استغفہ دے دیئے۔

ایک ہفتے کے اندر نادر علی حماس کے رہبر درہمناش احمد یسین کو رہا کر دیا گیا اور غزہ میں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ بدلے میں بیڈز اور کینڈل بھی اپنے کینیڈین پاسپورٹ کے بغیر واپس اسرائیل کے حوالے کر دیئے گئے۔ ان کے پاسپورٹ امان میں کینیڈا کے سفارتخانے کے حوالے کر دیئے گئے تاکہ محفوظ رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

ان دونوں ایجنٹوں کو پھر کبھی قتل کے مشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ انہیں موساد ہیڈ کوارٹر میں کسی معمولی کلرکی کا کام دے دیا گیا تھا۔ ایک اسرائیلی انٹیلی جنس افسر نے بتایا۔ ”وہ دونوں بلڈمگ کے بیت الخلاؤں کی سیکورٹی کے انچارج تھے۔“

اس واقعے کے بعد موساد کا ڈائریکٹر جنرل یاطوم محض ”تکڑی بیج“ بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے سینئر افسروں کا خیال تھا کہ وہ یمن یاہو کے غلط اور ناجائز دہادہ کے سامنے ڈٹ جانے میں ناکام رہا۔ موساد کے لئے کام کرنے والے جاسوسوں اور مجرموں کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ وزیراعظم کے دفتر کی طرف سے یہ افواہ پھیلائی شروع کر دی گئی کہ یاضوم آج گیا کہ کل۔ اس کے اپنے ٹکے کے اندر اس کی مخالفت اور کردار کشی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ یہ صورت حال برداشت کی پھر فروری 1998ء میں خود ہی استغفہ دے دیا۔ وزیراعظم یمن یاہو نے اسے روایتی قسم کا وہ خط بھی نہیں لکھا جس میں جانے والے کے کام کی تعریف اور خدمات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

(جاری ہے)

کنگ حسین کے سامنے وضاحت کے لئے امان جانا چاہتا تھا لیکن شاہ حسین نے صاف کہہ دیا۔ ”میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔“

اردن سے آنے والی ہر فون کال کا لہجہ اب دمکی آمیز ہوتا تھا۔ یمن یاہو اس وقت بھی احتجاج نہ کر سکا جب شاہ حسین نے اسے حکم دیا کہ اب وہ اسرائیلی قید خانوں سے حماس لیڈر شیخ احمد یسین سمیت دوسرے فلسطینیوں کو رہا کر دے۔ یہ فون کال صرف چند منٹ کی تھی۔ یہ بی بی کی سیاسی زندگی کا غالباً سیاہ ترین وقت تھا۔

اب وقت کا دھارا اپنا رخ خود متعین کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اسرائیل کا ایک لشکر جہاز فرو گیس کا توڑ یا علاج کی دوائے کرمان کھینچ چکا تھا۔ اس سے مشعل کا علاج شروع ہو گیا اور وہ چند دن میں اس قابل ہو گیا کہ اس نے پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں موساد کے گھناؤنے کردار کو خوب بے نقاب کیا۔ امان میں موساد کے سٹیشن چیف اور یمنی کے درمیان ایک مختصر میٹنگ ہوئی جس کے دوران انہوں نے فون پر یاطوم سے بھی بات کی۔ موساد کے ڈائریکٹر جنرل نے فوراً اس بات کا وعدہ کر لیا کہ آئندہ کبھی بھی اردن کی سر زمین پر موساد کی طرف سے کسی کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

اگلے روز امریکن وزیر خارجہ میڈلین البراؤٹ نے یمن یاہو کو دو مختصر ٹیلیفون کالیں کیں اور بی بی کو بتایا کہ وہ تمام معاملے کو خوب سمجھتی ہیں۔ اس کا لب و لہجہ بھی تلخ و ترش اور کنگ حسین جیسا ہی تھا۔

کینیڈا کو جب پتہ چلا کہ اسرائیلیوں نے اس کے جعلی پاسپورٹ ایک قتل کے منصوبے کی تکمیل کے لئے استعمال کئے ہیں تو احتجاجاً اسرائیل سے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ صرف اتنی رعایت برتی کہ سفارتی تعلقات بالکل ختم نہیں کئے۔

# صدیوں کی سل

”میں چلے جانے کے لئے نہیں آیا لوری میں یہیں دفن ہونے کے لئے آیا ہوں جہاں تم نے میرے ہاتھ کا لکھا ہوا سندس دفن کیا تھا۔“

☆ ..... تحریر: فاطمہ احمد / انتخاب: محمد صدیق - جٹ، چوہان



پوچھا۔ "تم نے پوچھا تھا نا، نوری تم ہی ہو؟"  
 "بہت مدت ہوئی تمہارا نام سنا تھا۔" بوڑھے نے  
 حشکی شکل آواز میں کہا۔ "بہت ہی مدت گزر گئی ہے جب  
 تمہارا نام سنا تھا۔"  
 "کب؟"

"جب میں پانچ من کی سل اٹھا لیا کرتا تھا۔"  
 بوڑھے نے پھکی سی مسکراہٹ سے کہا اور پوچھا۔ "تم  
 اکیلی رہتی ہو یہاں؟"

"نہیں تو۔" بڑھیا بولی۔ "صبح اور شام کے وقت  
 لوگوں کے بچے قرآن پڑھنے آتے ہیں۔ جب چلے  
 جاتے ہیں تو نیم کے اس بیڑ سے ہاتھیں کرنے لگتی ہوں۔  
 اس کی عمر بھی ہم دونوں جتنی ہے لیکن تم کہہ سکتے ہو کہ میں  
 یہاں اکیلی رہتی ہوں۔"

"کب سے اکیلی ہو؟"  
 "گلتا ہے ساری عمر اکیلے بیت گئی ہے۔" بڑھیا  
 نے کہا۔ "لیکن میں نے وقت کے لمحوں کو ڈور نہیں جانے  
 دیا۔ ایک ایک لمحے کو نیم کے چوں میں سوئی رہی ہوں۔  
 اس کی جھنجھکی یعنی نو میں میری جوانی کی نو پاس رہی ہوئی  
 ہے۔ جب بہت جھڑ میں سو کے بہتے ایک ایک کر کے  
 آگن میں گرتے ہیں تو ان کی 'سس' 'سس' کی آواز  
 میں مجھے اپنی سسکیاں سنائی دیتی ہیں اور جب سوچی  
 ڈالیوں سے گوبلیں پھوٹی ہیں اور بیڑ گھنیری چھاؤں والی  
 ہری چھتری بن جاتا ہے تو میری بوڑھی ضعیف ذات میں  
 کوئی بڑے ہی بیڑے ٹروں میں جوانی کے وہی گیت  
 گنگنا نے لگتا ہے جو میں نے نہ جانے کس کی محبت میں  
 گائے تھے۔"

"تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمہیں کس سے محبت  
 تھی؟"

"اتنا ہی یاد ہے کہ دل میں محبت تھی۔ پوں جانو کہ  
 محبت کا ایک پیغام جو کسی کو دے نہ سکی۔ عمر بیت گئی۔ تم سنو

"ہاں میں ہی نوری ہوں۔" بڑھیا نے کھاٹ کو نیم  
 کے بیڑ سے گھسیٹ کر لاتے ہوئے کہا۔ "تم  
 میرا نام سن کر شاید چونک اٹھے ہو۔ بیڑے جاؤ۔ میں نے عمر  
 کے ستر برس اس بیڑ سے بیٹھے گزار دیے ہیں۔ تم حیران  
 ہو رہے ہو کہ میرا نام نوری کیوں ہے۔ کبھی چھٹی، زرد پیلی  
 آنکھوں، سلید راکھ جیسے بالوں اور زرد چہرے پر عمر کی  
 نکھری ہوئی گہری لکیروں پر میرا نام کچھ اچھا تو نہیں لگتا  
 لیکن میں پیدا ہوئی تو ماں باپ نے مجھے نوری کہا تھا۔ وہ  
 مجھے نوری کہتے کہتے مر گئے ہیں۔ میں مر جاؤں گی تو لوگ  
 بھی کہیں گے کہ نوری مر گئی ہے، کبھی میری آنکھوں میں  
 بھی نور تھا۔ کچھ ایسا ہی نور میرے رخساروں پر بھی تھا۔  
 اب نوری رہ گئی ہے، نور مر گیا ہے۔ تم ذرا اچھی طرح  
 بیڑے جاؤ نا۔ تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں، عمر کی بات  
 ہے۔ میں جانتی ہوں ان ہاتھوں سے تم نے بھی پانچ من  
 کی سل بھی اٹھالی ہوگی مگر آج تمہارے ہاتھ تمہاری پتلی  
 پتلی انگلیوں کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتے۔ تمہاری عمر مجھ جتنی  
 ہوگی؟ یہی کوئی ستر بہتر برس۔"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" بڑھیا نے پوچھا۔  
 "میں نے تمہیں پہلے تو بھی نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ شاید تم آگے  
 جا رہے تھے اور ذرا سستانے کو نیم کے بیڑ سے آ کر کے  
 ہوا۔"

بوڑھے نے آنکھیں موند لیں۔ اُس کے چہرے  
 پر عمر کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ اُس کی ہلکوں کو جنبش سی  
 ہوئی اور اُس نے اُدھ کلی آنکھوں سے نوری کو دیکھا۔

"ہاں نوری!" بوڑھے نے کہا۔ "ذرا نیم کے بیڑ  
 سے سستانے آ رکا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ منزل جتنی  
 قریب آ رہی ہے، مسافت اتنی ہی کٹھن ہوتی جا رہی  
 ہے۔ اب اور آگے جانے کی ہمت نہیں۔ دل ساتھ نہیں  
 دے رہا، روح شل ہو گئی ہے۔"

"تمہیں میرا نام کس نے بتایا تھا؟" نوری نے

تمہارے باپ کے سینے پر پانچ من کی سل بن کے گری۔  
پھر کیا ہوا؟ دو سل کس نے اٹھائی تھی؟

”کسی نے بھی نہیں۔“ بوڑھی لوری نے کہا۔ ”میرا  
باپ ڈاکیہ تھا جسے خدا نے ایک بچی اور سرکار نے ایک  
دروئی دے دی تھی۔ دروئی بھی اور بچی بھی اُس کے ساتھ  
چلی اُسے دیمک کی طرح کھاتی رہیں۔ میرا باپ خاکی  
پتلون اور خاکی کوٹ پہن کر اور سر پر خاکی پگڑی لپیٹ کر  
صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتا تھا۔ کئی بار مرمت کئے ہوئے  
جوتے گھسیٹا سارا دن گلی گلی، گھر گھر گھومتا اور خط تقسیم کرتا  
رہتا تھا۔ میرا باپ لوگوں کے لئے جسم پیغام تھا۔ محبت کا  
بھی، نفرت کا بھی، مسرت کا بھی، ملال کا بھی..... لوگوں کو  
وصال کے سندیس دیتا تھا، وفات کے بھی، اُس کے قہیلے  
میں پھول بھی تھے، پتھر بھی، مگر وہ اپنی جی کے لئے بھی  
کوئی سندیس نہ لایا، کبھی کوئی نیلا لٹافہ نہ لایا جس میں عطر  
رچا ہوا ہوتا۔ وہ خود ہی میرے لئے پیار کا سندیس تھا۔  
شام کو تھکا ماندہ گھر آتا تھا تو میں دوڑ کر اُس سے لپٹ  
جاتی تھی اور وہ میرے گالوں پر تھکیاں دے کر سینے سے  
لگا لیا کرتا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاپا کرتی  
تھی۔ اُس کے پاس اس بے ساختہ مسکراہٹ کے سوا کچھ  
بھی نہ تھا۔ لوگوں میں سینکڑوں ہزاروں روپے تقسیم کرنے  
والا ڈاکیہ میرے لئے دو چار بیسوں کی ریوڑیاں خرید  
لانے سے بھی معذور تھا.....

”پھر وہ مجھے گودی سے اتار دیا کرتا تھا مگر اُس کی  
چال ڈھال ایسی ہوتی تھی جیسے وہ میرے بوجھ سے تھک  
گیا ہو۔ ماں چوہے چوہے کے میں جی رہتی تھی یا محلے کے  
بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھی۔ بس ایسے ہی میں نے بھی  
قرآن پڑھ لیا تھا۔ دھن والوں کی پچیاں ہنسی کھیتی سکول  
جایا کرتی تھیں اور میں کٹری انڈین دیکھا کرتی اور سوچا  
کرتی تھی کہ یہ اس لئے سکول جاسکتی ہیں کہ ان کے باپ  
ڈاکیہ نہیں۔ میں نے ایک بار ماں سے کہا کہ مجھے بھی

..... میں تمہیں نیم کے پڑ کی کہانی سنا رہی تھی.....  
”اور جب سادان میں نیم کی نمولیاں بکتی ہیں تو  
محلے بھر کے بچے دن بھر پڑ پڑ سے چڑیوں کی طرح  
چبکتے رہتے ہیں۔ پھر میرا بچپن لوٹ آتا ہے۔ میں بھول  
جاتی ہوں کہ میں اکیلی ہوں۔ میں تمہیں اپنی جوانی کی  
کوئی تصویر نہیں دکھا سکتی۔ میرے ذہن میں جھاگو تو  
ذرا..... میرے گھیرے روشنی ہالوں، دیکھتے گالوں اور  
شرمائی لپائی چال ڈھال کو دیکھ کر پانچ من کی سل اٹھانے  
والے لنگھیوں دیکھا کرتے تھے اور نہ جانے مجھے ان پر  
غصہ کیوں نہیں آتا تھا؟.....

”اس الہی نیا دن کا نام لوری تھا۔ میں تو اُس لوری  
کا سایہ ہوں جسے دو بجے سورج کے ساتھ گھپ اندھیری  
رات میں گھل مل جانا ہے۔ کبھی سہیلیاں مجھے کہا کرتی  
تھیں، لوری اتیری جوانی تو قیامت ہے لیکن میری جوانی  
نے جو قیامت میرے ماں باپ کے سینے میں پا کی تھی وہ  
تو کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ لانے قدر اور گول گول ہانپوں  
والی لوری کو آجیں بھر بھر کے دیکھنے والے کسی بھی پھیل  
جھیلے کو خدا نے صحت نہ دی کہ میری جوانی نے میرے  
ماں باپ کے سینے پر جو پانچ من کی سل رکھ دی ہے، ذرا  
اسے اٹھا کر پرے کر دے۔ پر ایسا نہ ہوا.....

”تم لپٹ جاؤ نا کہتے تھے تھک گیا ہوں۔ میں  
نے اتنی ہاتھیں کبھی نہیں کیں۔ کروں بھی کس سے؟ ہاتھیں  
سننے کے لئے تمہاری طرح کون پاس آ کے بیٹھتا ہے۔  
رات کو دیا جتنا چھوڑ دیتی ہوں، شاید کوئی تھکا ماندہ مسافر  
دم بھر کو میری کتاب میں رک جائے۔ کچھ اپنی کہے، کچھ میری  
سنے، پر کون آتا ہے یہاں۔ آج تم آئے ہو تو اس  
دھوکے میں اپنی کہانی پھیلتی ہو جسے تم میری کہانی ہی  
تو سننے آئے ہو یہاں۔“

”کہانی ہی تو سننے آیا ہوں لوری!“ بوڑھے نے  
لرزتی آواز میں کہا۔ ”کیوں لوری تمہاری جوانی

کرتے اور میں شرماتی لپاتی سی، سہیلی کے گھر جا پہنچتی مگر مجھے قصہ نہیں آیا کرتا تھا۔ وہ مجھے چھیڑتے نہیں تھے، آج کل کے لڑکوں ہالوں کی طرح گندے گندے بول نہیں گاتے تھے۔ آوازے نہیں کستے تھے۔ پر اُن کی مکئی مکئی سی انگڑائیاں اتنا ضرور کہہ جاتی تھیں۔ "لوری! تم ہمیں اچھی لگتی ہو۔" کبھی کبھی قریب سے گزر جایا کرو۔ اور میں بھی سوچتی تھی کہ یہ لوگ دیوار کے سائے تلے کھڑے میرا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ بس دیکھ لیتے ہیں..... پر تمہیں کچھ بات بتا دوں..... دل یوں چلتا تھا کہ میں ان کے قریب سے گزرتی رہوں اور وہ مجھے دیکھتے رہیں اور کبھی دل یوں بھی چلتا تھا کہ میں بھی انہیں دیکھوں مگر نظر ملتی تھی تو بدن میں گدگدی سی ہوتی تھی۔ پھر نظریں آپ ہی آپ جھک جاتی تھیں.....

"ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ تم مجھے یاد دلاتے چلو نا چپ کیوں بیٹھے ہو..... تم نے بھی شاید مجھے کبھی دیکھا ہوگا؟"

"دیکھا تھا لوری!" بوڑھے نے یوں آنکھیں موند لیں جیسے مرنے والی ہوئی ہلکوں کی تیرگی میں لوری کے گئے گزرنے حسن و جوانی کو دیکھ رہا ہو۔ خواب ناک آواز میں بولا۔ "تم اپنی ماں کی بات کر رہی تھی نا کہ تمہاری جوانی نے اُسے شکل حراج بنا دیا تھا۔"

"ہاں!" لوری نے کہا۔ "ماں نے مجھے اُن باتوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا جو مجھ سے باپ میرے جسم سے ہی متعلق تھیں مگر میں ان سے آگاہ نہیں تھی۔ جہاں دوپٹہ سر سے ڈھلکا اُس نے ڈانٹ کر کہہ دیا۔" کیا بے حیاؤں کی طرح زلفیں بکھیر رکھی ہیں، ڈھک لے اُنہیں۔ اور میں جان گئی کہ زلفیں جوان لڑکی کے حسن کا ایک حصہ ہوتی ہیں جو ہر کسی کو دکھاتے پھرنا اچھا نہیں اور جب ماں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ دوپٹہ ذرا سینے پر اچھی طرح پھیلا کے رکھا کر تو مجھ پر کچھ ایسے راز الٹا ہوئے جو میں اپنے

سکول داخل کر دو لیکن ماں نے کالوں کو ہاتھ لگا کر کہا تھا۔ نہ، نہ، نہ سکول جا کر دین ایمان برباد ہو جاتا ہے۔ ابھی بچیاں گھر قرآن پڑھ لیا کرتی ہیں..... تم جالو، غریب یوں ہی اپنے آپ کو قریب دے لیا کرتے ہیں۔ جو چیز لکھنے والے نے نصیب میں ہی نہ لکھی ہو، ہم غریب اسے اپنے لئے حرام قرار دے لیتے ہیں.....

"بس یہ تھی ہماری زندگی جس میں کبھی کوئی تہذیبی نہ آئی۔ کلبو کے گرد ایک چکر تھا جس پر ہمارا کتبہ گھومتا رہا اور گھومتا ہی رہا مگر یک لخت ایک انقلاب آ گیا۔ میں جوان ہو گئی اور ایک شام باپ گھر آیا تو میں پہلے کی طرح دوڑ کر اُس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ باپ نے میرے گال تھپکانے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ یوں روک لیا جیسے میرے گال الٹا رہے بن گئے ہوں۔ باپ کھیالی سی ہنسی اُنس دیا اور اُس کے تھکے ہوئے چہرے کا رنگ بدل گیا.....

"اُس رات میں نے لفاف میں چھپ کر اپنے گال کو ہاتھ لگایا تو گال تپ رہا تھا۔ الٹا رہے کی طرح..... پھر میرے اور باپ کے درمیان ایسی دیوار حائل ہو گئی جسے میں محسوس کرتی تھی، دیکھ نہ سکتی تھی۔ میری ماں نے میرے پیچھن اور میرے درمیان ٹاٹ کا ایک پردہ حائل کر دیا..... دروازے پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردے نے میرے ذہن کو سوالوں سے بھر دیا۔ ان میں سب سے زیادہ پریشان کرنے والا سوال یہی تھا کہ میرے ذہن میں اتنے ڈھیر سارے سوال ایک ہی بار کیوں آ گئے ہیں؟.....

"میری جوانی نے میری ماں کو خشکی حراج بنا دیا۔ ٹاٹ کا پردہ پتھروں کی دیوار تو نہیں تھا۔ میں کسی سہیلی کے گھر چلی ہی جایا کرتی تھی اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب پانچ من کی سیل اٹھانے والے جوان مجھے گھورا کرتے، مسکرایا کرتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ جایا

RTM: 71114



سب اچھا لگا مگر  
بات ان سے بنی



U.I INDUSTRY

184-C, Small Industries State  
Gujrat PAKISTAN.

PH: +92 53 3535901-2, 3523494-5

Fax: 053-3513307

E-mail: nbafana@gmail.com

آپ سے بھی چھپانے لگی اور جب ماں نے مجھے عرق قہ کا حکم سناتے ہوئے کہہ دیا کہ اب باہر نہ جایا کر، گلیوں میں موئے مسنڈے دیدے پھاڑے کھڑے دیکھتے ہیں تو میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے قید ہو گئی مگر میرے تصور وہ کو کوئی گرفتار نہ کر سکا..... تم جانو، تصور تنہائی کے ساتھی تو ہوتے ہیں پر ہوتے فریب ہی ہیں۔ میری جوانی چٹان ایسی حقیقت تھی جس سے بڑے بڑے حسین فریب ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گئے.....

”اور پھر ایک روز میرا باپ اپنی زندگی کی پہلی اور آخری چشمی اپنے گھر بھی لے آیا۔ میں اتنا ہی سن سکی کہ میرے باپ نے ماز داری سے میری ماں سے کہا۔ ”ان کی چشمی آئی ہے۔ ہمارے گھر میں چشمی کا آنا میری جوانی سے کہیں زیادہ اہم اور لوکھا واقعہ تھا۔ میں پوچھنے ہی لگی تھو کہ ای، اب اس کی چشمی لائے ہیں کہ ماں نے مجھے کہا۔ ملو ڈرا..... ابو کے لئے چائے بنا دو، ہمارے گھر میں شام کی چائے بھی ایک واقعہ ہوا کرتی تھی۔ اس روز یہ واقعہ ایک عرصے بعد ڈراما ہوا تو میں سمجھ گئی کہ چشمی میں کوئی ایسی بات لکھی ہے جو میرے جانے والی نہیں۔ میں جانا نہ چاہتے ہوئے بھی چہ لبے پر جا بیٹھی اور اپنے ماں باپ کی کھسر پھسرتی رہی.....

”میں نے رات ماں سے پوچھ ہی لیا کہ کس کی چشمی ہے؟ ماں نے بتایا کہ کل کوئی مہمان آنے والے ہیں۔ پھر اس نے مجھے ڈھلے کپڑے پہننے، آنکھوں میں کاہل اور سر میں چل ڈالنے کی تاکید کی۔ یہ بھی کہا کہ وہ آئیں تو ان کے سامنے سکھڑ بیٹیوں کی طرح الصنائی بٹھنا۔ کوئی ایسی حرکت یا بات نہ کرنا جس سے وہ کہہ بیٹھیں کہ کیسی اجڈ لڑکی ہے۔ دیکھ، یہ تیرے ابا کی عزت ہے عزتی کا سوال ہے.....

”اگلی صبح ہمارے گھر میں اتنی صفائی ہوئی جو کبھی عید پر بھی نہ ہوئی تھی۔ میں نے عید والے کپڑے پہنے۔

..... تم اس موٹی بھدی اور سوکھی سڑی عورت کو دیکھ لیتے تو جان لیتے کہ قصائی بکرے کو کیسی نظروں سے دیکھتا ہے۔۔۔۔۔ میرے منہ میں زبان تھی مگر ماں نے جو کہہ دیا تھا کہ اس کے منہ میں زبان نہیں ہے، میں جان گئی کہ میرے باپ کی عزت اسی میں ہے کہ میں غرض کر لوں کہ میرے منہ میں زبان نہیں ہے۔ میں نے ہونٹ بھیج لائے اور زبان کو دانتوں تلے دبایا۔۔۔۔۔ پھر مجھے حکم ملا: 'جاؤ'۔

لور میں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے اپنی دو سہیلیوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ انہیں بھی اسی طرح کی دو عورتیں دیکھنے آئی تھیں جنہوں نے اسی طرح کی باتیں کی تھیں لیکن سہیلیوں نے مجھے اس کے بعد کی جو کہانی سنائی تھی وہ کسی طلسماتی دیس کی بڑی ہی پیاری داستان تھی۔ وہ ایک شہزادے کی کہانی تھی، خوابوں کا قصہ تھا۔۔۔۔۔

"اور اُس روز میرے ذہن نے بھی ایک شہزادے کو جنم دے کر اس کے گرد و جگ رینگنے والوں کا جال تن ڈالا پھر مجھ پر خمار ساطاری ہونے لگا اور ان عورتوں کی گھورتی آنکھیں اور بے مزہ باتیں اچھی لگنے لگیں۔۔۔۔۔"

"وہ چلی گئیں۔ شام کے وقت میرا باپ گھر آیا تو اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری ماں کو دیکھا۔ میں نے دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ ماں کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک تھی۔ وہ کمرے میں سر جھکائے باہر آیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور آہ بھر کر منہ پھیر لیا۔ میں نے جو تصور تخلیق کئے تھے، وہ ریزہ ریزہ ہو کر ذہن سے گرو کی طرح اڑ گئے۔ طلسماتی دیس کا شہزادہ ابھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر میرے ذہن کی کوکھ بانجھ ہو گئی اور کسی تصور کو جنم نہ دے سکی۔۔۔۔۔"

"دن گزرتے چلے گئے اور میری ماں چپ چاپ آہیں بھرتی رہی۔ باپ کے کندھے پر کچھ جھکے جھکے رہنے لگے۔ میں جان گئی کہ میرا وجود پانچ من کی سل بن گیا ہے جسے بوڑھا اور غریب ڈاکہ بھی نہیں، کبھی نہیں

ماں نے اپنے ہاتھوں سے میری نگہبانی کی، میری آنکھوں میں کاجل ڈالا اور مجھے اس طرح سر سے پاؤں اور پاؤں سے سر تک دیکھا کہ میں حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ میں اُس وقت نادان تھی، کچھ سمجھ بھی گئی، کچھ نہ بھی سمجھ سکی مگر آج سوچتی ہوں تو کچھ بھی سمجھ نہیں آتا کہ ہم اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سہا سنوار کر نمائش کے لئے فیروں کے سامنے کھڑا کرتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں، دیکھ، تیرے باپ کی عزت ہے عزتی تیرے ہاتھ ہے۔۔۔۔۔"

"بس، تم جانو، ایسی ہی نمائش میری ہوئی۔ ہماری مہبان دو عورتیں تھیں۔ ایک تو سوکھی سڑی لور دوسری اتنی موٹی جیسے دوسری عورت کی روزی بھی اللہ نے اسی کے نام لکھ دی ہو۔ مجھے ماں نے دوسرے کمرے سے بلایا تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ قدم بوجھل ہو گئے۔ بدن کانپنے لگا اور میں خواب میں چلنے کی طرح چلتی ہوئی مہبانوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یاد نہیں میں نے انہیں سلام کیا تھا یا نہیں۔ میرے کانوں میں ایک عورت کی آواز پڑی۔ 'اچھا، یہ ہے لوری'۔ ماں نے کہا۔ 'ہیٹھ جاؤ'۔ اور میں کھات پر ہیٹھ گئی۔ موٹی عورت نے کہا۔ 'اٹھو تو ذرا'۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سوکھی سڑی عورت سے کہا۔ 'قد کاٹھ تو اچھا ہے'۔ سوکھی سڑی عورت نے پوچھا۔ 'مگر کتنی ہے؟' ماں نے ذہن پر زور دیا۔ آنکھیں موندیں اور ڈک ڈک کر بولی۔ 'میری شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب امرتسر میں گولی چلی تھی اور گوروں نے دیسیوں پر بڑا ظلم کیا تھا۔ موٹی عورت نے کہا۔ 'پھر سال دو سال کم ہیں کی کہو نا'۔ میری ماں نے کہا۔ 'سلائی بتائی خوب کرتی ہے'۔ سوکھی سڑی عورت نے پوچھا۔ 'لگائی بھائی تو نہیں کرتی؟'۔ 'نہی، اس بے چاری کے منہ میں تو زبان ہی نہیں'۔ ماں نے کہا۔۔۔۔۔"

"تم نے کبھی قصائی کو بکرا خریدتے دیکھا ہے؟

ماں بیٹی، اس نیم کے بیڑے تلے بیٹھی دکھ بانٹتی رہتی تھیں۔ میں نے اس چٹھی کو پھاڑ ڈالا اور اس کے پڑوں کو نیم کے سنے کے ساتھ دفن کر دیا تھا۔ وہ تو میرے خوابوں کے پڑے تھے جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں دفن کر دیا تھا۔ مجھے اس موٹی عورت اور سوگی سڑی عورت سے نفرت ہو گئی لیکن اس مرد سے مجھے نفرت نہ ہوئی جس کے لئے وہ میرا رشتہ لینے آئی تھیں۔ میں نے ہار با سوچا، تنہائیوں میں سوچا، لحاف کے اندر میرے میں اور نیم کی چھانٹوں میں بیٹھ کے سوچا جانے وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ اگر وہ خود آتا تو شاید مجھے چیز کے بغیر ہی ساتھ لے جاتا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ میرے لئے آہیں بھر رہا ہو اور ماں سے کہہ رہا ہو کہ نہیں، میں تو لوری سے ہی بیاہ کروں گا۔ جانے کیوں مجھے دکھ سا ہونے لگا کہ چیز کی خاطر دو دلوں کا خون کر دیا گیا ہے۔

”اور کچھ ایسے ہی فریب تھے جو میں اپنے آپ کو دیتی رہی اور نیم کا یہ بیڑا بڑھتا پھولا۔ ہا۔ اس کی چھتری چوڑی اور گھنیر سی ہوتی چلی گئی۔ پہنہ جڑے بھی، ہرے بھی ہوئے اور ایک روز ایک پڑوں میری ماں سے کہہ رہی تھی۔ ”لوری بہت بڑی ہو گئی ہے بکا، کوئی غریب غرا کر دیکھ لو۔ ماں نے کہا۔ ”غریب کھوئے بھی آتے ہیں تو تین ہزار کے زید پڑے سے نیچے بات ہی نہیں کرتے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم پانچ ہزار حق مہر لکھوائیں گے تو وہ یہ کہہ کر اٹھ جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں حق مہر کا تو رواج ہی نہیں۔ ماں نے مذہ پرے کر کے آنسو پونچھ ڈالے اور پڑوں یہ کہہ کر چلی گئی کہ اچھا، ڈرا صبر کرو، میں کچھ کرتی ہوں۔“

”پڑوں کو کچھ کرتے دو سال بیت گئے، اور ایک بار پھر میری نمائش کی گئی۔ میں جب مہمالوں کے سامنے گئی تو حجاب بنا۔ لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔ تم جالو، مرد ستا خود غرض، کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ ساٹھ برس کی عمر میں سولہ

اٹھائیسے گا۔ تم جالو، محبت اور ملال دو ایسے جذبے ہیں جو کسی رازدوں کے بغیر برداشت نہیں ہوتے۔ ماں نے ملال سے گھبرا کر مجھے رازدوں بتایا اور بتایا کہ لوری، تم تو انہیں پسند آگئی تھیں پر وہ چیز بہت مانگتے ہیں۔ بیٹی! پیٹ کاٹ کر ازحالی تین سو روپے جوڑے تھے۔ سوچتی ہوں اس سے زید پڑوں یا کپڑے۔ وہ کہتے ہیں، گیارہ جوڑے ریٹھی ضرور ہوں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ابھی لوری چنگ بھی نہیں بنا۔“

”جس نے ساری عمر موٹی خاکی وردی اور کٹی ہار مرمت کرائے ہوئے جوتوں میں گزار دی تھی، وہ ریٹیم کے دو جوڑے بھی نہ بنا سکا، وہ نہ لوری چنگ بنا سکا جس کے پائے لال سرخ ہوتے ہیں۔ میرے ماں باپ نے اپنا سارا ہی خون لچھڑ ڈالا مگر چنگ کا ایک پاپہ بھی سرخ نہ ہو سکا۔ ایک رات ماں بھی شاید میں سو گئی ہوں۔ میرے ابا سے کہنے لگی۔ ”عیدوں پر اُن گھروں سے ہو آیا کرو جہاں عید کارڈ تقسیم کرتے ہو۔ میرا باپ پھنکار کر بولا۔ ”مجھے بھیک مانگنے کو کہہ رہی ہو؟ بیٹی کو تمام عمر کنواری بٹھائے رکھوں گا، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔“

”آج تو تم جانتے ہو کہ اکیس اُن گھروں سے بھی عیدی لئے بغیر نہیں ملتے جہاں عید کے روز بھی بچوں کو مے پکڑے نصیب نہیں ہوتے۔ وقت وقت کی بات ہے۔“

بڑھیا نے بوڑھے کو ہنسنے لگا۔ ”تم تو سوچتے ہو۔“

”نہیں تو!“ بوڑھے نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ ”بڑے غور سے سن رہا ہوں۔ تمہارا باپ بھیک نہیں مانگتا چاہتا تھا نا۔“

”آج ہی آج سن لو۔ تم بھی پھر لوٹ کے نہیں آؤ گے۔ میرے پاس اس کہانی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔“

لوری نے کہا۔ ”میری ماں نے مجھے رازدوں بتایا اور ہم

کوکھ نے کسی انسان کو جہنم نہ دیا جس کی تاریخ راتیں ہارات کی راہ دیکھتے گزر گئیں اور جس کا جسم مرد کے پیار بھرے لمس کو ترستا مر جھا گیا۔ میرے ابا کی چار پائی نہیں رکھی تھی جہاں تم لینے ہوئے ہو۔ آج بھی وہ مجھے نہیں لینا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر مگر مسرت اور ملال کے سندھیں دینے والا ڈاکہ، ہلکے شکایتوں کا بے جان اور بے حس سندھیں، بن کر خدا کے حضور چلا گیا۔ تم تو ستر بہتر کے بیٹے میں آ کے بوڑھے ہوئے ہو مگر میرا باپ بچا اس برس جی کر ہی تم سے زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ سینے پر پانچ من کی بسل رکھ کر ستر برس کون جی سکتا ہے.....

”پھر وہ پیسے جو ماں باپ نے پینٹ ہاندھ کر میرے جہیز کے لئے جمع کئے تھے، وہ ماں بیٹی نے کھا لئے۔ جب آخری کوڑی بھی پیٹ کی بھٹی میں پھسل گئی تو ماں بھی اسی نیم تلے لیٹ گئی۔ بے جان اور بے حس۔ اس کی میت جیسے مجھے بہ زبان خامشی کہہ رہی تھی۔ لوری اب ٹاٹ کا یہ پردہ اتار پھینک سر سے دوپٹہ سرک جانے دے۔ تیرے کھڑی جیسے بالوں کو اب کون ڈک کر دیکھے گا.....

”جب لوگ میری ماں کو بھی اٹھا کے لے گئے تو میں بہت روئی، کچھ اس لئے کہ میرے ماں باپ دنیا سے اٹھ گئے تھے اور زیادہ تر اس لئے کہ میں اس دنیا میں کیوں آئی تھی۔ میری موت کوئی حادثہ نہیں ہوگا، حادثہ تو میری پیدائش تھی.....

”ماں تھی تو میں اس سے ڈکھ بانٹا کرتی تھی۔ وہ نہ رہی تو میں نے نیم کے چوں کو راز داں بنالیا۔ میں نے اس بیڑ سے بہت باتیں کی ہیں۔ میں مرجاؤں گی تو لوگ کہیں گے کہ لوری مر گئی ہے، اور وہ یہ تو ضرور ہی کہیں گے کہ لوری بچی تھی، جانے بیڑ کی گھنٹی شاخوں میں نظریں الجھائے ہوا کیوں کرتی تھی؟ اور ان شاخوں میں جب فاختہ کا گھونسا آباد ہو جاتا تھا تو لوری اس پر گھٹی ہاندھے

برس کی بچی سے بیاہ رہا لیتا ہے اور بچی اٹھا نہیں برس کی ہو تو کہتا ہے، عمر زیادہ ہے.....

”تم بھی کچھ بولو نا! تم بھی مرد ہو۔ اس عمر میں بھی تم اپنے آپ کو بوڑھا نہیں کہو گے مگر اٹھا نہیں برس کی کنواری لڑکی کو دیکھ کر کہو گے، یہ تو بوڑھی ہو چلی ہے۔ میری عمر اٹھا نہیں برس تھی جب میں رشتے ڈھونڈنے والوں کے لئے بوڑھی ہو گئی تھی۔ میں نے کالے لکولے، بھدے، بد صورت مردوں کو بھی کہتے سنا ہے کہ میں تو لڑکی کو دیکھ کر بیاہ کر دوں گا۔ تم لڑکی کو بھی یہ حق کیوں نہیں دیتے؟ تم اپنی عزت کو لڑکی کی زبان کی ٹوک پر کیوں رکھ دیتے ہو؟ جب لڑکی اپنی زبان کو دانتوں تلے دے لیتی ہے تو جالو اس نے تمہاری عزت اور تمہاری ٹاک کو کاٹ کھایا ہے۔ تم نہ اپنی عزت سے رستے ہوئے خون کو دیکھتے ہو نہ اپنی بیٹی کے ارمالوں سے ٹپکتے ہوئے لہو کو دیکھتے ہو، پر لڑکی دووں کے خون کو اپنے جگر میں پھپھالیتی ہے اور یہ خون زہر بن کر اسے اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے۔ وہ گھٹ گھٹ کے مر جاتی ہے پر فریاد نہیں کرتی۔ اُسے جس کے پلے ہاندھ وہ وہ اُس کے اسی بول پر قربان ہو جاتی ہے۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، مجھے تم سے محبت ہے۔ وہ ان دو ہی جملوں کی خاطر بچے جنتی ہے، بھٹ جھونکتی ہے اور اپنی جوانی کا رس اور اپنا خون چھاتوں کے راستے اُس مرد کے بچوں کو پلا دیتی ہے جو اُسے کہتا ہے۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو، مجھے تم سے محبت ہے.....

”پر میں تو ان دو جملوں کو ترستی ہی رہی اور نیم کا بیڑ بوڑھا ہوتا چلا گیا۔ پھر پت جھڑ میں اس کے پتے میری جوانی کی موت پر سسکیاں بھرتے رہے۔ میرے دروازے پر کوئی ہارات نہ آئی۔ میرے آگن سے ڈولی نہ اٹھی۔ یہاں سے کچھ اٹھا تو وہ میرے باپ کا جنازہ تھا جس نے اتنے پیسے جمع کر لئے تھے کہ گیارہ جوڑے ریشمی کپڑے بنوا لیتا لیکن میں بن بیاہی ماں بن چکی تھی جس کی

خوش رہتی ہیں وہ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ کہتے ہیں تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو.....

"بس عمر یوں ہی بیت گئی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ لوری جوان ہوگئی ہے پھر مجھے لوگوں نے ہی بتایا کہ لوری بوڑھی ہوگئی ہے، پر مجھے یاد نہیں کہ جوانی کہاں ختم ہوئی اور بڑھا پا کہاں سے شروع ہوا۔ بچے آئے تو انہیں قرآن پڑھائی رہی اور ان سے کھلتی رہی، وہ چلے گئے تو نیم تلے کھاٹ پر لیٹ گئی، پر ایک بات ضرور کہوں گی کہ میری وہ سوچ بوڑھی نہیں ہوئی کہ وہ کون تھا؟ وہ کیا تھا جس کا پہلا سندیس آیا تھا؟ میں نے اُس کے سندیس کے پُزے پیسے دفن کر دیئے تھے جہاں تم لیٹے ہوئے ہو۔ پر اُس کے تصور کو دفن نہ کر سکی۔ میری سوچ ایک تصور بن گئی۔ جسم بوڑھا ہونا گیا۔ تصور جوان ہونا گیا۔ میں تصوروں کی دہن بنی بیٹھی رہی۔ پر وہ نہ آیا۔ نہ اس کی آواز سنائی دی۔ "لوری اتم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو۔ لگتا ہے جیسے مجھے اُس سے پیار ہو گیا تھا۔ اب بھی ہے۔"

"کیج کہتی ہو؟ لوری! تمہیں اس سے اب بھی پیار ہے؟" بوڑھا لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا اور لرزتی اور قہر قہر کا پتی آواز میں بولا۔ "وہ سندیس میرا تھا جس کے پُزوں کو تم نے یہاں دفن کیا تھا۔ وہ موتی عورت میری ماں تھی اور سوکھی سڑی میری خالہ تھی۔ وہ خط میرے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا کیونکہ میرے ماں باپ لکھے پڑھے نہیں تھے۔ میں نے وہ خط پچاس میل دُور سے لکھا تھا لیکن تمہیں بہت قریب سے دیکھ کر۔ ذرا یاد کرو۔ بوڑھے ذہن سے وقت کے پردے اٹھاؤ تو تمہیں ایک رات یاد آئے گی۔ ہاجر دلی حویلی میں ایک شادی تھی۔ وہ میرے چچا کی حویلی تھی۔ اب تو سب مر مرا گئے ہیں۔ میں بھی آیا تھا۔ تم سکھی سہیلیوں میں بیٹھی وہاں ڈھولک پر گار رہی تھیں۔ میں نے تمہاری چال میں لوح دیکھی تھی، آنکھوں میں شمار دیکھا

جانے رو یا کیوں کرتی تھی؟.....

"تم مرد ہو۔ تم کبھی نہ سمجھ پاؤ گے کہ عورت ہستی ہے تو کیوں ہستی ہے، روتی ہے تو کیوں روتی ہے۔ تم نے کبھی روتی ہوئی مسکراہٹ دیکھی ہے؟ کبھی مسکراتے ہوئے آنسو دیکھے ہیں؟ نہیں دیکھے۔ تم مرد ہو نا۔ تم عورت کا جسم دیکھتے ہو۔ ساتھ برس کے کھوسٹ ہو کر اٹھائیں برس کی چھوکری کو بڑھیا کہتے ہو..... یہی مرد کی بد نصیبی ہے....."

"میں تو پھر بھٹک گئی ہوں۔ تم مجھے یاد دلاؤ نا کہ میں کیا کہہ رہی تھی۔ جانے سے پہلے ساری بات سننے جاؤ۔ پھر تم کب آؤ گے یہاں سستانے کو؟"

"تم کہہ رہی تھیں نا کہ پھر تم نے نیم کے پتوں کو رازداں بنا لیا۔" بوڑھے نے رعشہ گیر آواز میں کہا۔

"میں من رہا ہوں لوری! میں سننے ہی تو آیا ہوں۔"

"ہاں تو۔" لوری بولی۔ "میں نے پھر ایک روز

محلے کے دو بچوں کو قرآن کا سبق دیا تو اگلے روز دو اور

بچے آ گئے۔ پھر پھر وہ ہیں بچے آنے لگے اور میں انہیں

قرآن پڑھانے لگی۔ یہ بچے اب بھی میرے ہاں آتے

ہیں لیکن یہ اُن بچوں کے بچے ہیں جو پہلے پہل میرے

ہاں آئے تھے۔ یہ میرے اپنے بچے ہیں۔ انہیں دیکھ کر

ایسی خوشی ہی ہوتی ہے جیسے یہ میری ہی کوکھ کی پیداوار ہوں

اور تصوروں میں انہیں دودھ پلاتے میری چھاتیاں کبھی

خشک نہیں ہوتیں۔ پر پکی کہوں، جب تک منی بچیوں کو

اپنے آگن میں کد کڑے لگاتے اور پٹ پر چڑھتے اترتے

دیکھتی ہوں تو سو سو دعائیں کرتی ہوں، یا مولا، ان بچیوں

کو جوان نہ کر دینا۔ کسی بچی کو پانچ من کی سل نہ بنا دینا

ورنہ کوئی ضعیف باپ دب کر مر جائے گا، پر وہ بڑی ہو

جاتی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو ایسے مرد کے ساتھ بندھ جاتی

ہیں جو انہیں لڑکپن سے اٹھا کر بڑھا پے میں ڈال دیتا ہے۔

انہیں علم ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ جوان بھی ہوئی تھیں اور جو

تھا اور تمہاری آواز جو دوسریوں سے الگ تھلک تھی، تمہاری چال کی لوح کی طرح اور تمہاری آنکھوں کے خوار کی طرح مجھے ایسا دیوانہ بنا گئی کہ میں نے اس شادی کے بعد بھی تمہیں دوبارہ دیکھا تھا۔ میں کسی بہانے چپا کے گھر آ ہی جاتا تھا۔ میں نے تجھی سے کہا تھا کہ تمہارے رشتے کی بات کریں۔ پھر جو تم پر ہتی وہ تم جانتی ہو مگر جو مجھ پر ہتی وہ تم نہیں جانتیں۔“

بڑھیا کے ہونٹ لرزے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ اُس کی آنکھیں غمناک ہو گئیں مگر آنکھوں کو ہلی گئیں۔

بوڑھا کہہ رہا تھا۔ ”وہ میری خالہ تھی جس نے تمہاری ماں سے پوچھا تھا کہ یہ لگائی بھائی تو نہیں کرتی؟ مگر وہ اُس لڑکی کو میری زندگی میں دھکیل کر خوش ہو گئیں جو لگائی بھائی کے سوا کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ تم عورت ہو لوری اتم نے عورت کی تصویر میں بڑے

پیارے رنگ بھرے ہیں۔ میں نے ایک سانپ دیکھا تھا جس کا رنگ چمکا ہوا بیز تھا۔ اتنا پیارا رنگ کہ میں نے اسے مارا نہیں تھا مگر اسی سانپ نے میری بکری کو دانک مارا تو میری بکری بغیر تڑپے مر گئی تھی۔ مجھے بھی رنگوں نے ڈس لیا۔ ماں باپ گیارہ جوڑے ریٹھی کپڑے، ہارہ تولے سونا اور جہیز سے لدی ہوئی لاری کو دیکھ کر پھولے نہ سائے تھے مگر جس جہیز نے تیرے باپ کے سینے پر پانچ من وزنی ریل رکھ دی تھی، اسی جہیز نے وہی ریل میرے سینے پر بھی رکھ دی تھی۔ میری دلہن کے ہاتھوں کی ہندی کا رنگ ابھی تازہ ہی تھا کہ اُس نے مجھے میری ماں سے لڑا دیا پھر گھر کے سارے ہی لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ میں نے اپنی بیوی کو مارا، ماں کو چٹا، اپنے باپ کے منہ آیا اور میرا اچھا بھلا گھر جہنم بن گیا۔“

”لوری! میرے لئے کوئی پناہ نہیں تھی۔ پھر ایک روز میں نے بھاگ کر تیرے تصور میں پناہ لے لی۔ مگر

میں ایسا فساد مچا ہوا کہ میری بیوی روٹھ کر مچے چلی گئی۔ وقت گزرنے لگا اور طلاق ہو گئی۔ مجھے شادی سے نفرت ہو گئی، پر تیرے تصور کو ذہن سے اتار نہ سکا۔ ماں باپ نے بہت مجھڑ کیا کہ دوسرا بیاہ کر لو۔ میں نے کہا کہ کروں گا تو لوزی سے کروں گا۔ ماں نے کہا کہ عزت والے لوگ تمہوکے نہیں چاہا کرتے۔ وہ ہمارا دھکارا ہوا رشتہ ہے۔ لوری!“

اُس نے لپک کر لوری کے دونوں ہاتھ قیام لئے اور زندگی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آج تیرے دروازے پر آگرا ہوں۔ ساری عمر اکیلے گزار دی ہے۔“ اُس نے بڑھیا کو زمین سے اٹھا کر اپنے پاس کھٹ پر بٹھا لیا اور گرتے کی جیب سے کانچ کی چوڑیاں نکال کر لوری کی مر جھائی ہوئی کلائیوں پر چڑھا دیں۔ کہنے لگا۔ ”لوری اتم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، مجھے تم سے محبت ہے۔“

لوری نے بے تابی سے بوڑھے کے رعشہ کیر ہاتھ قیام لئے اور اس کے ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا کر سسکنے کے لہجے میں کہا۔ ”ایک بار پھر کہو، تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ پھر کہو، مجھے تم سے محبت ہے۔“ وہ ہچکیاں بھرنے لگی اور بولی۔ ”تم بہت بوڑھے ہو پر تم نے پانچ من کی ریل اٹھالی ہے۔ میں نے باپ کی میت سے یہ ریل اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لی تھی۔ آج اہلی پھلکی ہو گئی ہوں۔ یہ ریل پھر مجھ پر رکھ کر چلے نہ جانا۔“

بوڑھے نے اُس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ ”میں چلے جانے کے لئے نہیں آیا لوری! میں یہیں دفن ہونے کے لئے آیا ہوں جہاں تم نے میرے ہاتھ کا لکھا ہوا سندیس دفن کیا تھا۔“ اور بوڑھے کے آنسو لوری کے سپید راکھ جیسے بالوں میں گرنے لگے۔



## تریاق

اس زندگی کی تلخیوں کو بچن لو یا اس زندگی کی تلکین ماضی نہ بچو!

☆.....رہی شاید

ضمہری۔  
"میں تو یونہی مایوس ہو رہی تھی۔" اس نے جیسے اپنا  
بلاق اڑایا ہو یا ان لوگوں کا جن کی ہوس اور زندگی کی انتہا  
کبھی نہیں ہوتی۔

قدموں کی آہٹ قریب آرکی۔ وہ ایک بارہ تیرہ  
سال کا بچہ تھا، گندہ ناکمل لباس اور ایک بڑا سا بدنما تھیلا  
جیسے اس کا کل اکاڑ تھا جو اس کے بڑھتے ہوئے قد کو  
ڈھانپے ہوئے تھا۔ زمین پر کچھ ڈھونڈتی اس کی نگاہیں  
جھیلہ کے بدنما بیروں کو لپیٹے سینڈل پر آریں۔

"سلام باجی جی!"

"ولیکم السلام"۔ جھیلہ نے بد دل سے جواب دیا  
اور ذہن میں سوچنے لگی۔ ابھی کچھ ہاتھ لگے گا..... میں بھوکا  
ہوں..... پیسے دے دو باجی جی۔ "ہونہہ" اس نے نفرت  
سے ہٹکارا بھرا۔ گھنیا لوگوں کی کم تر اولاد جن کا وجود ان  
کے اپنے ماں باپ کے لئے بوجھ ہے۔ پیدا کر کے  
سڑکوں پر چھوڑ دیتے ہیں اس نے دل ہی دل میں "گھنیا  
لوگوں" کو کوسنا شروع کر دیا لیکن کافی دیر گزر گئی۔ اسکی  
کوئی آواز نہ آئی۔ وہ لڑکا دور پڑے کوزے کے ڈبیر میں  
سے کچھ ڈھونڈتا اور اسے کسی اہول خزانے کی طرح اپنے  
تھیلے میں ڈال دیتا۔ چہرے پر عجب سا سکون تھا جس نے  
جھیلہ ہالو کو چوٹا دیا تھا۔ "گاہک" کے آنے تک وہ اسی  
سڑگری کو انجوائے کرنے لگی اس کے چہرے پہ ایک تجسس

سڑک کے مشرقی کنارے جہاں روشنیاں سہ شام  
ہی مدھم ہو جایا کرتی تھیں اور کچھ لوگوں کے  
لئے یہ مدھم روشنیاں بظاہر ان کی زندگی کے اجالوں کا  
سبب بنا کرتی تھیں۔ جھیلہ ہالو اپنی عمر کے ڈھلتے پن کو  
سمیٹنے اپنی ضرورت کی ڈور کو کسی آن چاہے اور انجانے  
رشتے میں مدھم کرنے کی خواہاں تھی۔ مسئلہ رشتے کا نہیں  
تھا۔ یہ مسئلہ عزت نفس، خودداری اور مدھم ذات سے لکل کر  
ضرورت اور بس ضرورت کا ہی تھا۔ پیٹ کی آگ  
بجھانے کی ضرورت سر چھپانے کی ضرورت اور زندگی کی  
بچی مکی سانسوں کو قائم رکھنے کی ضرورت۔

آج کافی دیر سے جھیلہ نے اپنی کلائی پر بندھی  
واحد بوسیدہ گھڑی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ہوس  
اور دولت کے پھاریوں کے پاس پیسے کی ریل کیل  
ہونے کے باوجود وہ بھوکی سوئے گی۔ "نہیں"۔ اس کے  
اندر سے جیسے کسی کی درد بھری آواز آئی ہو اور اس کے  
تھکے چہرے پہ جھوٹی مسکان پھیلی۔ "بھر آج یہ دیر  
کیوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ کبھی ایسا ہوا تو نہیں  
تھا۔ اس شہر میں ہر قدم اور ہر لمحہ ضرورت کے پھاری  
بھٹکتے بھٹکتے اس موڑ پر آ ہی رکتے تھے۔ بھر آج۔ ذرا دور  
سے اپنی طرف بڑھتی ہوئی آہٹوں کی آواز نے اسے  
خیالوں کی دنیا سے باہر آدھکیلا۔ اس کے مصنوعی آرامش  
سے بچہ چہرے پہ ایک شکاری کی طرح مسکراہٹ آ

"اچھا....." بھیلہ نے بیک ٹھولا گئے چنے سوئی روپے تھے اس نے نہیں روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "لے لو!"

"نہیں باجی! ابا کہتا ہے حلال کی کھاؤ ورنہ اس جسم کو آگ لگے گی۔"

"ہا ہا ہا..... آگ؟"

"ہاں باجی! ابا کہتا ہے کہ یہ دنیا تو عارضی ہے ختم ہو جائے گی ایسے کام کیوں کریں کہ آخرت بھی خراب ہو جائے۔" اس نے مصمصیت سے کہا۔

"سب فضول باتیں ہیں، بڑی بڑی کانفرنسوں میں بیٹھے فارغ، خوش لباس اور آسودہ لوگوں کی باتیں اور دل میں منافقت لئے بڑے بڑے سینٹوں کی ہوائی باتیں یا پھر مل کلاس لوگوں کی خالی خولی اخلاقیات جس سے پیٹ نہیں بھرتا۔" بھیلہ سوچنے لگی اور مٹی اس کے چہرے سے نمایاں ہونے لگی۔

"کیا ہوا باجی! اب جاؤں میں؟"

"نہیں رکو۔ اور کیا کہتا ہے تمہارا ابا؟"

"ابا کہتا ہے اس زندگی کی تکلیفوں کو بچن لو یا اس زندگی کی تسکین عارضی نہ چنو مستقل کو چنو۔ بس یہ دنیا عارضی ہے اور وہ دنیا ہمیشہ رہے والی۔ اچھا باجی! چلتا ہوں سلام!"

بھیلہ کے بے جان جسم میں جیسے کچھ نہ بچا ہو کبھی کبھی ایک لفظ، ایک جملہ وہ کام کر جاتا ہے جو دوسروں کی بڑی بڑی باتیں نہ کر پائیں۔

عارضی کو نہ چنو مستقل کو چنو۔ اب اسے پتہ چلا کہ آج میں کیا خاص بات تھی۔ آج اس کے خالق کو اسے زندگی کا قسط سمجھانا تھا۔ اسے راہ راست پہ لانا تھا۔ وہ مالک کتنا مہربان ہے اور میں کتنی خوش نصیب۔ یا اللہ! یا اللہ! اس کے آنسوؤں نے بہہ جانے رستہ دیکھ لیا۔

مدحہ

آٹھرا جیسے کوئی آن ہونی ہوئے کو ہے۔ جیسے معمول سے ہٹ کر کوئی عمل ہونے کو ہے۔

ایسا ہوتا تو نہیں پھر آج؟ اس نے سوچا آج میں کیا خاص بات ہے جو ہر عمل کو متاثر کر رہا ہے۔ رزق کی تلاش میں دیر؟ گھٹیا لوگوں کی کم تر دلدادہ مانگنے سے گریزاں؟ ذہن فارغ ہوتا بے وقعت چیزیں اور چہرے بھی اہم ہونے لگتے ہیں جیسے یہ بچہ اور اس کا کام۔ بچے کی مستلشی آنکھیں اب سکون میں تھیں جیسے جو تلاش کرنا تھا مل گیا ہو۔

وہ بھیلہ بانو کے پاس سے ہو کر گزرنے لگا جب اس نے اسے آواز دے کر روکا۔ اس نے حیران نظروں نے اس عورت کو دیکھا۔ "آؤ بیٹھو۔" بھیلہ نے کہا۔

"نہیں ماں انتظار کر رہی ہوگی، مجھے جانا ہے۔" بچے نے ذمہ داری سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں تھوڑی دیر بس۔" بھیلہ نے اٹلی سی التجا کی ہو۔

کیوں؟ وہ خود نہ جان سکی۔

"جی باجی!"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"راجا سکندر۔" اس نے جواب دیا۔

"راجا سکندر!..... ہا ہا ہا ہا! راجا اور سکندر بھی۔"

"کیوں باجی! کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، پڑھتے ہو کیا؟"

"جی باجی!"

"کون سی جماعت میں؟"

"تیسری میں ہوں جی۔" وہ فخر سے بولا۔

"اچھا تو یہ کام کیوں کرتے ہو پھر؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابا مزدور ہے جی، دیہاڑی میں پوری نہیں پڑتی۔ اماں بیمار رہتی ہے، گھر کا خرچہ مشکل سے چلتا ہے اسی لئے۔"

## رنگا ڈاکو

زور آوروں کے ظلم اور انصاف نہ ملنے پر ایک شریف اور  
سیدھے سادے نوجوان کو اورنگ ہے سے ”رنگا ڈاکو“ بننے پر مجبور کر دیا۔

محمد رضوان قیوم



شمارہ جولائی 2014ء میں ایک کہانی "نسب" میں رچکا ڈاکو کا سرسری سا ذکر آیا تھا۔ میں نے قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ رچکا ڈاکو کی کہانی پھر بھی تفصیل سے سناؤں گا۔ حسب وعدہ یہ کہانی پیش خدمت ہے۔ (مصنف)

بٹی نورالعین کو تلاش کر کے لاؤ۔ اورنگزیب بھی ماں سے لپٹ کر رونے لگا جبکہ ولایت الدین انہیں تسلیاں دینے لگا۔

"ماں! ہم نے نورالعین کو بہت تلاش کیا لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلا رہا ہے۔" اورنگزیب نے اُسے بتایا۔ کچھ دیر بعد زمیندار راجا کھیرن اپنے چند کارندوں کے ساتھ آ گیا۔ اسے دیکھ کر ولایت الدین اس کے قریب روتا ہوا گیا اور اس کے پاؤں پر گر کر گڑ گڑا کر بولا۔

"راجا صاحب! میری بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے، میں نے اور اورنگزیب نے اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ ہمیں نہیں ملی، میری اس معاملہ میں مدد کرو۔"

راجا کھیرن نے اسے قدموں سے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "ولایت الدین! میں نے اپنی حویلی میں تیری بیٹی کی گمشدگی کی اطلاع سن لی تھی۔ تو پریشان نہ ہو میں ابھی تیرا یہ مسئلہ حل کرتا ہوں۔" اس نے ولایت کے مکان میں موجود لوگوں کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ "تم ایک لمحے کے لئے میرے پاس آؤ۔" سب اس کے پاس آ گئے۔

"تم لوگ یہاں فصول کھڑے کیا کر رہے ہو؟" راجا کھیرن نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "مورکھو! تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ تمہارا پڑوسی ولایت الدین اس وقت کتنے کڑے کرب سے گزر رہا ہے، اس کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے۔ ہم سب کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم ولایت الدین کی اس مصیبت میں اس کا بھرپور ساتھ دیں۔ تم میں سے

اورنگزیب قریب ایک گاؤں کے ایک ہندو زمیندار راجا کھیرن کے کھیتوں میں بحیثیت حراسے کا کام کیا کرتا تھا۔ 1932ء میں اورنگزیب کی عمر 19 سال اور اس کی بہن نورالعین کی عمر 17 سال تھی۔ ولایت الدین کی بیوی تب دق کے عارضہ کے باعث کافی عرصہ سے کانٹھ سے لگی معذوری کی زندگی گزار رہی تھی۔ ولایت الدین نے اپنے مکان کے سامنے کچھ بھیڑ بکریاں پالی ہوئی تھیں جنہیں کبھی اورنگزیب اور کبھی نورالعین چرا یا کرتے تھے۔ بکریوں کا دودھ راجا کھیرن کی حویلی میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اس سے ولایت الدین کو اضافی آمدنی ہو جایا کرتی تھی جبکہ گوشت کے قابل فریب بھیڑ بکریوں کو ولایت الدین مقامی قصائیوں کو گوشت کی فرض سے فروخت کر دیا کرتا تھا۔ ولایت الدین جس جگہ رہتا تھا وہاں ارد گرد ہندو سکھ کی اکثریتی آبادی تھی۔ ہندو سکھ فطری طور پر مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اسی لئے ولایت الدین بھی اُن سے تھلنے پٹنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں گزار دیتا تھا۔

ایک صبح نورالعین اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے علاقہ کی قریبی وادی میں گئی تو شام کو اس کی بکریاں تو واپس آ گئیں لیکن وہ نہ آئی۔ ولایت الدین اور اورنگزیب تشویش اور پریشانی کے عالم میں اُسے ارد گرد کے علاقہ میں ڈھونڈنے لگے۔ انہوں نے پہاڑوں، چراگاہوں میں چلا چلا کر پکارا۔ "نورالعین..... نورالعین!" لیکن ان کی تلاش بے ثمر کے بعد انہیں نورالعین نہ ملی۔ وہ تھک ہار کر مایوسی کے عالم میں اپنے گھر آ گئے جہاں نورالعین کے لاپتہ ہونے کی خبر سن کر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ولایت الدین کی بیوی کانٹھ پر پڑی بلک بلک کر لوگوں سے فریاد کر رہی تھی کہ خدا کے واسطے میری

چنانہ کرو کہ میں تمہیں انصاف نہ دلاؤں گا۔ میں تمہاری بہن کے قاتل اور اس کی عزت خراب کرنے والے کو عبرت کے نشان میں تبدیل کروں گا لیکن مجھے اب اس معاملہ میں باقاعدہ قانونی کارروائی کرنی ہے۔ میری آپ دونوں سے استدعا ہے کہ تم دونوں میرے ساتھ بھرپور تعاون کرنا اور جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا۔

”سرکار! ہم رہے غریب مزارعے۔“ اور نگزیب نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”ہماری کون سنتا ہے؟“

”ارے میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ تو اس بات کی فکر نہ کر کہ تمہیں انصاف نہیں ملے گا۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”ارے میں جو آ گیا ہوں تمہاری دادرسی کے لئے۔“

زمیندار راجا کھیرن جو قریب ہی کھڑا تھا، وہ دونوں باپ بیٹے کے قریب آیا اور اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں لورالین کی عزت لوٹنے اور اسے قتل کرنے والے فونی ہاتھوں کی کھوج لگا کر رہوں گا۔ تم لوگ جبر سے کام لو۔ تھانیدار نہیل دھرم کو اپنی قانونی کارروائی کرنے دو۔“

”سرکار! کیسی قانونی کارروائی کریں گے؟“ ولایت نے پوچھا۔

”جو بہتر ہوگا ہم وہ کریں گے۔“ تھانیدار نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یاد رکھو! اس بات کی احتیاط رہے کہ تم نے مقتولہ کی میت کو کسی حال میں چھیننا نہیں ہے۔ ہم نے اس کی میت کو پشمارم اور کچھ ضروری میڈیکل رپورٹوں کے لئے جہلم شہر کے سرکاری ہسپتال لے کر جانا ہے۔“

”نہیں، خدا کے واسطے میری مظلوم بیٹی کی میت کی بے حرمتی نہ کرنا۔“ ولایت الدین کی بیوی نے چارپائی پر پڑے بے بسی سے روتے ہوئے کہا۔

”ابا جی! مقتولہ کے ساتھ ظلم کرنے والے کو

نورالین کی نہیں دور دراز کے علاقہ جات میں بھی کی تلاش میں نکلیں اور اوجیز عمر افراد گرد کے ان علاقوں میں جائیں جہاں لورالین اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے جایا کرتی تھی..... ولایت الدین میرا پرانا دفا دار مزارع ہے اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔“

راجا کھیرن نے ولایت الدین اور اورنگ زیب کو کہا کہ تم دونوں آرام سے اپنی جھونپڑی میں بیٹھو۔ یہ گاؤں کے لوگ تیری بیٹی کو ڈھونڈ لائیں گے۔ گاؤں کے ہر عمر کے لوگ ساری رات قریب قریب پھر کر گمشدہ لورالین کو تلاش کرتے رہے۔ بالآخر رات کے دوسرے پہر لورالین مردہ حالت میں گاؤں کی حدود سے باہر ایک سوکھے کنواں میں مل گئی۔ لورالین کی لاش کو گاؤں کے چند جوان اٹھا کر لائے تو ولایت الدین بیٹی کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گیا جبکہ لورالین کی ماں نے دیوالوں کی طرح اپنے بال لوچنا شروع کر دیئے۔ اور نگزیب رو رو کر اتنا بکاں اور بے حال ہوا کہ اسے سہا لٹا مشکل ہو گیا۔

لورالین کا منہ بری طرح سو جا ہوا اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں جبکہ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ پہلے زیادتی کی اور پھر اسے قتل کر دیا۔

”ہائے..... کس نے میری بیٹی کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے؟“ اسی کی ماں آسمان کی طرف منہ کر کے بین کرنے لگی۔ ”اے خدا! میری بیٹی کے ساتھ جس نے اتنا ظلم کیا ہے تو اسے اسی طرح ذلیل و رسوا کرنا جس طرح ہم ہوئے ہیں۔“

وہ بیچاری اس کے سوا اور کبھی کیا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد متعلقہ تھانے سے پولیس بھی پہنچ گئی۔ نہیل دھرم تھانیدار نے سب سے پہلے ولایت الدین اور اورنگ زیب دونوں کو اپنے پاس بلا کر پہلے ان سے لورالین کے بھانہ قتل پر اظہار افسوس کیا اور پھر انہیں کہا کہ تم اس بات کی

صاحب سنبھال لیں گے۔" راجا کھیرن نے اورنگزیب کی بات سن کر کہا۔

"بس، تھانیدار صاحب امیری بہن کا قاتل کسی صورت نہیں بچتا چاہئے۔" اورنگزیب نے کہا۔

تھانیدار دھرم نمل اورنگزیب کے قریب گیا اور اُسے اپنے دل سے لگا کر چمکارتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! دیکھ میں حیری بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہوں۔ میں اُسے پاتل سے بھی ڈھونڈ لائوں گا۔"

"نمل دھرم! تو کچھ ایسا کر کہ قانونی تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور مقتولہ کا پوسٹ مارٹم بھی نہ ہو۔" راجا کھیرن نے تھانیدار سے کہا۔

تھانیدار دھرم نمل نے کافی دیر تک مردہ نورالعین کے جسم کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے کے علاوہ اس کی کئی تصاویر بنوائیں اور کئی مقامی دیہاتیوں کے بیانات لئے۔ اس کے بعد اس نے ولایت الدین اور اورنگزیب کو میت دفنانے کی اجازت کے ساتھ یہ کہا کہ تم دونوں مجھ سے رابطہ میں رہنا۔ اُدھر زمیندار راجا کھیرن نے بھی دونوں باپ بیٹے کو یہ یقین دلایا کہ وہ تھانیدار سے اس کیس کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ لیتا رہے گا۔

نورالعین کو آدھ سسکیوں کے ساتھ دفنا دیا گیا۔ اس کی لپاچ ماں، باپ ولایت الدین اور بھائی اورنگزیب آخر تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ وہ بچا رہے اس کے سوا کبھی کیا سکتے تھے۔

مقتولہ کی تدفین اور کفن، دفن ہڈیوں کے لئے آنے والے مہمانوں کے تمام اخراجات راجا کھیرن نے ادا کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تھانیدار دھرم نمل، اورنگزیب اور ولایت الدین کے ساتھ مختلف جگہوں میں جا کر انویسٹی گیشن کرتا رہا۔

"تو اب بوڑھا ہو گیا ہے۔" تین روز بعد راجا

پکڑنے اور قانونی عمل سے گزرنے کے لئے یہ سب کچھ تو کرنا پڑے گا۔" تھانیدار نے کہا۔

یہ باتیں سن کر جھوم میں سے ایک ہندو بیڑھیا آگے بڑھی اور اس نے تھانیدار پر چلائے ہوئے کہا۔ "ایک تو نورالعین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اب تم یہ چاہتے ہو کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی لاش کی چیراچھاڑی کروا کے تذلیل کروائی جائے؟"

"ماس! تو درمیان میں ہمیں اپنا مشورہ نہ دے۔" تھانیدار نے کہا۔ "مقتولہ کے خاندان سے پوچھنے دے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

"ادھر آؤ ولایت الدین!" راجا کھیرن نے کہا۔ "تو نے مقتولہ کا پوسٹ مارٹم کروانا ہے یا نہیں؟ تو جیسا چاہے گا میں تھانیدار صاحب سے کہہ کر ویسا ہی کروا دیتا ہوں۔ یہ بہت اچھا تعاون کرنے والا انسان ہے، یہ وہی کرے گا جو میں اسے کہوں گا۔۔۔۔۔ ولایت الدین تو کیا کہتا ہے؟"

"سرکار! مجھے تو سچی بات ہے کچھ بھائی نہیں دے رہا ہے۔" ولایت نے غمزہ آواز میں کہا۔ "کسی ظالم نے میری بیٹی کی نہ صرف بے حرمتی کی بلکہ اُسے جان سے بھی مار دیا ہے۔ راجا صاحب! اب آپ ہی بتائیں میرا اب کیا رہ گیا ہے۔ مجھے بس میری بیٹی کی جان اور عزت کو پامال کرنے والا مجرم چاہئے۔"

"نہیں بابا! میں اب یہ گوارہ نہیں کروں گا۔" اورنگزیب نے تڑپ کر کہا۔ "میری بہن کی میت کو شہر کے ہسپتال میں چیر پھاڑ اور دیگر ڈاکٹری رپورٹوں کے لئے کھینا جائے۔"

"ولایت الدین! تیرے ساتھ جو ظلم ہو گیا سو ہو گیا لیکن اب تو اپنی مری بیٹی کو غسل دے کر عزت سے قبر کے حوالہ کر۔ رہا سوال قانونی چارہ جوئی کا تو وہ تھانیدار

کھیرن نے ولایت الدین کو کہا۔ ”تو اب گھر پر آرام کر اور میں تجھے دوسو روپے ماہانہ وظیفہ دیا کروں گا اور ان پیسوں کے علاوہ اپنی بھیڑ بکریوں اور دودھ کا کام جاری رکھ۔“

ولایت الدین کو راجا کھیرن کی بات مناسب لگی اور اُس نے مفت کے دوسو روپے ماہوار لینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اب اورنگزیب اپنے باڑے میں پانی ہوئی بھیڑ بکریوں کو چراتا۔ ان سے حاصل دودھ کو راجا کھیرن کی حویلی اور ارد گرد کے مناجب حیثیت لوگوں کو فروخت کرتا جبکہ ولایت الدین گوشت کی غرض سے دودھ سے سوکھی بکریوں کو قصابوں کو فروخت کرنے کے معاملات وغیرہ سنبھالا کرتا تھا۔

اسی دوران تھانیدار نبل دھرم نے نورالعین کے قتل اور زیادتی کے شبے میں گاؤں کے کئی ملکوک لوگوں کو پکڑ لیا لیکن اس نے ان سب کو بغیر کسی پیش رفت کے چھوڑ دیا۔ وہ ولایت الدین، اورنگزیب کو آئے روز تھانے بلا کر طفل تسلیاں دیتا رہا۔

دوسری طرف راجا کھیرن کچھ روز تک دلوں باپ بیٹے کے ساتھ تھانے پکھریوں میں جاتا رہا لیکن پھر اُس نے بھی اُن کے ساتھ اپنے تعاون میں شست روی دکھانا شروع کر دی۔ بالآخر ایک دن ولایت الدین خود ہی تھک ہار کر دھرم نبل تھانیدار کے دفتر میں چلا کر کہا۔ ”میں نورالعین کے قتل اور بے حرمتی کا معاملہ اپنے خدا پر چھوڑتا ہوں۔“

تھانیدار نے اس کی جانب سے یہ بیان سن کر یہ کیا کہ نورالعین کے قتل اور اس کیس اتھ زیادتی کا کیس کسی نامعلوم شخص پر ڈال کر کیس فائل کر دیا۔ اسی دوران نورالعین کی ماں جو پہلے ہی تب دق کے مرض کا شکار تھی وہ اپنی بیٹی نورالعین کی عزت لٹنے اور قتل کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ زمیندار راجا کھیرن حسب وعدہ ولایت

الدین کو ماہانہ دوسو روپے بھیجتا رہا۔

اس کہانی میں ایک نیا موڑ اس طرح آیا کہ ایک دن اورنگزیب اپنی بکریوں کو چراتے ہوئے ایک ایسی جگہ جا لگا جہاں ٹھہرے پانی کا بہت گہرا جوہڑ تھا، وہاں اپنی بکریوں کو پانی پلانے کی غرض سے جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں فلک شکاف آوازیں نکلاں۔ ”بچاؤ، بچاؤ، بھگوان کے واسطے کوئی ہے جو میری زندگی بچالے میں ڈوب رہا ہوں۔“ اورنگزیب بجلی کی رفتار سے اُس گس (جوہڑ) کی طرف بھاگتا ہوا پہنچا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک آشنا شخص جوہڑ میں تقریباً ڈوبنے کے قریب ہے اور وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اورنگزیب نے آؤ دیکھانہ تاؤ قریب پڑی ایک لمبی سی شاخ اٹھا کر اس کی جانب بڑھائی تاکہ وہ اُسے پکڑ کر باہر آ جائے۔ ڈوبنے والے نے اس شاخ کو پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اسے پکڑنے میں ناکام رہا تو اورنگزیب نے اُسے کہا کہ تو گھر نہ کر میں خود جوہڑ میں اتر کر تجھے بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔

”نہیں نہیں میرا بچنا مشکل ہے۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”تم اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو۔“

اورنگزیب نے کہا کہ بے شک تمہیں بچانے میں میری زندگی ہی کیوں نہ چلی جائے میں کوشش ضرور کروں گا۔

اورنگزیب نے اپنی جان پر کھیل کر ڈوبتے ہوئے اُس شخص کو بچا کر اُسے ایک خشک جگہ پر لٹایا۔

”اورنگزیب! تم نے میری زندگی بچا کر مجھے عمر بھر کے لئے خرید لیا ہے۔“ اُس آدمی نے اُس کے پاؤں پکڑ کر کہا۔

”میں تمہیں نہیں جانتا لیکن تم نے مجھے کیسے پہچانا تم

کون ہو؟“ اورنگزیب نے پوچھا۔

”میرا نام دھوٹی ہے۔“ اس شخص نے کہا۔ ”اور

ابھی ان دونوں کے مابین یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک دھومنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور ساتھ ہی اس حالت میں اور نگزیب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔  
”دھومنی بھائی! تجھے کیا ہوا ہے تو اس طرح بلک بلک کر کیوں رو رہا ہے؟“ اور نگزیب نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ابھی تم نے کچھ لمحے پہلے مجھے کہا تھا کہ تمہارا خدا تمہارے مرنے کے بعد تم سے پوچھتا کہ تم نے کسی ڈوبتے شخص کو ڈوبنے سے کیوں نہ بچایا۔ تم نے مجھے مرنے سے بچا کر اپنے ضمیر کے زندہ اور خدا کے سامنے سرخرو ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ تم نے تو اپنے ضمیر کو مرنے نہیں دیا لیکن میں نے بھی تو اپنی مرگ کے بعد اپنے بھگوان کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے کالے کرتوتوں کا جواب دہ ہونا ہے۔“

”تم اور کالے کرتوت؟“ اور نگزیب نے ایک بار پھر تجسس ہو کر پوچھا۔

”ہاں، لڑکیوں عورتوں کی عزتوں سے کھیلواڑ کرنے والے ظالم بے رحم زمیندار راجا کھیرن کی عیاشی کے لوازمات کا انتقام کرتا ہوں۔“ دھومنی نے کہا۔ ”اب تو میں سوچ رہا ہوں کہ کاش تم مجھے بھگوان کی صورت میں آ کر اس جوہڑ میں ڈوبنے سے نہ بچاتے، میں مرجاتا تو بہتر ہوتا۔“

”دھومنی تم اس قسم کی ابھی باتیں کر کے مجھے ہنسلیوں میں نہ ڈالو۔“ اور نگزیب نے کہا۔ ”تم مجھے اب وہ جلاؤ جو تم کو پریشان کر رہا ہے۔“

”اور نگزیب بھائی! تم میرے محسن اور شریف انسان ہو۔“ دھومنی نے کہا۔ ”تم نے تو میرا ضمیر جگا دیا ہے۔“

”یہ تم اپنے ضمیر کے جاننے کی کیا بات کر رہے ہو۔“ اور نگزیب نے تجسس سے اس سے پوچھا۔ ”کیا

میں زمیندار راجا کھیرن کے پورے کا خاص بندہ ہوں۔“  
(پورہ یا پورے دراصل اپنے سے نکلا ہے۔ پنا سے مراد علاقہ کے بڑے بد معاش یا زمیندار کی رہائش گاہ سے ہٹ کر وہ بڑی ہینٹک ہوتی تھی جہاں اس کے پار دوست ڈیرہ لگاتے تھے۔ اسے رہائش گاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔) ”تم تو میرے لئے بھگوان بن کر آ گئے جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے نیا جیون دیا ہے۔“ دھومنی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”اگر میں تمہیں نہ بچاتا تو میرا ضمیر مجھے ساری عمر عین لعین کرتا۔“ اور نگزیب نے اسے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ ”اور اس بات کے لئے مجھے خدا کے آگے جوابدہ ہونا پڑتا۔ ویسے بھی میں زندہ کہاں ہوں میری بیماری بہن نورالین کا جس دن قتل ہوا ہے میں تو اسی دن مر گیا تھا۔ میں تو صرف ایک زندہ لاش ہوں۔ تم بار بار اپنی جان بچانے کا مجھ سے شکریہ ادا نہ کرو۔ ہاں، یہ تو میں بھول گیا کہ تم سے پوچھوں کہ میں تو اس جگہ اپنی بھیڑ بکریاں چرانے آیا تھا تم یہاں کیسے آئے اور ڈوبنے لگے؟“

”میں دراصل یہاں اپنے مالک راجا کھیرن کے لئے جنگلی خرگوش کے شکار کے لئے آیا تھا۔“ دھومنی نے کہا۔ ”میں نے ایک بڑے خرگوش کو سونا (ایک قسم کا چھوٹا اتھیار جس سے چھوٹے جانور شکار کئے جاتے تھے) ماری تھی جس سے وہ ہلکا سا زخمی ہو کر بھاگ رہا تھا۔ اسے پکڑنے کی کوشش میں اس جوہڑ میں گر کر پانی کے اندر موجود چٹکی کیپڑ میں دھنسنے لگا تھا۔ راجا کھیرن کو جو شکاری جنگلی خورگوش پکڑ کر لا کر دیتا ہے تو وہ خوش ہو کر انعام میں کچھ روپے دے دیتے ہیں۔ نئی بات ہے میں اسی لالچ میں یہاں آیا تھا۔ آج راجا کھیرن کے چند خصوصی دوست آ رہے ہیں انہوں نے مجھے کہا تھا کہ تم چند جنگلی خرگوش کا شکار کرنے کی کوشش کرو، وہ اسے اپنے دوستوں کو دیسی شراب کے ساتھ پیش کریں گے۔“

پہلے تمہارا ضمیر سوتا ہوا تھا؟ میں تو اس بات سے الجھ گیا ہوں۔"

"میں تمہارے سامنے ایک بھیا تک انکشاف کرنے والا ہوں۔" دھومنی نے کہا۔ "پہلے تو تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اسے سن کر فوری طور پر اشتعال میں نہ آؤ گے اور نہ ہی فوری طور پر اپنا رد عمل ظاہر کر دو گے۔"

اور نگزیب نے اس سے وعدہ کیا کہ جیسا وہ چاہے گا وہ ویسا ہی کرے گا۔

دھومنی نے اس کے سامنے یہ بھیا تک انکشاف کیا کہ تیری بہن نورالعین کی بے حرمتی اور اسے قتل کرنے والا مرکزی کردار راجا کھیرن ہی ہے۔ اور نگزیب نے اس وقت دھومنی کے منہ سے یہ انکشاف بڑے قتل سے سنا۔ دھومنی نے اس واردات کی تفصیل یوں سنائی۔

ایک دن راجا کھیرن کے تین بد معاش دوست اسے ملنے اس کے ڈیرے میں آئے۔ بلراج، سانو اور مکیش۔ دراصل راجا کھیرن نے اپنے دوستوں کے لئے یہ دعوت شراب اور زنا کے لئے سہائی تھی۔ اس وقت پنورے میں راجا کھیرن اور پنورے کا کرتا دھرتا ماجو سنگھ بھی تھا۔ یعنی یہ نوٹل 5 افراد تھے۔ یہ پانچوں ایک مخصوص جگہ بیٹھ کر شراب کے ساتھ کاجو اور جنگلی خرکوش کے مزے اڑا رہے تھے۔

"یار اگر کسی حسینہ کا بندوبست ہو جائے تو ہمارا مزہ دو آتھ ہو جائے۔" مکیش نے راجا کھیرن کو کہا۔

"ہاں یار کھیرن! تیری یہ دعوت بغیر جسمانی راحت کے ادھوری ہے۔" بلراج نے درمیان میں یہ لقمہ دیا تھا۔ "تمہاری راحت کا سامان اس لئے مشکل ہے۔"

راجا کھیرن نے کہا۔ "کیونکہ آج کل میری رکھیل سونا بنا رہی گئی ہوئی ہے ورنہ میں اس کو بلا لیتا۔"

"ارے کھیرن! اس قسم کی باتیں کر کے ہمارے نشہ کا مزہ کرنا نہ کر۔"

یہ پانچوں دوست آپس میں بیٹھے قتل منگھو کرنے لگے۔ اسی دوران موجا سنگھ کسی کام سے باہر گیا اور وہ تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ تیری معصوم بہن نورالعین کو چراگاہ سے ورغلا کر لے آیا اور اسے کہا کہ تیرا باپ راجا کھیرن کے پنورے میں ہے اور وہ تجھے جلا رہا ہے۔ وہ بیچاری اس کے بہکاوے میں آگئی اس نے جب پنورے میں اپنے باپ کو نہ پایا اور وہاں راجا کھیرن اور اس کے چار دوستوں کی شیطانی نظروں کو دیکھا تو اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے بھاگنے کی تمام کوشش اس وقت رائیگاں گئی جب راجا کھیرن سمیت پانچوں کتوں نے اس معصوم بچی کو آرام سے دبوج کر باری باری اپنی ہوس کا شکار بنا دیا۔ (1) (بھاری، فراہ) ہانڈ میں پڑے بکریوں کو ہٹالے والے ڈنڈے سے مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن بھیڑیوں کے آگے وہ معصوم بے بس ہو گئی اور اپنی عزت گنوا بیٹھی۔ اس کے بعد راجا کھیرن نے مضبوطی سے اس کا گلا گھونٹا جب تلک وہ مر نہ گئی۔ اس کے دوست تو خوش ہو کر چلے گئے لیکن اب راجا کھیرن کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ مقتول نورالعین کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ اس نے ماجو سنگھ کو کہا کہ لڑکی کی لاش کو کسی دیران کنویں یا مناسب جگہ پھینک آؤ۔ لہذا اس کے حکم پر تیری بہن کی لاش کو راجا کے غنڈوں نے مناسب جگہ پھینک دیا۔"

اور نگزیب نے بڑے قتل سے دھومنی کی بات سنی اور پھر اس سے پوچھا کہ کیا تم بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے میری بہن کی لاش کو سوکھے کنویں میں پھینکا تھا۔

"نہیں، اور نگزیب بھائی! دھومنی نے کہا۔" میں اس وقت پنورے کی رسوائی میں راجا کھیرن کے دوستوں کے لئے شراب اور میوہ جات کا بندوبست کر رہا تھا۔ بھگوان جانتا ہے جس وقت تمہاری بہن کو راجا کھیرن اور

صرف میرا دس سو روپے کا وظیفہ باندھ دیا ہے بلکہ اپنی مارکیٹ میں اُس نے مجھے ڈکان بھی دی ہے اور اُس سے بڑھ کر اُس نے نورالعین کو تلاش کرنے اور پھر اس کے قتل ہونے کے بعد تھانہ کچھریوں میں ہماری کتنی مدد کی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ راجا کھیرن کے کسی دشمن نے تجھے اس کے خلاف من گھڑت کہانی سنا کر بھڑکا دیا ہے۔ نہیں بیٹا لگتا ہے تجھے غلط فہمی ہو گئی ہے۔ تو مجھے اُس کا نام تو بتا جس نے تجھے یہ بات بتلائی ہے۔ باپ کے بہت اصرار کے باوجود اورنگزیب نے دھومنی کا نام نہ بتلایا۔

دوسرے روز اورنگزیب تھانیدار دھرم نمل کے پاس تھانے پہنچا اور اسے کہا کہ دو نورالعین کی عزت لٹنے اور قتل کے سلسلہ میں راجا کھیرن کے خلاف پرچہ کاٹے۔ تھانیدار دھرم نمل نے اُسے جھڑکی دیتے ہوئے کہا کہ تیرے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ راجا کھیرن ہی اس میں ملوث ہے۔ اورنگزیب نے اسے کہا کہ یہ بات مجھے اُس کے ڈیرے کے ایک خاص آدمی نے بتلائی ہے۔

”تو مجھے اُس گواہ کا نام بتلائے گا تو میں اس کی بنیاد پر راجا کھیرن کے خلاف پرچہ کاٹوں گا۔“ تھانیدار نے کہا۔

اورنگزیب جاننا تھا کہ اگر اس نے دھومنی کا نام بتا دیا تو راجا کھیرن اسے بھی مراد دے گا۔ اس لئے اس نے تھانیدار سے کہا کہ وہ پرچہ کاٹ لے۔ وہ وقت آنے پر گواہ پیش کر دے گا۔

تھانیدار نے اُسے لتاڑ کر تھانے سے بھگا دیا۔ تھانے سے ذلیل و خوار ہونے کے بعد اورنگزیب اپنے گھر نہ آیا۔ اس کا باپ ساری رات دروازہ پر اس کی راہ نکلتا رہا۔ اسی طرح پندرہ دن ہو گئے اورنگزیب کا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا۔

ادھر زمیندار کھیرن نے اس کے باپ ولایت الدین کو یہ کہہ کر ذلیل و خوار کرنا شروع کر دیا کہ میں نے

اس کے دوست اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہے تھے تو وہ منظر مجھ سے اور میرے ساتھی پران سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔“

”یہ پران کون ہے؟“

”اورنگزیب بھائی! دراصل پران اور میں راجا کھیرن کے ڈیرے کی رسوئی میں اس کے جل پان کے لڑائیں سرانجام دیتے ہیں۔“

اس کے بعد اورنگزیب نے دھومنی سے مکیش بلراج، سانو کے بارے میں تفصیل سے اُن کی رہائش گاہوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

آخر میں دھومنی نے اسے نصیحت کی کہ اُسے قانون سے کوئی انصاف نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجا کھیرن کے ہاتھ بہت لمبے اور اثر رسوخ والے ہیں۔ وہ اپنی دولت کی بدولت قانونی مشینری کو اپنے مقصد کے لئے کرتا ہے۔ دھومنی نے اس کے سامنے یہ بھی انکشاف کیا کہ زمیندار راجا کھیرن نے تھانیدار دھرم نمل کے منہ میں بھی بڑے نوٹوں کی گندیاں ٹھونس کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ تھانیدار دھرم نمل نے جان بوجھ کے قتل اور عزت لٹنے میں کسی کو ملوث نہ دیکھا تھا بلکہ اُس نے نامعلوم لمزمان کے خلاف کچا پرچہ کاٹا ہے۔

”دھومنی! تم اس سلسلے میں کس طرح میری مدد کر سکتے ہو؟“ اورنگزیب نے پوچھا۔

دھومنی نے اُسے کہا کہ وہ ڈیرے کی ہر خبر اُسے کسی طے شدہ جگہ پر دیا کرے گا۔ دنوں واپس اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

گھر پہنچ کر اورنگزیب نے سب سے پہلے دھومنی کی طرف سے کیا گیا انکشاف جب اپنے باپ ولایت الدین کو بتلایا تو اس نے پہلے راجا کھیرن کے اس میں ملوث ہونے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اُسے کہا کہ راجا کھیرن ایک اچھا اور ہمدرد انسان ہے۔ اس نے نہ

## دو چیزیں

☆ دو گھنٹہ اللہ کو بہت پسند ہیں ایک غصے کا دوسرا صبر کا۔  
☆ دو قطرے اللہ کو بہت پسند ہیں ایک جہاد میں خون  
کا قطرہ اور تنہائی میں خوفِ خدا سے نکلا آنسو۔

☆ دو قدم اللہ کو بہت پسند ہیں۔ فرض نماز کے لئے اٹھا  
اور بیمار کی عیادت کے لئے اٹھا قدم۔ (نسیم سیکرہ صدف)  
☆ محبت کرنے والے کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور  
ضرورت مند کو کسی چیز سے محبت نہیں ہوتی۔ (حکیم محمود)  
☆ دو چیزیں کسی کی شخصیت کی وضاحت کرتی ہیں  
(1) صبر۔ جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔  
(2) آپ کا رویہ۔ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔  
(نبیلہ نازش)

منہ سے صرف یہ سننا ہے کہ وہ میری بہن کا مجرم ہے کہ  
نہیں۔

راجا کھیرن کی کمر میں ایک نقاب پوش نے بڑی  
دور سے گونسا مارا جس سے وہ لڑکھڑا گیا۔ "بول جو سوال  
رنگا پوچھ رہا ہے ہاں یا ناں؟ نہیں بولتا تو میں تیری زندگی  
کی ڈور کاٹ دوں۔"

"ہاں، ہاں..... یہ سچ ہے۔" کھیرن نے لڑتی  
آواز میں کہا۔ "نہیں نے اور میرے دوستوں نے نورالحین  
کی نہ صرف عزت لوٹی تھی بلکہ اس کے بعد میں نے اپنے  
گناہ کا ثبوت چھپانے کے لئے اس کا گلا دبا کر مار دیا  
تھا۔"

اس اقرارِ جرم کے بعد وہ اورنگزیب سے اپنی  
زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ دوسرے کمرے سے راجا  
کھیرن کی جوان بیٹی سندری اپنی آنکھیں ملتی ہوئی آئی۔  
"کیا ہوا بھائی؟"

"سندری تم اندر جاؤ۔" راجا کھیرن کی بیوی نے  
گھبراہٹ ہوئی حالت میں اسے کہا۔

تیرے خاندان پر لاتعداد احسانات کئے ہیں۔ تیرا بیٹا مجھے  
بی نورالحین کے قتل کے جرم میں ملوث کر رہا ہے۔ راجا  
کھیرن نے اس کے باپ کو دھمکی دی کہ وہ اس کا ماہانہ  
وظیفہ بند کر دے گا بلکہ اسے اس کی دکان سے بھی بے  
دھل کر دے گا۔

اورنگزیب کے لاپتہ ہونے کے چند روز بعد  
رات کے تیسرے پہر راجا کھیرن کے ڈیرے کی پچھلی  
دیوار میں سے دیں نقاب پوش کودے۔ انہوں نے سب  
سے پہلے وہاں کے دو چوکیداروں کے ہتھیار چھینے اور پھر  
ان کو ہانپ دیا۔ اس کے بعد وہ نقاب پوش راجا کھیرن کی  
خوابگاہ میں گھسے۔ ان نقاب پوشوں نے راجا کھیرن اور  
اس کی بیٹی کو سوتی حالت میں بندھنوں کے بیٹ مار کر  
اٹھایا۔ دونوں بڑبڑا کر اٹھے۔ ان نقاب پوشوں میں سے  
ایک نے اپنا نقاب اٹھایا تو راجا کھیرن اسے دیکھ کر دھل  
گیا۔

"تم اورنگزیب، کیا چاہتے ہو؟" اس نے بڑبڑائی  
آواز میں کہا۔

اورنگزیب نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندھن کا  
بٹ اس کے سر پر مارتے ہوئے کہا۔ "اورنگزیب نہیں،  
رنگا..... اورنگزیب مر چکا ہے۔ میں تجھے جان سے  
مارنے آیا ہوں لیکن اگر تو میرے سامنے میری بہن کی  
عزت لوٹے اور اس کے قتل میں ملوث ہونے کا اقرار  
کرے تو میں تیری زندگی بخش دوں گا..... میرے سوال کا  
جلدی جواب دے کھیرن! ورنہ میں گولی کا سیسہ تیرے  
سینے میں اتار دوں گا۔"

"بھگوان کے واسطے میرے بچے کو نہ مارو۔" اس کی  
بیوی اورنگزیب کے قدموں پر گر کر اس کی زندگی کی بھیک  
مانگنے لگی۔

"میری تجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، تو درمیان میں  
نہ آ۔" اورنگزیب نے ڈپٹ کر کہا۔ "مجھے راجا کھیرن کے

رنگا ڈاکو کی شکل اختیار کرے۔ تقریباً دو گھنٹہ بعد راجا کھیرن پاؤں میں پٹی بندھا ہوا آپریشن سے فارغ ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ حالانکہ شدید تکلیف میں تھا۔

”راجا صاحب! آپ فکر نہ کریں“ تھانیدار دھرم نہل اس کے قریب گیا اور اُسے کہا۔ ”میں بہت جلد اورنگزیب اور آپ کی بیٹی کو آپ کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”تُو نے اب تک کیا کیا ہے؟“ راجا کھیرن نے اس پر غصہ سے چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ الفاظ سنا کر غفلت تسلیم نہ دے کہ میں اورنگزیب کے قبضے سے سندری کو چھڑاؤں گا۔ مجھے ہر حال میں اورنگزیب اور اپنی بیٹی چاہئے اور یاد رکھ اگر تُو اس سلسلہ میں ناکام ہوتا تو اسی کرب سے گزرے گا جس میں میں گزر رہا ہوں۔“

”راجا صاحب!“ تھانیدار دھرم نہل واپس کر بولا۔ ”میں ابھی اور اسی وقت اورنگزیب کی تلاش اور سندری کی بازیابی کے لئے چھاپہ مار نہیں تقبیل دیتا ہوں۔“

تھانیدار دھرم نہل نے اورنگزیب کی گرفتاری کے لئے فوری طور پر پولیس کی تین ٹیموں کی منظوری ہیڈ آفس سے لی۔ پولیس کی ان تینوں ٹیموں نے اورنگزیب کو گاؤں در گاؤں بد معاشوں کے ٹھکانوں اور جہاں جہاں انہیں اس کی موجودگی کا شک تھا وہاں اسے خوب تلاش کیا لیکن وہ ناکام رہے۔ اسی دوران راجا کھیرن نے بڑے پولیس ہیڈ کوارٹر لاہور میں اورنگزیب کے ہاتھوں اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ کر دی۔ اس کی اس رپورٹ پر اورنگزیب کو تلاش کرنے کے لئے مزید پولیس پارٹیاں تشکیل دی گئیں اور اس کی براہ راست نگرانی ایس پی سنگھ نے سنبھال لی لیکن اورنگزیب کا کچھ علم نہ ہو سکا۔ یہ خبر ہندوستان سے نکلنے والے بڑے اخبارات اور ریڈیو کی زینت بن گئی۔

ایک دن راجا کھیرن کے خاص آدمی مکیش کی

اورنگزیب نے سندری کو دیکھا تو اس نے اپنے نقاب پوش ساتھیوں کو کہا۔ ”اسے قابو کرو۔“

”تم جو چاہے مجھے سزا دے دو۔“ کھیرن نے التجا کی۔ ”لیکن میری لاڈلی بیٹی کو ہاتھ نہ لگنا۔“

”میں تجھے ایسی موت دوں گا جس سے تُو ایک دم نہیں بلکہ روز مرے گا۔ اسی طرح تیرے گا جس طرح میرا خاندان میری ماں میرا باپ اور میں تڑپا ہوں۔“ اورنگزیب نے قہر بھری آواز میں کہا۔ ”اٹھا لو اس کی لاڈلی بیٹی کو۔“

”نہیں، نہیں... اتنا غلم نہ کرو۔“ کھیرن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اورنگزیب نے ایک گولی راجا کھیرن کی ٹانگ میں ماری اور اس کی بیوی کو کہا کہ اگر تُو نے مزید روٹا دھونا کیا تو میں تیری سندری کو گولی مار دوں گا۔ لہذا تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی زبا نہیں بند رکھو۔ نقاب پوش ساتھیوں نے سندری کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اُسے کندھے پر اٹھا کر بجلی کی رفتار سے راجا کھیرن کے ڈیرے سے بھاگ گئے۔

راجا کھیرن کے ڈیرے میں نقاب پوش اورنگزیب اور ساتھیوں کے حملہ اور سندری کے اغوا کی خبر سن کر پورے گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ دانٹوں تلے اٹھیاں دبا کر حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ تھانیدار دھرم نہل کی قیادت میں پولیس کی بھاری نفری راجا کھیرن کے ڈیرے میں پہنچ گئی۔

ہسپتال میں راجا کھیرن کے پاؤں میں لگی گولی کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں داخل تھا جبکہ اس کی بیوی چنڈاں میں جمع دیہاتیوں اور پولیس کے سامنے وادیا کر رہی تھی۔ تھانیدار راجا کھیرن کی بیوی کو یہ تسلی دے رہا تھا کہ میں اس بے حیثیت چوہے کو کبھی شیر نہیں بنے دوں گا۔ اورنگزیب کی اتنی پسلی نہیں ہے کہ وہ کالا نقاب پہن کر

بار سرکاری خزانوں کے کانواؤں (کانٹینر) کو لوٹا تھا۔ حکومت وقت نے اس زمانہ میں رنگا ڈاکو کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر 20 ہزار روپے نقد اور 10 مہینہ سہری زمین بطور انعام کا اعلان کیا تھا۔

اس زمانے کے لوگ بتاتے ہیں کہ رنگا ڈاکو نے اپنی بہن نورالحین کی عزت لوٹنے والے ایک کردار سونو کے گھر میں گھس کر پہلے اس کی جوان بیوی کو قابو کرنے کے بعد اپنے ہی ڈاکوٹولہ کے ایک ڈاکو کے حوالہ کر دیا تھا جس نے پہلے سالو کے سامنے اس کی عزت لوٹی اور پھر اسے سالو کے حوالہ کرنے کے بعد اس کے دونوں بازوؤں کو گولیوں کا برست مار کر ساری زندگی کے لئے اپالچ کر دیا۔ سالو نے طیش میں آ کر ڈاکوؤں کے ہاتھوں عزت لوٹنے کے بعد اپنی بیوی کو گولی مار دی۔

رنگا ڈاکو کا کہنا تھا کہ اسے زمینداروں، گوروں سے نفرت ہے۔ یہ گورے ظالم زمینداروں کے جملے بولتے پر غریب عوام پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

اوپر راجا کھیرن کی بیٹی سندری کو رنگا ڈاکو کے ہاتھوں اغوا ہوئے اڑھائی سال گزر گئے۔ اس کی حالت نیم پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ متا کی ماری اس کی بیوی نے اس کا بیٹا حرام کیا ہوا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اس کی بیٹی کو ظالم رنگا ڈاکو کے ہاتھوں سے چھڑائے۔

گوروں نے رنگا ڈاکو کے سر کی قیمت 20 ہزار روپے سے بڑھا کر 50 ہزار روپے کر دی تھی جس میں سے 30 ہزار روپے راجا کھیرن نے حکومت کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک دن راجا کھیرن کے ڈیرے میں ایک چٹھی ملی جس میں سندری کی آنکھوں میں لکھا گیا تھا کہ میں نے مسلمان ہونے کے بعد اپنی مرضی سے ایوانگریز سے شادی کر لی ہے اور آپ کا ایک نواسہ بھی ہے۔ آخر میں اس نے لکھا کہ اورنگزیب ایک اچھا قدردان انسان

سر پریدہ لاش گاؤں کے قریب ایک ویرانے سے ملی۔ کمیشن ان مجرموں میں شامل تھا جنہوں نے نورالحین کی عزت لوٹی تھی اور مقتولہ کو سونے کے کٹوں میں پھینکنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہر زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ اورنگزیب نے اپنی بہن کا بدلہ لیا ہے اور وہ ہائی مجرموں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔

اورنگزیب کے ہاتھوں کمیشن کی ایسی بھیانک موت کو دیکھ کر پورے گاؤں میں سراسیمگی اور خوف کی لہر دوڑ گئی۔ پولیس نے اس کے باپ دلایت الدین کو اس خیال سے اپنی حراست میں لے لیا کہ اپنے باپ کی محبت کی خاطر اورنگزیب لامحالہ اپنی گرفتاری دے گا لیکن پولیس کی یہ سیکیم بھی کام ثابت ہوئی۔

پولیس کی ایسی جنس رپورٹ کے مطابق اورنگزیب نے زمیندار راجا کھیرن کے ہاتھوں اپنی بہن کی عزت لوٹنے اور قتل اور پولیس انتظامیہ کی جانب سے عدم تعاون، بے حسی سے بدلہ ہو کر راجا کھیرن اور اس کے ساتھیوں سے بذات خود انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور اس نے اردگرد کے وارداتیوں کے ساتھ مل کر اپنا ڈاکوؤں کا گروہ بنا لیا ہے اور اس کا ٹولہ ڈسکہ تاجاندھر کے درمیان کسی خفیہ مقام میں چھپا بیٹھا ہے۔ اب وہ اورنگزیب سے ”رنگا ڈاکو“ کے نام سے شہرت پا چکا تھا۔

دراصل اورنگزیب کو رنگا ڈاکو کا خطاب اس وقت کے میڈیا نے انگریزوں کی ایما پر دیا تھا۔ رنگا ڈاکو نے اپنی وارداتوں کا دائرہ پانی پت تک مزید بڑھا دیا تھا۔ اس نے ایک آزادی پسند تحریک باغیوں کے گروہ سے اپنے ٹولے کا الحاق کر لیا تھا۔ اس تحریک آزادی کی قیادت اہم سنگھ کا ٹولہ کرتا تھا۔ رنگا ڈاکو اور اہم سنگھ اعلیٰ انگریز اور اٹھارہ انفران کونشانہ بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے لاکھو (فیصل آباد) کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹومر، گودا نیجر میو (Mioy) کو گولی مار دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے کئی

نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔

اورنگزیب نے سندری کو کہا کہ تُو بچے سمیت پولیس کے پاس چلی جا۔ یہ کہتے مجھے کسی حالت میں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سندری نے اورنگزیب سے پوچھا کہ کیا تُو بھی ہمارے ساتھ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرے گا؟ اُس نے کہا کہ نہیں میں مرکز بھی ایسا نہیں کروں گا۔

سندری نے اس کے پاؤں پر گر کر کہا کہ تم میری خاطر نہیں تو اپنے بچے کی خاطر اپنی ضد چھوڑ کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔

اورنگزیب نے بھی اپنی جگہ ضد پکڑ لی کہ وہ مر جائے گا لیکن وہ خود اور اپنے ساتھیوں کو کبھی بھی پولیس کے حوالے نہیں کرے گا۔ سندری نے اورنگزیب کے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے قسم کھائی کہ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ ہی رہے گی۔ اورنگزیب نے اپنے ڈاکو ساتھیوں کو کہا کہ سندری اور بچے کو زبردستی پکڑ کر گھر کا دروازہ کھول کر پولیس کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے دونوں کو زبردستی گھسیٹ کر دروازہ سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن سندری اُن سے اپنا آپ چھڑا کر واپس اورنگزیب کے پاس آ گئی۔ اسی کشمکش میں ایس بی سنگھو نے اپنے پولیس کمانڈرز کو حکم دیا کہ وہ گھر کے گرد اپنا حصار تنگ کر دیں۔ ادھر اورنگزیب نے پولیس کی اپنے گھر کی جانب پیش قدمی کو بھانپا تو اس نے اپنے پانچوں ساتھیوں کو پوزیشن لے کر پولیس سے آخری وقت تک مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے اپنے چاروں اسلحہ بردار ساتھی چھت پر چڑھادیئے۔ جبکہ اُس نے خود اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مکان کے پچلے کمرے کی کھڑکیوں کی آڑ لے کر پولیس سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادھر ایس بی سنگھو سنگھ نے پولیس نفری کو حکم دیا کہ وہ پہلے مقابلہ کرنے والوں کی جانب بے ہوش کرنے والی گیس پھینکے (اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ سندری، بچے اور

ہے۔ وہ تم لوگوں کے ظلم کی بناء پر ایک شریف انسان انسان ہونے کے باوجود ڈاکو بنا ہے۔ مجھے آپ سے نفرت اور رنکا ڈاکو کی بیوی ہونے پر خفا ہے۔ ہمیں تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ (سندری)

رنکا ڈاکو کو کس طرح پکڑا اور سندری کو اُس کے چنگل سے کیسے چھڑایا جائے۔ انتظامیہ کے افسران اس مسئلہ پر سر جوڑ کر غور و خوض کرنے لگے۔

ایک دن پولیس ایشلی جنس کے کارندوں نے انتظامیہ کو یہ خفیہ رپورٹ دی کہ اورنگزیب نے اپنی بیوی سندری اور اور بچے کو محلہ افغاناں میں اپنے ایک جگری دوست موسیٰ خان کے مکان میں چھپا کر رکھا ہوا ہے اور وہ ہر جمعہ کو اپنا روپ بدل کر سندری سے ملنے آتا ہے۔

ایس بی سنگھو سنگھ بڑی احتیاط سے اورنگزیب کو قابو کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ضلع جہلم سے بھاری اضافی پولیس نفری کو بلوایا جن میں زیادہ تر ماہر نشانہ باز کمانڈوز تھے۔ وہ مکان کی نگرانی کرنے لگے۔ آخر چار دن بعد ان کی محنت رنگ لائی۔ رنکا ڈاکو بھیس بدل کر اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ محلہ افغاناں میں موسیٰ خان کے گھر میں اپنی بیوی سندری اور بچے سے ملنے آیا تو پولیس کی بھاری نفری نے اس مکان کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ایس بی سنگھو نے پولیس نفری کو یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ ہر ممکن طریقہ سے سندری کو زندہ بازیاب کروانا ہے نیز اورنگزیب کو کسی صورت میں بھاگنے نہیں دینا۔

رنکا اپنے پانچ ڈاکو ساتھیوں کے ساتھ سندری اور بچے کے کمرے میں موجود تھا۔ اسی دوران ایس بی سنگھو نے میگافون سے پیکر پر اُسے باور کرواتے ہوئے کہا کہ اب تم کھل طور پر پولیس کی بھاری نفری کے زبغے میں ہو۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ تم سندری، اپنے بچے اور اپنے ساتھیوں سمیت خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تم لوگوں کی زندگیوں کو ہرگز

انہیں پورے گھر میں اور نگزیب کی لاش کہیں بھی نہ ملی۔

وہ کہاں گیا؟ وہ اگر پولیس مقابلہ میں مارا گیا تو اس کی لاش کہاں گئی۔ پولیس پارٹی کو ان سوالات کے جوابات نہ مل سکے۔ تاہم رنگا ڈاکو کے شدید زخمی ساتھی نے دم توڑتے ہوئے یہ بیان دیا تھا کہ میرے ساتھ آخری وقت تک اور نگزیب چھت پر پولیس سے مقابلہ کر رہا تھا۔ میری کمر میں گولی لگ گئی تھی اس نے مجھے کہا تھا کہ نیچے کمرے میں چلے جاؤ۔ میں جب نیچے آیا تو سندری اپنے بچے کے ساتھ چھت پر پہنچی تھی۔ اس نے مایوسی سے کہا کہ ہمارے پاس گولیاں ختم ہو گئی ہیں تم اور نگزیب کو نیچے بلا لو کہ اب ہم اپنے آخری لمحوں میں اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ کر سکیں۔ میں نے آواز دے کر چھت پر چڑھے اور نگزیب کو کمرے میں نیچے بلایا تھا۔ اور نگزیب نے نیچے اتر کر سندری اور مجھے کہا کہ میں تمہیں اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کر دو۔ اس طریقہ سے تم تینوں کم از کم زندہ رہ سکو گے لیکن سندری اور میں نے اُسے وجہ دیا تھا کہ ہم سب ساتھ جنیں اور مریں گے۔ اس کے ساتھ ہمارے کانوں میں گریینڈ بمشے کی صرغ آواز سنائی دی۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ مجھے اس کے بعد کچھ بھی پتہ نہ چلا بعد میں وہ شدید زخمی ڈاکو بھی مر گیا۔

پولیس پارٹی نے اس مکان تو کیا اس علاقہ کا چپہ چپہ کنی بار کھنگالا لیکن انہیں کہیں بھی اس امر کا سراغ نہ مل سکا کہ حیرت انگیز اور پراسرار طور پر اور نگزیب کی لاش کہاں گئی۔ آیا جبکہ وہ مرا بھی تھا یا کسی طرح پولیس کا زخم توڑ کر بھاگا تھا۔

رنگا ڈاکو کا آج تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گیا اور نہ ہی وہ کبھی منظر عام پر آیا۔ اس کے بیٹے کو ایک ہندو بے اولاد جوڑے نے گود لے لیا تھا۔

www.paksociety.com

تمام ڈاکوؤں کو زندہ گرفتار کیا جائے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایس پی سنگھو سنگھ نے جب یہ محسوس کیا کہ اور نگزیب اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے شدید مزاحمت اور مقابلہ ہو رہا ہے اور بے ہوش کرنے والی گیس سے خلاف توقع کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اس نے اپنے نشانہ باز پولیس کمانڈرز کو حکم دیا کہ وہ سب سے پہلے چھت سے مقابلہ کرتے رنگا کے ڈاکو ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنائیں۔ پولیس نشانہ بازوں نے چھت پر چڑھے مقابلہ کرتے چاروں ڈاکوؤں کو جب مار دیا تو رنگا اور اس کے ساتھی نے خود چھت پر چڑھ کر مقابلہ کی ٹھانی۔ دونوں نے مکان کی چھت پر چڑھ کر آگے بڑھتی پولیس پر گولیاں برسانا شروع کر دیں جبکہ سندری ہستول بھر بھر کر دونوں کو چھت پر پہلائی کرتی رہی۔ دونوں جانب سے چھوٹے بڑے اسلحہ کا بے دریغ آوازاں استعمال کیا جا رہا تھا۔ ماحول میں بارود اور دھواں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

پولیس اور رنگا ڈاکو کی جانب سے مقابلہ تقریباً دو گھنٹہ جاری رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ سلسلہ ایک خوفناک دھماکے کی آواز سے یکدم رک گیا۔ یہ گریینڈ کا دھماکہ تھا۔

ایس پی سنگھو کا یہ خیال تھا کہ شاید مقابلہ کرتے بقیہ کینوں نے اسلحہ ختم ہونے کے بعد مشترکہ خودکشی کر لی ہے۔ ایس پی نے کچھ دیر مزاحمت کاروں کی جانب سے مزید متوقع مزاحمت کا انتظار کیا۔ اسے جب قوی یقین ہو گیا کہ مارے مارے جا چکے ہیں تو اس نے پولیس پارٹی کو مکان کے اندر جانے کا حکم دیا۔ پولیس جب مکان کے اندر گھسی تو کمرے کے اندر انہیں سندری کی لاش سے چٹا بے اوش بچہ اور قریب پڑا شدید زخمی حالت میں رنگا ڈاکو کا ساتھی ملا۔ جبکہ چھت پر اس کے چاروں ڈاکو ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں لیکن حیرت انگیز طور پر

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں  
رپورٹس اور مخطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

## دستِ شفاء

### ایک پراسرار مرض کا علاج!

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)

0321-7612717

ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (DH.Ms)

ممبر ہیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب

ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن

شعبہ طب و نفسیات

میرے اس عزیز کی تو اللہ بہت اچھی پرنکس مل رہی ہے اور بہت نامی گرامی ڈاکٹر ہیں اور خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے۔

ایک بار میں اچانک راولپنڈی ایک سرکاری کام کے سلسلے میں گیا تو ان کے ہاں قیام کیا۔ صبح کو کھیل آباد سے چل کر دوپہر ان کے ہاں پہنچا، سب لوگ مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں کھانا کھا کر سو گیا۔ شام کو جاگا تو سب اہل خانہ کو بہت سراہیمہ پایا۔ خاصاً کہ یہ کرید کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے بہنوئی کی والدہ صاحبہ کے دام میں ہاتھ میں بہت تکلیف ہے۔ سب ڈاکٹر صاحبان ان کے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور شہدائی کھینوں کی طرح ساتھ ہی واقع (دوائی خانہ کے چکر کاٹ رہے ہیں) کبھی ایک صاحب کوئی دوا کھلا رہے ہیں کبھی دوسرا

اس ماہ کا تیس دینے سے قبل ہم قارئین سے ایک گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ جب بھی ڈاکٹر صاحب سے منا ہو پہلے فون پر قائم ضرور لیں۔ اچانک آنے کی صورت میں پیدا ہونے والی پریشانی کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ دوا شروع رکے سے قبل ”فارم ہدایت“ بغور پڑھیں تاکہ ہر بات ان کے ذہن میں کلیئر ہو اور مجوزہ مدت تک علاج لازمی کریں تاکہ مرض کا جز سے خاتمہ ہو جائے۔

اب ہم اس ماہ کے تیس کی طرف آتے ہیں۔ یہ تیس تقریباً چار پانچ سال پرانا ہے۔ ہوا یوں کہ راولپنڈی میں ہمارے ایک نہایت قریبی عزیز ہیں ان کے والد صاحب آرمی میں کمیشن تھے اور وہ خود اور دیگر اہل خانہ (سب بھائی) بھی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں اور

کے لئے کسی نائی گرامی پیر صاحب نے دم کر کے دیا ہے کہ "ہاتھ پر باندھ دیں فوراً ٹھنڈ ہو جائے گی۔"

مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ پورے ہاتھ میں جگہ بازو میں درد کی شدید لہریں اور جلن سو جن نمایاں۔ میں نے اس بچے کو اتارا اور پھر ہاتھ صاف کر کے معائنہ کیا تو حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ دبا کر چیک کیا تو صاف پتا چلا کہ ساری پتھلی PUS سے بھری ہوئی ہے۔ اب میں نے انہیں بتایا کہ جب تک یہ PUS خارج نہیں کی جاتی نہ تو مریض کو سکون ہوگا اور نہ ہی کوئی دوا کام کرے گی۔

"یہ کیسے ہوگا؟" سب نے پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا کٹ لگا کر انکشن والی سرنج سے یہ مواد نکال دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا ورنہ مریض کی جان پر غبنی رہے گی اور یہ انکشن پھیل بھی سکتی ہے، بعد میں کوئی مناسب دوا دیں گے۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیوں بھی اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ میں تو ہمیشہ ایسے کیسوں میں ایسے ہی کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ تب انہوں نے مزید انکشاف کیا کہ جناب ایسا اس لئے نہیں کر سکتے کہ مریض کو شوگر ہے اور جلد پر کٹ گٹنے کی صورت میں خون بند نہ ہوگا اور مریض کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ جناب ایسا ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اور کوئی طریقہ نہیں جس سے یہ PUS نکالی جاسکے۔ میں نے نہایت حیرت سے ان کی طرف دیکھا جنہیں اس قانون قدرت کے بارے میں قصفا کوئی علم نہ تھا اور کئی لوگوں کو شاید اب بھی نہ ہو، وہ یہ کہ جب ایسا مگندہ مواد جسم میں کہیں پیدا ہوتا ہے تو قدرت باقی جسم کو اس کے خطرناک اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اس مادے

صاحب اپنی عقل کے مطابق دوسری دوا اور پھر تیسری صاحب تیسری دوا۔ مگر درد ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ ادھر وہ بچاری درد سے بے حال مگر وہ اللہ کے نیک بندے سب اپنی اپنی ڈاکٹری لٹرارے ہیں۔ مزید پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ معاملہ کئی دن سے چل رہا ہے مگر ہاوجود سب دوا میں اور تدبیریں (تعویذات، عملیات) کرنے کے معاملہ دن بہ دن گڑبڑ ہو رہا ہے اور کوئی ڈاکٹر ہار مانے کو تیار نہیں حالانکہ مریض کی جان پر غبنی ہوئی تھی مگر ان کو اپنے طریقہ علاج پر اتنا یقین تھا کہ جتنا مسلمانوں کو روز قیامت پر ہے۔

چونکہ میں بھی میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے رہانہ گیا اور آخر دل کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ جناب اگر مجھ ناچیز کو کسی قابل سمجھیں تو شامل راز کر لیں۔ شاید کوئی حل بتا سکوں۔ آخر کار نہ جانتے ہوئے بھی انہیں بولنا پڑا (کیونکہ ان کی) ناک نیچی ہوئی تھی کہ ایک "طیبر ہو میو پتھک" کے سامنے اعتراف شکست کیسے کریں۔ یاد رہے کہ میں شروع میں ایلو پتھک پریکٹس بھی کرتا تھا اور اسے غار نہیں سمجھتا بشرطیکہ وہ کسی بنیاد (Base) پر کی جائے اور Proper Dose دی جائے۔ (یہ معاملہ بعد میں نکھول گا)۔

بہر حال میں نے کہا کہ پہلے میں متاثرہ ہاتھ کا معائنہ کروں گا اور باقی معاملات بعد کے ہیں کہ کون سی دوا دینی ہے۔ جب میں نے ہاتھ دکھانے کو کہا تو انہوں نے اس کے اوپر لپٹا ہوا موٹا سا کپڑا کھولا۔ پھر ایک پٹی سی بندھی تھی دو کھولی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے اوپر گندھے ہوئے آنے کا ایک بڑا چوڑا کر کے رکھا ہوا ہے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دم کیا ہوا آٹا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "درد

”علم“ صرف کتابیں پڑھنے سے مکمل نہیں ہوتا، پرکینیکل بھی ضروری ہے اور آخری بات یہ کہ کبھی بھی کسی Base کے بغیر صحیح علاج نہیں ہو سکتا۔ تمام ڈاکٹر حضرات سے میری گزارش ہے کہ اچھی طرح تسلی کر کے مرض کی وجہ دریافت کریں یعنی Diagnosis کریں اور پھر علاج میں ہاتھ ڈالیں بے شک کوئی بھی طریقہ علاج ہو، اس کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آخری اور نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ تمام معالجین کبھی بھی مجوزہ Prescribed Dose سے زیادہ ہرگز نہ دیں۔ یہ تمام ادویات علیحدہ علیحدہ ہیں اور میں نہایت دکھ کے ساتھ ایک بات لکھتا ہوں کہ محض مریض پر دھاک بٹھانے کی خاطر بعض ڈاکٹر و حکیم حضرات مقرر کردہ خوراک Prescribed Dose سے بھی زیادہ دے دیتے ہیں جن کے نہایت خطرناک اثرات مریضوں پر نمودار ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ جلد آرام پر ختم نہ کریں اور معالج کو بتا دیں کہ مریض (خصوصاً نازک حراج لوگ) کو دوا زیادہ دیا تیز مقدار میں ہرگز نہ دیں بے شک دوا کے بعد آرام آئے ہمیں جلد ہی نہیں ورنہ مریض کے ساتھ بعد میں جو ہوگا اس کے بارے میں آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مریض جان سے بھی جا سکتا ہے، یا عمر بھر کے لئے معذور بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے ایسے کئی کیس دیکھے ہیں مگر آخرین ہے ان ڈاکٹر حضرات پر کہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے اور مریض کو بلا ضرورت ڈنٹ ڈرز دے دیتے ہیں حالانکہ ان کے قاربا کو پیا اور دیگر کتابوں میں کیسریہ بات درج ہے مگر پتا نہیں کیوں وہ اپنی غلط بات پر ہند ہیں۔ بس اللہ ہی ان کو ہدایت دے سکتا ہے۔ آپ بھی دعا کریں!

✽

اور جسم کی جلد کے درمیان ایک موٹی جمل پیدا کر دیتی ہے ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ گندہ مواد سارے جسم میں پھیل کر جلد ہی سارے خون کو زہر بنا کر دے اور انسان کی جلد موت واقع ہو جائے۔ اس لئے اس کٹ یا Minor Surgery سے قطعاً کوئی نقصان نہیں۔ مگر یہ بات بڑی مشکلوں سے ان کے دماغ میں آئی اور وہ چارو ناچار اس بات پر تیار ہوئے۔ آپ یقین کریں کہ تقریباً دوسرے 5cc کی ٹپس۔ پھر سپرٹ اور روٹی سے زخم کو صاف کر کے Pyodene کر پٹی باندھ دی گئی۔

جلد ہی مریض کے چہرے پر سکون آ گیا اور جس درد نے اسے کئی دن رات سے بے حال کیا ہوا تھا وہ فوراً ختم ہو گئی۔ وہ سب کتابی ڈاکٹر (بیار سے میں ہو میو پتھک حضرات کو کتابی / ملاقاتی ڈاکٹر کہتا ہوں) بے حد خیران تھے اور ممنون بھی کہ وہ درد جو سب ادویات دینے کے باوجود ختم نہ ہو رہی تھی اب غائب تھی (ابھی کوئی دوا میں نے نہیں دی تھی مگر درد کی وجہ ختم ہو گئی تھی) اب وہ دوا کے بارے میں پوچھنے لگے تو میں نے کہا کہ اب سب دوائیں بھی اثر کریں گی۔ اگرچہ کوی، ڈاکٹر اپنی ”انا“ کی وجہ سے مجھ سے دوائیں پوچھے گا تاہم عوام الناس کی بھلائی کی خاطر میں از خود دوائیں بھی لکھ دیتا ہوں۔ وہ یہ ہیں:

- (1) Apis Mel 6 1+1+1
  - (2) Heper SLF 6 1+1+1
  - (3) Pyrogenium 6 1+1+1
- (One week)

اگر دوائی 6 میں دستیاب نہ ہو تو 30 میں بھی دے سکتے ہیں۔

یہاں میں نے جو بات بتائی ہے اس کو تمام ڈاکٹر حضرات پھر پڑھیں اور آزمائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ



## دھوکے ہیں دھوکا پہ بازی گر کھلا

دھوکے باز دوسرے شخص پر اس قسم کا نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں اور اپنی باتوں سے ایسا چٹا کر دیتے ہیں اور دوسرے کو ایسا سحر زدہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی باتوں میں آ جاتا ہے

☆ ..... 0301-4845557 ..... حبیب اشرف صہوتی

پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ واقعات پیش کرتا ہوں جن کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں محتاط رہیں اور دھوکے بازوں سے بچیں۔

☆ آج سے تقریباً 40 سال قبل میں شام کو دفتر سے واپس آیا اور آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ کال بیل بجی۔ میں بادل ناخواستہ اٹھا۔ کمر کی میں سے نیچے دیکھا تو ایک شناسا چہرہ نظر آیا اور مجھے دیکھتے ہی نیچے آنے کو کہا۔ میں مجبوراً نیچے گیا۔ اس نے سلام و دعا کے بعد میرے بڑے بھائی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ یہاں سے شفٹ ہو کر ماڈل ٹاؤن چلے گئے ہیں۔ ان کا گھر کا نمبر اور فون نمبر اس کو بتا

دھوکے بازوں کے واقعات اور کہانیاں ہم ازل سے سنتے آ رہے ہیں اور اب تک یہ داستانیں رہیں گی۔ دھوکہ دینے والے اپنے فن میں اتنے ماہر ہوتے ہیں اور ایسے طریقے استعمال کرتے ہیں کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی ان کے دھوکے میں آ جاتا ہے۔ روزانہ اخبارات میں اور اپنے ملنے جلتے والوں میں اس قسم کے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ قتل حیران رہ جاتی ہے۔ دھوکے باز دوسرے شخص پر اس قسم کا نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں اور اپنی باتوں سے ایسا چٹا کر دیتے ہیں اور دوسرے کو ایسا سحر زدہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی باتوں میں آ جاتا ہے اور اس کے اشاروں

تکلیف دہ گزر رہا ہے۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ گھر کے باہر ایک بچل والے کی دکان تھی جس سے میں بچل وغیرہ لیتا تھا۔ میں نے اس آدمی کی پریشانی بتائی اور کہا کہ تمہارے پاس اگر 600 روپے ہیں تو دے دو میں تمہیں ابھی گھر جا کر دیتا ہوں۔ اس نے اپنے غلے میں سے تمام پیسے نکالے وہ تقریباً 450 روپے نکلے۔ میں نے وہ پیسے گن کر اس آدمی کو دے دیئے اور کہا کہ اس کو آپ اپنی ضرورت کے لئے پورا کریں اور مجھے واپس نہ کریں۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پیسے اپنی جیب میں ڈال لئے اور گھر کی طرف چل دیا۔

اس کے جاتے ہی محلے کے دو لڑکے جو نزدیک ہی کھڑے تھے، بھاگے ہوئے میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کو کس سلسلہ میں پیسے دیئے ہیں۔ میں نے ساری کہانی ان لڑکوں کو بتادی۔ اتفاق سے ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا کوئی کام میں نے کروا دیا تھا جو ناممکن تھا، وہ میرا بڑا مشکور رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ شخص بڑا دھوکہ باز ہے۔ مختلف جیلے بہانوں سے لوگوں سے پیسے ٹھگ لیتا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس سے پیسے واپس لے کر آؤں۔ اس سے قبل بھی میں نے اس کو اس قسم کی واردات کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ میں نے اس لڑکے کو اجازت دے دی۔ وہ بھاگا ہوا گیا اور اس کو گریبان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے آیا اور کہا کہ ان سے کس حساب میں پیسے لئے تھے۔ جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے اس کے ایک ٹھنڈے پٹھر مارا اور کہا کہ ان کے پیسے واپس کرو اور اس نے بغیر کسی جھجھک کے پیسے واپس کر دیئے۔ میں سوچتا رہا کہ انسان چند سو روپے حاصل کرنے کے لئے انسانیت سے کتنا گر جاتا ہے اور کتنا جھوٹ اور فریب کاری کرتا ہے۔ اب حقہ ار اور ناحق میں بھی تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

☆ میرے والد کے ایک دوست کی کتابوں کی

دیا کہ وہاں جا کر مل لیں۔ اس نے بتایا کہ آپ کے بڑے بھائی میرے بچپن کے دوست ہیں اور ہم ایک ساتھ اسکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ میں واپڈا میں ملازم ہوں۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں میرا گھر ہے۔ میں اس وقت سخت پریشانی میں ہوں اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ کے بھائی صاحب کے پاس ماڈل ٹاؤن جاسکوں میرا آٹھ سال کا بیٹا کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل تھا۔ مونیہ ہو گیا تھا، پیسہ پانی کی طرح بہا دیا لیکن اس کو شفا نہیں ہوئی اور آج اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ میت گھر میں پڑی ہوئی ہے کفن دہن کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں مجھے صرف 600 روپے چاہئیں جو پہلی تاریخ کو آپ کو مل جائیں گے۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ کی گھڑی اتار کر میرے ہاتھ میں پہنا دی اور سونے کی انگلی بھی اپنی انگلی سے اتار کر میرے ہاتھ میں پہنا دی اور کہا کہ یہ دونوں چیزیں آپ اپنے پاس رکھ لیں جب میں پیسے واپس کروں گا تو یہ دونوں چیزیں آپ سے لے لوں گا۔ یہ حرکات کرتے ہوئے اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ میں نے اس کو دونوں چیزیں واپس کر دیں اور کہا کہ میں آپ کی خدمت کروں گا۔ یہ دونوں چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ گھر کے نزدیک ایک نانڈی نے مجھ سے کچھ رقم ادھار لی ہوئی تھی میں اس آدمی کو لے کر نانڈی کے پاس گیا تاکہ اس کی مجبوری بتا کر رقم اس سے واپس لوں۔ جب نانڈی کی دکان پر گیا تو پتہ چلا کہ وہ دکان پر نہیں ہے۔ نہیں کام سے گیا ہوا ہے۔ ایک گھنٹے تک آئے گا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ ایک گھنٹے تک آ جائے میں اس سے رقم لے کر تمہیں دے دوں گا اور واپس نہیں لوں گا۔

وہ آدمی کہنے لگا کہ میں ایک گھنٹے کا انتظار نہیں کر سکتا، آپ مجھے کم ہی پیسے دے دیں۔ میرا ایک ایک لمحہ

## غزل

ریحان آفاق

روز اک مشغلہ تو رہتا ہے

اک نیا مسئلہ تو رہتا ہے

ہم ابھی ایک ہو نہیں پائے

درمیاں فاصلہ تو رہتا ہے

تجھ کو دل نے بھلا دیا لیکن

دل میں اک آبلہ تو رہتا ہے

راستے ختم تو نہیں ہوتے

اک نیا راستہ تو رہتا ہے

طے جو کرتا ہے عشق کی منزل

عشق میں بھلا تو رہتا ہے

دکان مسلم مسجد لوہاری دروازہ کے نیچے واقع تھی۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک روز صبح ایک نئی گاڑی شاندار قسم کی ان کی دکان کے آگے آ کر کھڑی ہوئی۔ شولر نے دروازہ کھولا اور ایک بڑے معزز آدمی ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے میری دکان میں آئے اور بڑے پرتھاک طریقے سے سلام کیا۔ ان کی شخصیت اتنی شاندار اور پُر عجب تھی کہ میں ان کے استقبال میں کھڑا ہو گیا اور کہا کہ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑی معیاری اور اچھی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ میں کچھ کتابیں لینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ کتابیں سامنے لگی ہوئی ہیں پسند فرمائیں۔ انہوں نے تین چار ہزار روپے کی کتابیں پسند کیں اور کہا کہ انہیں پیک کروادیں۔ میں نے پیک کروادیں۔ جب کتابیں پیک ہو گئیں تو انہوں نے ڈرائیور کو آواز دی اور کہا کہ یہ پیک گاڑی میں رکھو۔

ڈرائیور پیک اٹھا کر لے گیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ ملتا ہے۔ میں نے رقم بتائی۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ کیا آپ کچھ رعایت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے مردہ کہا کہ آپ وہ پیسے ہی لے جائیے۔ کہنے لگا کہ بہت بہت شکریہ اور بغیر رقم دیئے چلا۔ جب وہ چلا گیا تو جب مجھے ہوش آیا کہ وہ پیسے بھی دے کر نہیں گیا۔

بھلا میرے ایک دوست بہت تعلیم یافتہ اور محتاط آدمی ہیں لیکن ایک روز وہ دھوکہ بازوں کے زخموں میں آ گئے اور بہت سمجھدار ہونے کے باوجود کئی ہزار روپوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔

بقول ان کے ایک روز انہوں نے بنگ سے ایک لاکھ روپے نکالے۔ پیسوں کو احتیاط سے جیب میں رکھا اور کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی تھی، اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ابھی گاڑی سٹارٹ کرنے والے تھے کہ ان کو محسوس ہوا کہ

کوئی شخص پیچھے سے ان کی گاڑی کے ساتھ کھرایا ہے اور گاڑی کے پیچھے ٹکس گیا ہے۔ وہ فوری طور پر گاڑی سے اترے۔ دیکھا کہ ایک چہرہ سولہ سال کا لڑکا گاڑی کے پیچھے کھسا ہوا ہے اور پانچ پانچ سو اور ہزار روپے کے نوٹ زمین سے اٹھا کر چن رہا ہے۔ میں نے اسے آواز دی کہ گاڑی کے پیچھے سے نکل آیا اور کہا کہ یہ پیسے گاڑی کے پیچھے گرے ہوئے تھے، آپ کے تو نہیں ہیں، چیک کر لیں؟ میں نے کہا کہ میرے نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر وہ نوٹ گنتا رہا اور ایک طرف کو بھاگ گیا۔ میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔ اسٹے میں ایک بوڑھا آدمی روٹے ہوئے میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں سامنے بنک سے پیسے نکلوا کر لایا تھا اور جہاں آپ کی گاڑی کھڑی ہے وہاں سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ جب یہاں سواری نہیں ملی تو میں آگے چلا گیا، شاید آگے سے کوئی سواری مل جائے۔ جب سواری مل گئی اور میں اس میں بیٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میری جیب میں رقم موجود نہیں ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں سواری میں نہیں بیٹھا اور یہاں تلاش کرنے آ گیا ہوں۔ پچاس ہزار روپے مالیت کے نوٹ تھے اور میں نے اپنی بچی کی شادی کے لئے نکلوائے تھے۔ میں نے بتایا کہ ایک لڑکے نے میری گاڑی کے پیچھے سے نوٹ اٹھائے ہیں اور وہ سامنے کی طرف بھاگا ہے۔ وہ بوڑھا کہنے لگا کہ خدا کے لئے میری مدد کریں میں آپ کا احسان مند ہوں گا۔

میں نے بوڑھے کو گاڑی میں بٹھالیا اور اس کو تسلیاں دیتا رہا اور وہ بوڑھا مجھے بتاتا رہا کہ ادھر چلیں ادھر چلیں۔ میں بڑا حیران تھا کہ اس کو کس طرح پتہ ہے کہ وہ لڑکا کہاں ہوگا؟ تھوڑی دیر جانے کے بعد ہم نے لڑکے کو تلاش کر لیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔ اس لڑکے کے پاس تمہارے پیسے ہیں۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ تم نے جو پیسے میری گاڑی کے پیچھے سے اٹھائے تھے وہ ان بزرگ ہیں۔ اس لڑکے نے نشانی پوچھی کہ 500 روپے کے کتنے نوٹ ہیں، 1000 روپے کے کتنے نوٹ ہیں؟ اس بوڑھے نے تعداد بتائی اور کہا کہ وہ سب نوٹ ملے ہیں۔ اس لڑکے نے گن کر نوٹ اس بزرگ کو دے دیے۔ اب اس بزرگ نے لڑکے سے کہا کہ ان پیسوں کے ساتھ سونے کی انگلی بھی تھی وہ بھی لڑکے نے کہا کہ میری تلاش لے لو جو پیسے میں نے اٹھائے تھے تمہیں دے دیے۔ بوڑھا آدمی زور زور سے بولنا شروع ہو گیا اس کی آواز سن کر دو تین لوگ اور بھی آ گئے اور لڑکے سے کہا کہ تم تلاش دو۔

لڑکے نے تلاش دے دی۔ اب وہ بوڑھا آدمی کہنے لگا کہ یہ صاحب جو مجھے لے کر آئے ہیں ان کی بھی تلاش لو۔ یہ لڑکے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑا اطمینان آیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا کہ تم شرم کرو، میں نے تمہاری مدد کی، گاڑی میں بٹھایا اور اس لڑکے تک پہنچایا۔ تم میرے احسان مند اور شکر گزار کیا ہو گے تم مجھ پر بھی الزام لگا رہے ہو۔ میرا یہ اس لڑکے سے تعلق ہے اور نہ تم سے۔ میں جا رہا ہوں۔ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ وہ بوڑھا مسلسل یہی کہے جا رہا تھا کہ ان کی بھی تلاش لو۔ دو تین آدمی وہاں کھڑے تھے وہ بھی بوڑھے کی تائید کرنے لگے کہ آپ بھی اپنی تلاش دے دیں۔ بوڑھے آدمی کی قسم ہو جائے گی۔ انہوں نے زبردستی میری تلاش لینی شروع کر دی۔ میری جیب سے ایک ناکھ روپے نکالے اور خدا جانے کس طریقے سے 50 ہزار روپے اس میں نکالے اور بتایا پیسے میری جیب میں ڈال دیے اور کہا کہ آپ کی ہم نے تلاش لے لی ہے۔ انگلی نہیں ہے، آپ جاسکتے ہیں۔ جب گھر آ کر رقم گنتی تو 50 ہزار روپے قابل تھے۔ خدا جانے انہوں نے کس طریقے سے پیسے نکالے

میں نے بوڑھے کو گاڑی میں بٹھالیا اور اس کو تسلیاں دیتا رہا اور وہ بوڑھا مجھے بتاتا رہا کہ ادھر چلیں ادھر چلیں۔ میں بڑا حیران تھا کہ اس کو کس طرح پتہ ہے کہ وہ لڑکا کہاں ہوگا؟ تھوڑی دیر جانے کے بعد ہم نے لڑکے کو تلاش کر لیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔ اس لڑکے کے پاس تمہارے پیسے ہیں۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ تم نے جو پیسے میری گاڑی کے پیچھے سے اٹھائے تھے وہ ان بزرگ ہیں۔ اس لڑکے نے نشانی پوچھی کہ 500 روپے کے کتنے نوٹ ہیں، 1000 روپے کے کتنے نوٹ ہیں؟ اس بوڑھے نے تعداد بتائی اور کہا کہ وہ سب نوٹ ملے ہیں۔ اس بزرگ نے لڑکے سے کہا کہ ان پیسوں کے ساتھ سونے کی انگلی بھی تھی وہ بھی لڑکے نے کہا کہ میری تلاش لے لو جو پیسے میں نے اٹھائے تھے تمہیں دے دیے۔ بوڑھا آدمی زور زور سے بولنا شروع ہو گیا اس کی آواز سن کر دو تین لوگ اور بھی آ گئے اور لڑکے سے کہا کہ تم تلاش دو۔

لڑکے نے تلاش دے دی۔ اب وہ بوڑھا آدمی کہنے لگا کہ یہ صاحب جو مجھے لے کر آئے ہیں ان کی بھی تلاش لو۔ یہ لڑکے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑا اطمینان آیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا کہ تم شرم کرو، میں نے تمہاری مدد کی، گاڑی میں بٹھایا اور اس لڑکے تک پہنچایا۔ تم میرے احسان مند اور شکر گزار کیا ہو گے تم مجھ پر بھی الزام لگا رہے ہو۔ میرا یہ اس لڑکے سے تعلق ہے اور نہ تم سے۔ میں جا رہا ہوں۔ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ وہ بوڑھا مسلسل یہی کہے جا رہا تھا کہ ان کی بھی تلاش لو۔ دو تین آدمی وہاں کھڑے تھے وہ بھی بوڑھے کی تائید کرنے لگے کہ آپ بھی اپنی تلاش دے دیں۔ بوڑھے آدمی کی قسم ہو جائے گی۔ انہوں نے زبردستی میری تلاش لینی شروع کر دی۔ میری جیب سے ایک ناکھ روپے نکالے اور خدا جانے کس طریقے سے 50 ہزار روپے اس میں نکالے اور بتایا پیسے میری جیب میں ڈال دیے اور کہا کہ آپ کی ہم نے تلاش لے لی ہے۔ انگلی نہیں ہے، آپ جاسکتے ہیں۔ جب گھر آ کر رقم گنتی تو 50 ہزار روپے قابل تھے۔ خدا جانے انہوں نے کس طریقے سے پیسے نکالے

کہ مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور یہ نکل میرے گلے پڑ گئی اور نکل مجھے مہنگی پڑی۔

☆ میرے ایک دوست اپنی دکان سے اٹھ کر جمعہ کی نماز کو جا رہے تھے، جیب میں کچھ رقم بھی تھی۔ ابھی مسجد سے کچھ دور ہی تھے کہ ایک لڑکا رنگ کی بالٹی لے کر سامنے سے آ رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو وہ بڑی تیزی سے میرے دوست کے ساتھ ٹکرایا اور رنگ ان کے کپڑوں پر گر گیا اور وہ بھاگ کر ایک گلی میں چلا گیا۔ اتنے میں دو ہاریشن لوگ بھاگے ہوئے میرے دوست کے پاس آئے اور انسوس کا اظہار کیا۔ لڑکے کو بڑا بھلا کہتے رہے اور کپڑے دھلانے کے بہانے مسجد میں لے گئے۔ قمیص اتروائی، رنگ کو صاف کیا اور قمیص پہنا دی اور فوری طور پر وہاں سے غائب ہو گئے۔ جب میرے دوست نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو رقم غائب تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ پورا ایک گینگ ہے۔

☆ چند ماہ قبل میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک دکان میں بیٹھا ہوا تھا اور گپ شپ کا پروگرام چل رہا تھا کہ اتنے میں ایک ضعیف آدمی جو انتہائی کمزور تھا اور اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا، ہمارے پاس آ گیا اور درخواست کی کہ وہ فقیر نہیں اور نہ کچھ مانگنے آیا ہے بلکہ سخت بیمار ہے اور چلنے میں بھی وقت ہو رہی ہے۔ سخت بخار ہے، مجھے خالی دوائی دلو دیں۔ اتفاق سے چند دکانیں چھوڑ کر ایک ڈاکٹر کی دکان تھی میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس کے پاس چار پانچ مرینس بیٹھے تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر کے کپاؤ ٹھر سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے کہیں کہ اسے اچھی طرح چیک کریں اور اس کو دوائی دیں۔ جتنے پیسے ہوں گے میں دے دوں گا۔ کپاؤ ٹھر نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ بے فکر ہو کر جائیں میں نے بزرگ آدمی سے کہا کہ اگر ڈاکٹر صاحب کوئی دوائی لکھ کر دیں تو

میرے پاس لے کر نکل آ جائیں میں دوائیاں دلوادوں گا اور اگر اپنے پاس سے دیں تب بھی مجھے بتا دینا۔ کچھ دیر بعد میں بزرگ ڈاکٹر کے پاس سے آیا اور ایک نسخہ دے دیا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دیا ہے۔ میں ایک کیسٹ کی دکان پر گیا اور کہا کہ ایک ہفتہ کی دوائیاں دے دو۔ وہ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے ایک ماہ کی دوائیاں لے کر دو۔ میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ بابا جی آپ ایک ہفتہ دوائی استعمال کریں اگر اس سے آرام نہ آیا تو یہ دوائیاں بے کار جائیں گی اور اگر ان دوائیوں سے آرام آ گیا تو ڈاکٹر صاحب کو آ کر بتا دیں وہ نسخہ میں مزید تبدیلی کر کے دوائیاں دے دیں گے اور میں اس دکان پر روز آ کر بیٹھتا ہوں فکر نہ کریں۔ اگر میں نہ بھی ہوا تو میں نے ڈاکٹر کے کپاؤ ٹھر سے کہہ دیا ہے کہ یہ بزرگ جب بھی آئیں ان کا ڈاکٹر صاحب سے چیک اپ کروائیں اور کیسٹ کو بھی کہہ دیتا ہوں کہ جب بھی آپ آئیں ان کو دوائی دے دیں لیکن وہ بزرگ مسلسل یہی کہتا رہا کہ مجھے ایک ماہ کی دوائیاں لے دیں۔ میں نے 15 روز کی دوائیاں لے دیں تو وہ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ رکشے کا کرایہ بھی دے دیں۔ میں نے اُسے کرایہ بھی دے دیا بلکہ اس سے بھی زیادہ پیسے دے دیئے تاکہ بزرگ کو پریشانی نہ ہو اور دکان سے واپس آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بزرگ دکان سے نکل آیا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ دیکھوں کہ یہ بزرگ رکشہ میں بیٹھتا ہے یا نہیں۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ راستے میں کئی رکشے آئے وہ کسی میں نہیں بیٹھا۔ اب اس کی چال میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا وہ ایک کیسٹ کی دکان میں داخل ہو گیا۔ میں بھی جلدی سے اُس کے پیچھے دکان میں داخل ہو گیا۔ دکان میں گاؤں کا رش تھا۔ جب رش کم ہوا تو بزرگ میزین کے

کے پیسے دے جاتا ہوں۔ جتنے استعمال ہوں گے ان کے پیسے کاٹ لیجئے گا باقی رول آپ رکھ لیجئے گا اور اس کے پیسے واپس کر دیجئے گا۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے وہ چند روز بعد آئے کہا کہ صرف 2 رول استعمال ہوئے ہیں۔ آٹھ باقی آگئے ہیں ان کے پیسے دے دیں۔ میں نے رول چیک کئے مکمل طور پر بند تھے۔ میں نے دو کے پیسے کاٹ لئے اور آٹھ رول کے پیسے واپس کر دیئے۔ کچھ دنوں بعد ایک صاحب آئے اور ایک فلم رول لے گئے۔ دوسرے روز وہ ڈکان پر آئے، سخت ناراض تھے۔ کہنے لگے کہ فکشن شروع ہونے سے پہلے میں نے فلم رول کھولا تو اس میں سے یہ گنڈیری کے چھٹکے نکل آئے۔ آپ مذاق کرتے ہیں؟ میں کافی دیر سے یہ واپس کرنے آیا ہوں۔

اس نے مجھ سے بہت بحث کی اور کہا کہ میں آپ کا پرانا گاہک ہوں ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے دوسرا رول دیا۔ اس نے میرے سامنے رول کھولا تو اس میں سے بھی گنڈیری کے چھٹکے نکلے۔ وہ گاہک کہنے لگا کہ اب آپ خود انصاف کر لیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ جو صاحب آٹھ فلم رول واپس کر گئے تھے یہ ساری کارستانی اُن کی ہے۔ صبر کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

اسی طرح ان صاحب کی ڈکان میں ایک بڑے اپ ٹوڈیٹ صاحب آئے۔ انہوں نے کئی ہزار کی شاپنگ کی، جب پیسے دینے لگے تو کہنے لگے کہ میں ہیر سے آیا ہوں، میرے پاس ڈالر ہیں، آپ لے لیں۔ میں نے کہا کہ ہمیں پاکستانی کرنسی دیں اسے ہم کہاں تبدیل کراتے رہیں گے۔ انہوں نے کہا مجھے یہ سامان بہت ضروری چاہئے میں نوٹل رقم پر 1500 روپے زیادہ دیتا ہوں میرے دوست لالچ میں آگئے۔ ڈالر وصول کر لئے اور سامان دے دیا۔ دوسرے روز ڈالر مارکیٹ میں بھیجے تو پتہ چلا کہ ڈالر جعلی تھے، ان کو کئی ہزار کا نقصان پہنچ گیا۔

پاس گیا اور کہا کہ یہ دوائیاں میں نے کر گیا تھا، اب یہ دوائیاں بچ گئی ہیں۔ اس کو واپس کر لیں اور پیسے مجھے دے دیں۔ جب بزرگ نے یہ الفاظ سنا تو کہے اور لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑا یا تو میں نے فوری طور پر لفافہ سنا میں سے لے لیا اور بزرگ سے کہا کہ یہ دوائیاں اس وجہ سے تم ایک ماہ کی لے رہے تھے کہ ان کو بچ کر پیسے اپنی جیب میں ڈالو۔ تمہیں اپنی عمر دیکھنی چاہئے اور جو تم کام کر رہے وہ دیکھو میں نے تو تم کو ترس کھا کر دوائیاں دلوائیں اور رکشے کے پیسے دیئے۔ تم دن میں یہ ڈرامہ کر کے کتنے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو گے۔ دکان میں جو دوسرے لوگ کھڑے ہوئے تھے انہوں نے بھی بزرگ کو شرمندہ کیا۔

اس کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور اُن سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کون سی بیماریاں دیکھیں اور اتنی دوائیاں لکھ دیں اور اس کو کیا بیماری تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ جب وہ آیا تو بہت کمزوری کی حالت میں چل رہا تھا تو میں نے اس سے بیماری پوچھی تو اس نے بتایا کہ اسے سانس اور دم کی بیماری ہے اور جیب سے ایک نسخہ نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ میں یہ دوائیاں کھاتا ہوں تو ٹھیک رہتا ہوں، مجھے یہ دوائیاں لکھ دیں لیکن جب اس کا تھیںلی معائنہ کیا تو اس میں اس قسم کی بیماری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے کہنے پر اور مجبور کرنے پر میں نے دوائیاں لکھ دیں۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو صحیح صورت حال بتائی تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ اب کس کو کس طرح سمجھیں کہ یہ حقدار ہے، اچھے اور بُرے آدمی میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

میرے ایک دوست کا ایک بڑا ستور ہے جہاں مختلف قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک روز ایک صاحب بظاہر بہت شریف نظر آتے تھے، آئے اور کہا کہ مجھے ایک شادی کے فکشن کے لئے دس فلم رول چاہئیں۔ میں ان

دن سبک رفتاری سے گزرتے گئے۔ کتے کی خوفناک آوازیں، اس کے بے  
رحمانہ شکار جاری رہے۔ موسلا دھار بارشیں، آندھیاں، جھکڑ اور طوفان اس  
حویلی کی خاموش راتوں کو نہ اسرار مٹاتے رہے لیکن جنگلانہ بن سا۔



جنگل

وقار احمد ملک، میانوالی

رات کے وقت اس گلی کے حوطہ شدہ سکوت کے  
مقابلہ میں گورستان کی خاموشی بھی شکست کھا جائے گی۔ وہ  
راتیں جب اس گلی میں تیز بارشوں کا موسم شروع ہوتا ہے  
اس گلی کو اور بھی بڑا سرشار بنا دیتی ہیں۔ دسمبر کی غیبت  
راتوں کے جھکڑ آسمان کے درختوں کے مرید، زرد سوکے  
چوں کو ایک دوسرے کے پیچھے لگائے پھرتے ہیں۔  
اس گلی میں تھوڑا آگے جائیں تو بائیں طرف ایک  
رائی طرز کا حویلی نما مکان ہے۔ دوسرے مکانات کے  
برعکس اس حویلی کے اندر پرانے آسمان کے درختوں کے ساتھ  
ایک بوڑھا بوڑھا کا درخت بھی موجود ہے جس کے چار پانچ  
فٹ محیطہ تنے میں بے شمار گہریوں نے رہائش اختیار کی  
ہوئی ہے۔ درختوں کے اس قدیم تنے سے ہٹ کر دو ٹھن  
برائے کردوں، ایک غلام گردش، باروچی خانہ اور ایک سنور  
پر مشتمل قدیم عمارت ہے۔  
قیام پاکستان کے بعد میرٹھ سے ہجرت کر کے آنے  
والے لوہا ہوتا جوڑے نے جب یہ حویلی الاٹ کرائی تھی تو

شہر کا یہ قدیم حصہ آہستہ آہستہ سکون ہوتا جا  
رہا ہے۔ لوگوں نے اس خاموش علاقہ کے  
بڑے بڑے کشادہ مہنوں کو چھوڑ کر نئے شہر کی جدید  
کالونیوں کے چند منزلوں کے متحش ڈریوں میں خوشی خوشی  
قید قبول کر لی ہے۔ زمانہ جدید کے شور و غل اور ترقیوں  
کے ٹھکنے سے شہر کا یہ پرانا حصہ ابھی آزاد ہے۔ اس پرانے  
علاقے کی ایک گلی جو اینٹوں سے بنائی گئی تھی دن کے  
وقت بھی شام کا سماں پیدا کیے رہتی ہے۔ اس تاریکی کا  
سبب اس گلی کی دونوں جانب مظلوموں کے زمانوں کے تعمیر  
شدہ پرانے مکانات اور حویلیوں کی اونچی اونچی دیواریں  
اور ان دیواروں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے بوڑھے آسمان  
کے درخت ہیں۔ اس گلی کے سکون کا ایک سبب یہ بھی ہے  
کہ تنگ ہونے کی وجہ سے ان میں موٹروں اور گاڑیوں کا  
گزر نہیں ہوتا۔ اس گلی کے کمین زیادہ تر اوجیز عمر اور  
بزرگ لوگ ہیں جن کی اولادوں نے اس گلی کو چھوڑ کر  
نئے شہر میں رہائش اختیار کر لی ہے۔

اُس وقت بھی شاید اس کی حالت زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ قاضی قمر الدین نے، جو پہلے ایک نوب کا شفی مقرر ہوا بعد میں بلدیاتی دفتر میں شیو گرانفر کی ملازمت حاصل کر لی۔ قاضی صاحب اپنی متانت، شرافت اور پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے گلی میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قاضی صاحب کی زوجہ شیریں بی بی کے نام سے معروف تھیں۔ پورے محلے کی خواتین سے اُن کی سلام دعا تھی۔ گوان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن اسے انداز اور ہلکے پھلکے ہٹاؤ سنگھار کی وجہ سے ایک نوجوان لڑکی کے مشابہ تھیں۔ شیریں بی بی دراز قد، چلتی ہوئی سفید رنگت اور موتیوں جیسے دانتوں سے چھوٹے والی مسکراہٹ کے سبب اس گلی کی حسین خواتین میں شمار کی جاسکتی تھیں۔

میاں بیوی کے درمیان محبت بھی لاثانی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں ادبی ذوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جوانی میں راتوں کا ایک طویل حصہ غالب اور میر کے دانشورانہ اور رد مالوی اشعار کی نظر ہو جاتا۔ منٹو کا جو بھی نیا افسانہ شائع ہوتا دونوں میاں بیوی کئی کئی گھنٹے اس پر بحث کرتے۔ تقسیم موضوع پر لکھے ہوئے منٹو کے افسانہ "نوبہ فیک سنگھ" پر تو قاضی صاحب اور شیریں بی بی کی گفتگو اور تبصرے کئی دن جاری رہے۔ کئی مہینوں تک مذاق ہی مذاق میں وہ اس افسانے کے پاگل ہیرہ کی مشہور گالی سے ایک دوسرے کو نوازتے رہے۔

اولاد دینہ کی خواہش کی تکمیل نے اس وسیع مکان کے مختصر گہرائی کی خوشیوں میں توسیع قزح کے رنگ بکھیر دیے۔ ننھے ثاقب کی کلکاریوں نے خاموش حویلی کو گویائی عطا کر دی۔ قاضی صاحب کی محدود تنخواہ اس مختصر کتبے کی خوشیوں میں حائل نہ ہو سکی۔ شاید اس وجہ سے شیریں بی بی اور قاضی صاحب کی فیر مادی دلچسپیاں تھیں۔ وہ قیمتی ملبوسات، زیور یا سامان آرائش و زیبائش کا لطف کسی اچھے شعراء افسانے یا کسی بھول بھری یاد کو کرید کر حاصل کر لیتے۔ زندگی انتہائی دلچسپ ریلے کے سفر کی طرح گزرتی گئی۔ ادھر ثاقب نے فہم اور ادراک کی ابتدائی

سیڑھی پر قدم رکھا، ادھر محبت کرنے والے جوڑے کی آزادی ختم ہونے لگی۔ میاں بیوی کی ماہی محبت واحد طے کی محبت سے باری لے گئی۔ جیسے ہی ثاقب کی آنکھیں بند ہوئیں شیریں بی بی جھٹ پٹ اُسے اٹھا کر ساتھ والے لڑیکہ بیٹیوں والے کمرے میں پہلے سے تیار شدہ بستر پر ڈال آتی لیکن اکثر ثاقب تھوڑی دیر بعد روتا ہوا دلہن آجاتا اور گاڑی کے دو پہیوں کو پھر سے جدا کر دیتا۔ ثاقب کی عمر چھ سات سال ہو چکی تھی اور اس نے سکول جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ شیریں بی بی نے ایک دن غلام گردش کے دوسری طرف واقع ستور کی صفائی شروع کر دی۔ کمرے کو ان تصویروں، رنگوں اور مناظر سے حیرن کر دیا جو ایک کسین بچے کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ثاقب کے اندر بہادری کے مردانہ جوہر بیدار کرنے کے لیے اُسے نازن کی کہانیاں بھی سناتا شروع کر دیں۔ ثاقب کو نیا کمرہ بہت پسند تھا جس میں اُس کے لیے نئے نئے کھلونے بھی لاکر رکھ دیئے گئے تھے۔ چابی والا کتا تو اُس کو بہت پسند آیا تھا۔ جیسے ہی اُس کھلونا کتے کو چابی دی جاتی وہ اپنی چھوٹی سی دم ہلا کر بھوں بھوں کرنا شروع کر دیتا۔ کتے کے علاوہ بھالو، بندر، طوطے اور کھوے بھی اُس کے لیے دلچسپی کا باعث تھے۔ چند دنوں بعد جب ثاقب کو یہ اطلاع دی گئی کہ اب اُس کو شب بھری بھی اس تھے کمرے میں کرنی پڑے گی تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ثاقب نے جب رات کو اکیلے کمرے میں سونے سے انکار کر دیا تو پہلی مرتبہ قاضی صاحب نے اُس کو زانے کا تھپڑ رسید کیا۔ سُرخ پھولے ہوئے رخسار اور پھول گئے اور ان کا رنگ گہرا گلابی ہو گیا۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی فوراً بہ نکل۔ یہ رمضان المبارک کی انتہائی رات کا واقعہ ہے جسے "چند رات" بھی کہا جاتا ہے۔

چند ماہیں ثاقب نے جاگ کر گزاریں لیکن اب آہستہ آہستہ حویلی کی پرانی کین "تھائی" کا عادی ہوتا

## لطیفہ

لوکی اپنے ابو سے، وہ سامنے والوں کا لڑکا مجھے بہت  
 ٹھک کرتا ہے۔  
 ابو میں اسے پولیس کے حوالے کرتا ہوں تاکہ اسے  
 سخت سزا ملے۔  
 لوکی: نہیں ابو، میں تو اسے اس سے بھی سخت سزا دینا  
 چاہتی ہوں۔  
 ابو: کیسے؟  
 لوکی: شرماتے ہوئے۔ ابو آپ میری اس سے شادی کر  
 دیں!  
 ابو: ادائیگی انتظام لینے میں بالکل اپنی ماں پہ گئی ہو۔  
 (اشفاق شاہین، کراچی)

اس کا ایک کان کاٹ کر بلوگڑے کے کان کے ساتھ جوڑ  
 کر نچ میں ڈال کر دیا۔

دن سب رقتاری سے گزرتے گئے۔ کتے کی  
 خوفناک آوازیں، اس کے بے رحمانہ شکار جاری رہے۔  
 موسلا دھار بارشیں، آندھ جیاں، جھکڑ اور طوفان اس حویلی کی  
 خاموش راتوں کو نہ بھرا رہتے رہے۔ لیکن جنگلات نہ بن سکا۔  
 پاکستان بنے تین دہائیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ میاں  
 بیوی کے بالوں میں چاندنی آترنا شروع ہو گئی۔ ثاقب کے  
 چہرے پر بھی سبزہ نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ یہ اس خاموش  
 حویلی کے تمام مکینوں کی عمروں کا عبوری دور تھا۔ دو تین  
 سالوں کے بعد ثاقب ایک خوبصورت جوان کی شکل دھار  
 گیا۔ موٹی موٹی آنکھیں، چھوٹی چھوٹی خوبصورت تراشی  
 ہوئی مونچھیں اور چستے دار، کسی رئیس ثاقب کی دلکش  
 شخصیت کی آئینہ دار بن گئیں۔ ثاقب اس خاموش گلی کی  
 مکین چند لڑکیوں کا ہیرو بن گیا۔ چوہدری فتح داد کی بیٹی  
 فارہ نے جب ثاقب کو پہلی مرتبہ دیکھا تو دم بخود رہ گئی۔  
 لیکن ثاقب ان سب، رومانوی چکروں سے ماورا کیسی دنیا  
 میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ مقابلے

کیا۔ ساری گلی کے مکانوں کی چھتیں ایک دوسری سے  
 متصل تھیں۔ تین گھر دور چوہدری فتح داد کا مکان تھا۔  
 چوہدری صاحب نے شوقیہ طور پر ایک کتابیں رکھا تھا۔  
 مکانوں کی سادی چھتیں اس کتے کی ملکیت تھیں۔ ایک  
 رات ایک بلی اپنے نو مولود بچے کو منہ میں اٹھائے کہیں  
 لے جا رہی تھی کہ چوہدری صاحب کے کتے نے اس کو  
 دیکھ لیا۔ وحشیانہ انداز میں بھونکنے لگا اور کتابیں کے پیچھے بھاگا۔  
 بلی کے منہ سے اس اچانک آفت کے باعث بچہ گر گیا۔  
 کتے نے بلی کی بجائے اس بلوگڑے کے پیچھے بھاگنا  
 شروع کر دیا اور بالآخر قاضی صاحب کے مکان کے سنور  
 کے اوپر سے دو دو کٹ کے قریب اس کو پکڑ لیا۔ کتے نے  
 بلوگڑے کو پکڑتے ہی اس کی ٹکا پٹی کر دی۔ خون کے چند  
 قطرے دو دو کٹ سے ہوتے ہوئے نیچے سنور میں بھی گرنے  
 لگے۔ کتے کی خوفناک آواز سے نیچے ثاقب کی آنکھ مکمل  
 کھلی۔ کڑکی سے آتی ہوئی چاندنی کی ایک کرن دو دو کٹ  
 کے نیچے ایک پرانے اور متروک چولہے پر پڑ رہی تھی۔  
 ثاقب نے جب خون کے قطرے دیکھے تو اس کی سٹی کم  
 ہو گئی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے  
 وردازہ کھولا اور غلام گردش سے ہوتا ہوا ای ابو کے کمرے  
 کی طرف بھاگا۔ اس نے وردازہ بجایا لیکن اندر والے  
 شاید گھوڑے بچ کر سو رہے تھے وردازہ نہ کھلا۔ چاروٹا چار  
 خوف، شرمندگی اور زندگی کے ایک نئے احساس کے ساتھ  
 ثاقب اپنے کمرے کے بستر پر آ بیٹا۔ خونی کھیل ختم ہو چکا  
 تھا۔ بلوگڑے کا ایک کٹا ہوا مصوم سا کان دو دو کٹ کے  
 اندر فرش پر پڑا تھا۔ خون حریہ نہیں کرا تھا۔ شاید اس بے  
 زبان کی دگوں کی کل متاع ہی یہی چند قطرے تھے۔

ثاقب نے صبح ناشتہ کرتے ہوئے امی ابو کو رات کا  
 واقعہ بیان کیا اور التجاء کی کہ ہمارے مکان کی چھتوں کے  
 ارد گرد دیوار بنا دی جائے تاکہ پھر ایسا واقعہ نہ ہو۔ قاضی  
 صاحب اور شیریں بی بی کو بھی جان ثاقب کی شب بیتی پر  
 بو اترس آیا۔ ابو نے جنگلات جلد بنانے کا وعدہ کیا۔ اگلے دن  
 ثاقب نے چابی والا کتا ایک بھاری پتھر سے مسل ڈالا اور

کے امتحان میں بیٹا اور صوبہ بھر میں ساتویں پوزیشن حاصل کی۔ چند دنوں بعد اس نکلے کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہو گیا جس میں اس کے والد قاضی صاحب نے معمولی ملازمت کرتے ہوئے اپنی عمر گزار دی تھی۔

میاں بیوی کی گاڑی کے دو پیوں کے خزانے ختم ہو گئے تھے لیکن گھر گھر کرتی ہوئی سست رفتار گراہیوں والا دھیرا دھیرا سفر اب تک جاری تھا۔ فراغت ملی تو ایک دوسرے کی ضرورت اور بڑھ گئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تو قاضی صاحب نے اب جو ملی سے باہر نکلتا بہت ہی کم کر دیا تھا۔ ادبی ذوق میاں بیوی میں نمود پاتی تھا بلکہ پہلے سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اے حمید کے افسانے قاضی صاحب دیکھیں سے پڑھتے تھے۔ اے حمید کی امرتسر کی یادوں کو وہ میرٹھ کی تصویراتی نگاہوں سے پڑھتے۔ بعض اوقات تو اے حمید کے افسانوں کی دبیز روانیت اور سکوت قاضی صاحب کے چہرے پر ایک گہری طمانیت کا احساس پیدا کر دیتا کسی سفر کو پڑھتے ہوئے وہ زیر لب مسکرانے لگتے۔ کوئی مصلحان کی آنکھوں میں یادوں کے سمندر میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو جلوہ گر کر دیتا۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دھوپ جھاؤں شیریں بی بی کو بڑی عجیب لگتی۔

گھر کی آمدن مقول تھی۔ قاضی صاحب کی پٹن اور قاتب کی اچھی خاصی تنخواہ ان کی ضرورت سے زائد تھیں۔ قاتب کا کمرہ اب بچکانہ تصویروں سے خالی ہو گیا تھا۔ اب اس کمرے میں صادقین اور دوسرے معروف مصوروں کے خطاطی کے نمونے اس کے عمدہ جمالیاتی ذوق کا احساس دلاتے تھے۔ تاریک راتیں، موسلا دھار بارشیں اور چوہدری صاحب کے کتوں کے شکار اب قاتب کو خوفزدہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف چوہدری صاحب کی بی بی بھی سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد مقامی گزٹ کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئی تھی۔

اس مرتبہ جب سردیوں کی موسلا دھار بارشیں تھیں تو گلابی جاڑے نے سخن میں ملنا نہیں کس دیں۔ کچھ دن اور گزرے تو ماحول میں ہنستی رنگ بھلنے لگا۔ 23 فروری کو

شہر میں ہنست منائی گئی۔ محلے کے سارے لوجوان بچوں پر چڑھ دوڑے۔ بچھیں اڑائی گئیں، بچ لڑائے گئے۔ قاریہ اپنی بہنوں اور کزنوں کے ساتھ ہنستی جوڑے میں خوب کھلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ قاتب نے جب قاریہ کو تمام لوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز دیکھا تو احساس رقابت کی وجہ سے اس کا ناقدانہ جائزہ لیے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی قاتب نے کافی وقت ضائع کیا تھا لیکن اب مزید وقت ضائع کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ قاتب نے ایسا بچ لگایا کہ چوہدری صاحب کی پٹنگ چند منٹوں میں قاضی صاحب کے خاموش آنگن کی زینت بن چکی تھی۔

قاضی صاحب اور شیریں بی بی خود سے ساتھ والے کمرے میں کھسک گئے اور اپنا کمرہ نئے جوڑے کو دے دیا۔ ابھی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی نہیں اتری تھی کہ اجانک شیریں بی بی کے دل کی شریانیں سکڑنا شروع ہو گئیں۔ لیا سٹیس کا مرض تو ان کو سالوں سے ہو چکا تھا۔ سادون شروع ہو گیا۔ چھتوں کے پرنا لے موسلا دھار بارشوں کے پانی کو راستہ نہ دے سکے اور یہ سادون کا پانی چھتوں کے حیردوں اور گچھوں کو عبور کر کے صحنوں میں گرنے لگا۔

ایک روز کمرہ کی کھڑکی کے قریب اواس اور دیران آنکھوں سے قاضی صاحب بھی بارش میں نہاتے ہوئے پوڑھ اور پوڑھ آم کے درختوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ شیریں بی بی کئی دیر سے ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ قاضی صاحب کو متوجہ کرنے کے لیے شیریں بی بی نے پرانا ٹر استعمال کیا۔ اپنی کزور ہوتی ہوئی دلچسپ آواز میں قاضی صاحب کے چاندی جیسے بالوں کو گدگداتے ہوئے گویا ہوئیں۔

تھے اپنی چادر سے میں ڈھانپ لوں زمین آسمان کچھ دکھائی نہ دے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا جو تھوڑی دیر بعد ہلکے سے قہقہہ میں تبدیل ہو گیا۔ چند دن قبل قاضی صاحب ساتھ والے محلے کے ایک حکیم سے بیگم کی گرتی ہوئی طبیعت کے بارے میں مشورہ کرنے گئے

## اللہ پر یقین رکھو!

مجھے خود پر بہت افسوس ہوتا ہے جب میں اپنا سر زمین کے نا خداؤں کے آگے جھکا تا ہوں لیکن اس اللہ کے آگے نہیں جھکا تا جو پوری کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہے جب مسجد سے آواز آتی ہے تو علی الفلاح آؤ کامیابی کی طرف میں یہ آواز سن کر بھی نہیں جاتا کیوں آخر کیوں کیا میں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا۔ میں جو بھی کام کرتا ہوں میری یہی سوچ ہوتی ہے جس کا میں نے کام کیا ہے وہی شخص مجھے پیسے دے گا۔ میں اللہ پر یقین کیوں نہیں رکھتا؟ جب مجھے اللہ پر یقین آ جائے گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

(راشد لطیف مبرے والا، ملتان)

اندھری گزرتا ہے۔ اے حمید کے ساتھ ساتھ ہارلی کے اردو کے ترجمہ شدہ ناول اور مقبوضہ فریم والی ایک تصویر قاضی صاحب کی کل کائنات ہے۔ بڑھاپے نے اُن کی جوانی والی اہمیت، حوصلہ اور بہادری کا قلع قمع کر دیا تھا۔ ابلیسی آہٹ بھی اُن کو ڈرا کر رکھتی ہے۔

دسمبر کی ایک بے رخت رات کو قاضی صاحب اور قاریہ رات دیر گئے کسی تقریب سے لوٹے اور آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ قاضی صاحب نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے میاں بیوی کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے غلام گردش میں سے گزر کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ کبھی ایسے ہی جوش و ولولہ کے ساتھ دنیا کو مانیہا سے بے خبر قاضی صاحب اور شیریں بی بی غلام گردش میں گردش کیا کرتے تھے۔ جب ننھا قاضی صاحب نے خوف و ہراس میں جکڑی زندگی گزار رہا تھا اور حسرت بھری نگاہوں سے اپنی کوٹھری کی سلاخ دار کھڑکیوں سے والدین کی آزاد، مطمئن اور بے خوف زندگی کو دیکھا کرتا تھا۔

نصف شب ہونے کو ہے۔ قاضی صاحب کو دسمبر کی بے رخت راتوں کی خوفناک خاموشی سونے نہیں دے رہی۔

تھے۔ حکم صاحب نے صبح اور رات سونے سے پہلے شہد کے ساتھ میں میں دانے بادام کی غذا تجویز کی۔ جب اس دہلی روا کا وقت آتا قاضی صاحب بڑے اہتمام سے ایک ایک دانہ گن کر شیریں بی بی کو نوں بادام کھلاتے جیسے چڑیا اپنے بچوں کو چوگاڑا دیتی ہے۔

ایک روز قاضی صاحب عصر کی نماز ادا کرنے مسجد میں گئے ہوئے تھے۔ قاریہ اپنے کمرے میں پرچوں کی مارنگ کر رہی ہے۔ قاضی صاحب دفتر سے نہیں آیا۔ چاکل شیریں بی بی کی اٹلی سی چیخ بلند ہوئی۔ قاریہ بھاگتی ہوئی آئی اور دیکھا کہ آرام کرسی پر شیریں بی بی بڑے بے سکون انداز میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد قاضی صاحب وصال مار کر رو رہا تھا۔ قاضی صاحب نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ شاید اس وجہ سے کہ انہوں نے آنسوؤں کا محدود ذخیرہ صرف دہائی تک آہستہ آہستہ لٹا دیا تھا۔

زورخت اپنے بچے اتار چکے ہیں۔ رات کے وقت ہواؤں کے جھکڑ خشک پتوں کی خوب دوڑ لگوار ہے ہیں۔ شدید سردیوں نے دیران حویلی کے کینوں کو کمروں میں مقید کر رکھا ہے۔ قاضی صاحب اور قاریہ بچھلے اتوار کو کچھ پانچ پیر خرید کر لائے تھے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے فریج پر بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں سجا دیا گیا ہے۔ دونوں میاں بیوی بڑے احترام سے قاضی صاحب کا بستر اور کتا ہیں غلام گردش سے دوسری طرف والے ستور میں غفلت کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب بے سکون چہرے سے ساری کارروائی دیکھ رہے ہیں۔ قاریہ جیسے ہی ایک شیشی پر پڑی شیریں بی بی کی خوبصورت فریم میں لگی تصویر ہٹا لی ہے تو اسے ایک بندر والی نظر آتا ہے۔ قاضی صاحب سے پوچھ کر جب وہ جلدی جلدی رو مال کو کھولتی ہے تو بادام کی گریاں نیچے گر جاتی ہیں۔ میاں بیوی کو قاضی صاحب کی چپکے چپکے اس خوش خوراکی کے غسل پر ہنس آ جاتی ہے۔ قاضی صاحب فوراً بادام کی گریاں کو بچوں کی طرح ہیریاں چننے والے انداز سے اپنے جیب کے اندر ڈال کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

قاضی صاحب کا زیادہ وقت شور نما بیڈ روم کے

قاضی صاحب شیریں بی بی کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے گلے شکلوں میں لگ گئے۔

شیریں..... اور میری شیریں! میں نے کیا بکاڑا تھا تیرا؟

کیوں مجھے زہر کا چٹا لگا کر..... میری جھوک جاو کر کے میرے گھر سے نکل گئی؟

میری عمر بھر کی محبتوں کا اجماع ملو دیا ڈونے۔ کب بلا رہی ہو مجھے اپنے پاس؟ آنکھیں کیوں پکھڑ رہی ہو؟

اس کوٹھری کی وجہ سے؟ ناں میری شیریں! ناں! میں اس کوٹھری میں خوش ہوں۔ اس بڑے کمرے میں تیری خوشبو،

تیری یادیں کہاں مجھے سونے دیتی تھیں۔ میرا بیٹا ادھ بہو بہت اچھے ہیں کہ انہوں نے میری خاطر اس بڑے کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔ ہاں ایک بات بتانی ہے تم کو۔

میں نے تمہارا شہد اور بادام سنبھال رکھا ہے۔ تمہاری صرف دو خوراکیں باقی ہیں۔ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ

خوراک مکمل ہوتے ہی تم بالکل صحت مند ہو جاؤ گی۔ دیکھو میں نے تمہاری کتابیں، کپڑے اور وہ انگلیشی بھی سنبھال

رکھی ہے جو شادی سے پہلے میں نے تم کو تحفہ میں دی تھی۔ روزانہ صبح ٹاقب چائے کا کپ اور ڈبل روٹی کا

روایتی ناشتہ باہمی کی کوٹھری میں لے کر آتا۔ چند دلوں سے ٹاقب محسوس کر رہا تھا کہ قاضی صاحب کی آنکھیں

سرخ ہوئی جا رہی ہیں۔ ایک روز صبح ناشتہ دیتے وقت ٹاقب نے اس کی وجہ پوچھ لی۔

قاضی صاحب نے کہا۔ ”بیٹے ثانی اور تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صرف رات کو یہ چوہدری صاحب کا کتا

چھت پر دوڑتا ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر نیند نہیں آتی۔ تو ایک مہربانی کر ہماری چھتوں کے ساتھ ایک چھوٹا

ساجنٹا بنوا دے۔ تاکہ کتا میری نیند سکون نیند کو خراب نہ کر سکے۔“ ٹاقب نے کہا جی اب بہت جلد یہ کام ہو جائے گا۔

ٹاقب اور فارہ بہت مصروف زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی ایک قسم کی طمانیت موجود تھی۔ زندگی کی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے چھتوں کے

اوپر دیواریں کھڑی نہ ہو سکیں۔ اب قاضی صاحب نے بھی اپنے مسئلہ کا حل نکال لیا تھا۔ ان کی نیند کا دشمن چوہدری

صاحب کا بل میر نیر کتا تھا جو رات بھر جاگا کرتا اور بلیوں کو چھتوں پر بھاگتے رکھتا۔ لیکن دن چڑھتے ہی اپنے لئے

بائی گئی مخصوص کوٹھری میں سو جاتا۔ چوہدری صاحب کا بیٹا صبح اس جانور کو ایک پیالے میں دودھ اور ڈبل روٹی کے

چند ٹکڑے ڈال جاتا۔ یہ ناشتہ کرتے ہی وہ سو جاتا۔ دن بھر اس کی آواز کوئی نہ سنتا۔ اب قاضی صاحب نے بھی

جگ راتوں کی کمی دن کو سو کر پوری کرنا شروع کر دی۔ آنکھوں کی سُرخمی ختم ہو گئی۔ رحمت بیٹے نے بھی سکون کا

سلسلہ لیا کہ چلو ابوی کی گمشدہ نیندیں لوٹ آئی ہیں۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ کتے نے جانے کون سی

چیز دیکھ لی اور دیوانہ وار چھتوں کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ قاضی صاحب جس کوٹھری میں سوئے ہوئے تھے، اس کی

چھت پر پانی ہونے کی وجہ سے بوسیدہ ہو چکی تھی اور کتا بھی رات بھر اپنے پنجوں سے اس کی مٹی کریدتا رہتا تھا۔ اچانک

کتے کے بوجھ کی وجہ سے کوٹھری کی دو اینٹیں نیچے گر گئیں۔ ایک اینٹ قاضی صاحب کے پاؤں پر آن گری۔ پاؤں کی

ہڈی کے ٹوٹ جانے کی آواز سنائی ہوئی۔ پاؤں کی دو انگلیوں سے خون جاری ہو گیا۔ کتے نے بھی سوزناخ کے

قریب ڈیرہ لگا لیا اور ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد تھوٹھنی اندر ڈال کر بھاؤں بھاؤں کرنے لگ جاتا۔ قاضی صاحب شدید

درد کرب کے عالم میں بمشکل بستر سے اٹھے۔ غلام گردش کو عبور کر کے سامنے والے کمرے پر دستک دینے ہی والے

تھے کہ اچانک اُن کے ہاتھ رک گئے۔ ان کے لاشعور سے ایک یاد لپک کر شعور میں آ گئی۔ انہیں ایسی ہی ایک رات یاد آ

گئی جب وہ اپنی محبوب بھئی شیریں کے ساتھ گرم لحاف میں حُرے کی نیند سو رہے تھے اور باہر سخت سردی میں تھا ٹاقب

خوف کے مارے دروازے پر پیٹ رہا تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح جھکے جھکے قدموں سے واپس لوٹ گئے۔

\*\*\*

## انوکھا طریقہ شراب

کاش سینما بھنگ لکھوادیتا "سینما محرم اور رائج الاڈل اور رمضان شریف  
میں بند رہے گا" اس طرح اس کی جڑ میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

بشیر احمد بمبئی

☆

ثواب حاصل ہوتا۔ یہ تو قحط حدیث پام، سبحان اللہ!  
انسان کو اسلام میں بڑی رعایت ہے۔  
اب آئیے! آپ کو اپنے شہر بہاولپور کا ایک  
دلچسپ واقعہ سناں ہوں۔ ایک انسان کی عقل مندی کا  
واقعہ جس نے مفت کی نیکیاں حاصل کرنے کا ایک  
بہترین عمل کیا۔ آئیے واقعہ پڑھ کر کافی محظوظ ہوں گے۔  
کوئی دور تھا، جب سینما پر عروج ہوتا تھا۔ لوگ  
جوق در جوق فلم بنی کا شوق پورا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ہر  
سینما پر تماشائیوں کا غلطیوں کا سمنہ درش کی صورت  
میں نظر آتا تھا۔ ہمارے شہر میں یوں تو کئی سینما گھر تھے  
جن کے نام یہ ہیں۔ عباسیہ ٹائیکز، رین بو، دیوالی،

انسان کی اپنی سوچ فائدے کا کچھ نہ کچھ درجہ  
ہر رکھتی ہے۔ ایک اسلامی واقعہ پڑھا تھا کہ ایک  
مختص مکان بنوا رہا تھا۔ روشن دالوں تک مکان تعمیر ہو چکا  
تھا۔ سرکار کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپ نے اس شخص سے  
پوچھا۔ یہ روشن دان کس کام آئیں گے۔ مکان کے  
مالک نے عرض کی۔ سرکار ان روشن دالوں سے تازہ ہوا  
آئے گی۔ آپ نے تبسم فرمایا اور اس مالک مکان سے  
فرمایا۔ اگر تم یہ کہہ دیتے کہ ان روشن دالوں سے اذان کی  
آواز آئے گی تو تمہارے اعمال نامے میں نیکیاں لکھ دی  
جاتیں۔ تازہ ہوانے تو ہر حال میں آتا ہے۔ تمہیں اس  
نیت کا کہ ان سے آذان کی آواز آئے گی۔ مفت میں

للمیں دکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپریٹر تو ویسے بھی کٹ پھانٹ کے ماہر ہوتے ہیں، کئی پھٹی فلموں نے عوام کا مزہ کرکرا کیا تو وہ ایک ٹکٹ میں دو فلموں سے بھی بدظن ہو گئے۔

اب عالم یہ تھا کہ ٹکٹ کھڑکی سے بند کر دیا گیا۔ سینما کے پوسٹروں والے برآمدے کے سامنے کرسیاں بچھا کر عملہ بیٹھ جاتا اور ٹکٹ کی کاپیاں قہال میں رکھ کے فروخت کرتے۔ اکا دکا تماشائی سینما ایریا میں داخل ہوتا، تماشائیوں کی عادت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خریدنے سے پہلے پوسٹر جو جالیوں میں نصب ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہیں، بعد میں ٹکٹ خریدتے ہیں۔ ٹکٹوں والی قہال برادری ہر آنے والے تماشائی کو مجبور کرتی کہ فوراً ٹکٹ لے لو۔ لائٹ گرنے والی ہے۔ یعنی سکرین پر تصویریں آنے والی ہیں۔ اُن کی اس بات سے فوراً اوپر کھنٹی بجتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا کہ فلم شروع ہونے والی۔ غلٹ میں ٹکٹ لے کر اندر جانے والے اندر جا کے مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ سیٹوں پر چند سر ہی نظر آتے ہیں۔ دو تھرڈ کلاس میں بیٹھے ہیں تو تین فرسٹ کلاس میں اور ایک گیلری میں۔ جب کل چھ آدمی فلم دیکھنے والے ہوں گے تو بھو بجلی کا بل بھی سینما انتظامیہ کے گلے میں پڑ گیا۔ ایسے میں کون پوری فلم دکھاتا ہے۔ الٹی سیدھی چند تصویریں دکھا کے دی اینڈ اختتام کے حروف سامنے آ جاتے۔

اس طرح یار لوگوں نے سینما کے عروج کا بیڑہ غرق کیا ہے۔ لوگ اب سینماؤں سے مکمل طور پر ہی بدظن ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی ہم ماضی پر ایک نظر ڈالیں تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ عوام پر خصوصاً غریب عوام پر سینما کی چار دیواری میں بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ لاہور کے بڑے بڑے ایکٹروں اور کلاکاروں کی کوشیوں میں غریب عوام کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ غریب عوام کو ٹکٹوں کے حصول کے لئے پولیس کے ادنیٰ سے سپاہی کے ڈنڈے

فانوس، ہیراڈائیز، شمع، پینکٹن، کسان سینما یہ بھی عرض کرتا چلوں ان میں قدیم سینما مہاسہ ٹائیز تھا یا پھر ریوالی سینما تھا۔ جو ریلوے سٹیشن کے قریب ریلوے لائنوں کے پار تھا۔ اس سینما پر دوری کی وجہ سے لوگ بہت کم جاتے تھے۔ اس سینما کا مالک منیجر تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اس کا پرانا نام ریوالی تھا پھر اس کا نام منم رکھا گیا۔ بعد میں اس کو روہی سینما کا نام دیا گیا۔ سینما شہر سے باہر تھا اس لئے نقصان میں جا رہا تھا۔ خصوصاً سردیوں میں لوگ سردی کی وجہ سے اس طرف کا رخ کم ہی کرتے تھے۔

کئی دور میں مجھے یاد ہے ڈراڈرا اس پر بلیک اینڈ وائٹ فلمیں چلتی تھیں۔ جن پیارا، جند جان وغیرہ۔ کسان سینما بستی جہانگیراں جو اب جدید بڑی کالونی ہے، اس کے بار بغداد سٹیشن روڈ پر کھیتوں میں بنایا گیا تھا۔ قریب ہی شیکم کے درخت تھے۔ پہلے روز افتتاحی فلم چلی اور وہ بھی مغرب کے بعد جب اندھیرا ہو گیا کیونکہ سینما کی چھت نہیں تھی۔ روپے پیسے کی بھی لوگوں کے پاس کی تھی اس لئے کئی جیالوں نے درختوں پر چڑھ کے پہلا شو مفت میں دیکھا۔ غالباً فلم نغمہ اور حبیب کی تھی۔ یہ جوڑی کسی دور میں مقبول تھی۔ کسان سینما تو چند روز ہی چلا پھر بند ہو گیا۔ درختوں کی وجہ سے لوگ بغیر ٹکٹ فلم دیکھ لیتے تھے جس کی وجہ سے سینما انتظامیہ کو خسارہ ہوا تو سینما بند کر دیا گیا۔ بعد میں آہستہ آہستہ دیو قامت دیواروں کی بنائیں بھی غائب ہو گئیں۔ روہی سینما نے بعد میں چائنا کی ایکشن فلموں کا سہارا لیا۔ انگلش للمیں بھی چلتی رہیں۔ پھر وہ بھی بند ہو گیا۔

کئی سینماؤں پر گیت مالا اور ہمراہ سائیڈ پروگرام بھی دکھائے گئے لیکن عوام کو آہستہ آہستہ ڈش ایشیا اور کیبل نے سینما بھلوا دیئے۔ فانوس سینما کو توڑ کے وہاں کاروباری پلازا بنادیا گیا۔ ہیراڈائیز سینما بھی ختم ہو گیا۔ پلاٹ میں لنڈا بازار بن گیا۔ شمع سینما پر ایک ٹکٹ میں دو

”داستان مردانِ خُرکی“

# اندلس کی ناگن

عنایت اللہ کے قلم سے

- شراب کے اُس جام کی کہانی جس میں ہسپانیہ کو غرق کرنے کی سازشیں کی گئیں
- اُن مردانِ خُرکی داستانیں جن کے خون کے قطرے سرزمینِ اندلس پر موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔
- اُن حسین ناگوں کے قصے جن کا زہر باآخراً ملتے لہو کو مسموم کر گیا۔

کتاب چھپ کر تیار ہے اپنے  
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

کچھ دنوں میں

26 پیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ۔ لاہور

فون: 042-37356541

کھانے پڑتے تھے۔ غلیظ گالیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ رشتی کی وجہ سے لامحالہ قطار میں دھکم پیل سے بدھمی پیدا ہوتی تھی۔ دھکے کھانے پڑتے تھے۔ مظر گر جاتے تھے۔ جوتیاں ٹوٹ جاتی تھیں۔ جینیں کٹ جاتی تھیں۔ گھڑیوں کے پین ٹوٹ جاتے تھے۔ پولیس کے سپاہی ڈنڈے برساتے تھے۔ کھڑکی سے صرف دو گت دیئے جاتے تھے۔ ہائی گت سرعام ہلک میں فروخت ہوتے تھے۔ پولیس کی موجودگی میں ہلکی گت فروخت کرتے تھے۔ پولیس والے اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ عوام کی خوب مٹی پلید ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے عوام کی سینما انتظامیہ کے قلم و قلم سے جان چھوٹی ہے۔

اب وہ بڑے بڑے حیرے سے کیبل کے حیرے لوٹ رہے ہیں جبکہ قلمی ڈار خالوں کے مالکوں اور بڑے ایکٹروں کا یہ دعویٰ ہے کہ عوام ایک بار پھر سینما کا رخ کریں گے۔ یہ صرف اُن کے خیالی پلاؤ کی دہلیں ہیں جو انہوں نے تصویر ہی تصور میں عارضی چلبھوں پر چڑھا رکھی ہیں۔ عوام اتنی بھی پاگل نہیں کہ دوبارہ پولیس کے ڈنڈے کھانے کے لئے اب سینما کا رخ کرے گی۔ کیبل کے ذریعے ہزاروں مختلف آئٹم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فلمیں، خبرنامے، گیت، مالا، مزاحیہ پروگرام تو یہ سب چھوڑ کے عوام کو کیا پڑی ہے کہ صرف ایک فلم کی خاطر سینما پر ذلیل ہو۔

اب وہ دن ہوا ہو گئے جب سینما کے اشتہار پر لکھا ہوتا تھا ”ایڈوانس بکگ جاری ہے“ اب کئی سینماؤں کو سٹیج ڈراموں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ہمارے شہر بہادرپور کا مہاسہ ٹائیکز بھی اب فلموں کی بجائے سٹیج ڈرامے دکھا رہا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ لاپ ہونے جا رہے ہیں کیونکہ گت جیتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے افضل خان عرف رمبو بھی ڈرامہ کرنے آیا تھا۔ معاوضہ نہ ملنے پر کانوں کو ہاتھ لگا کے بہادرپور سے گیا ہے کہ اب نہ آؤں

گا، بے وفا شہر میں۔

لگتا ہے بڑی نرمی ہے خدا کے قہر میں اس لئے تو  
ٹھیکیدار گھبراتے نہیں اور رئیس پی جاتے ہیں۔ حقوق  
العباد کا خیال نہیں کرتے۔ آخرت کا دم نہیں بھرتے۔ مال  
کھا کے بھی ہارٹ اٹک سے نہیں مرتے۔

آئے! اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ  
ایک سیانے شخص نے نیکیاں کمانے کا ایک الوکھا طریقہ  
اپنایا۔ قارئین کو یاد ہو گا جب سینماؤں پر عمل شروع تھا تو  
محرم کے مہینے میں دو دن سینما بند ہوتے تھے۔ محرم کا مہینہ  
شروع ہوتا۔ فلمیں چلتی رہتی تھیں۔ محرم کی نو اور دس تاریخ  
کو اعلانیہ محرم کے احترام میں سینما بند کر دیئے جاتے  
تھے۔ گیارہ محرم کو پھر فلمیں چلنا شروع ہو جاتی تھیں جو  
پورے مہینے چلتی رہتی تھیں۔ ہمارے شہر بہاولپور میں بس  
اڑے کے قریب (پرانی سبزی منڈی) روڈ پر ایک سینما  
ہے جس کا نام گیرین سینما ہے۔ اس سینما کے لگت زیادہ  
مہینے نہیں ہوتے تھے اس لئے اس سینما پر عوام کا زیادہ رش  
ہوتا تھا۔ جتنا عرصہ بھی یہ سینما چلا ہے خوب بڑس ہوا  
ہے۔ آخر وہی ہوا پرانا سودن لوہاں لودن، جہاں پرانے  
سینما ہٹ گئے گیرین پر بھی زوال کا وقت آ گیا۔ موٹی  
موٹی طوائفوں کی ٹنگی راتوں والے پوسٹر بھی لگائے گئے،  
رقص بھی دکھائے گئے لیکن عوام بھی طوطا چشم ہے۔ آخر  
طوطے کی طرح منظر سے اڑ گئی۔ پھر اچڑین فلمیں بھی  
چلائی گئیں لیکن کوئی حربہ کامیاب نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ  
سموسوں اور بوتلوں والے ڈکاندار بھی بھاگ گئے۔

میرا ایک دوست وحید ہے، وہ بھی وہاں کا ٹھیکیدار  
تھا، سموسوں کا۔ وہ بھی ڈکان چھوڑ آیا ہے۔ اب فتح خان  
بازار کی چڑھائی پر فردٹ چاٹ کی ڈکان کر رہا ہے۔  
انیس جنوری 2014ء بروز اتوار میں سبزی منڈی روڈ پر  
آ رہا تھا۔ گیرین سینما کے قریب سے گزرا تو بڑے گیٹ  
کے ساتھ دیوار پر مونا مونا لکھا ہوا تھا۔ محرم کے احترام

میں محرم کے پورے مہینے سینما بند رہے گا۔ میں یہ تحریر پڑھ  
کے ٹھک گیا اور سوچنے لگا۔ واہ بھی کیا بات ہے۔  
محرم کا یہ احترام تو واقعی قابل ستائش ہے۔ وہ بھی دور تھا جب  
محرم میں صرف دو دن نو دس کو سینما بند ہوتے تھے۔ اب  
احترام کا یہ عالم ہے کہ سینما پورا مہینہ بند کر دیا گیا ہے۔ یہ  
تو بڑی ایمان افروز بات ہے۔ آخر حیرت تو ہوتی ہے۔  
خوف خدا بھی کوئی چیز ہے۔ اگر اتنا خوشی انسان کے دل  
میں جاگزیں ہو جائے تو یہ خوف ایمان دار ہونے کی  
دلائل کرتا ہے۔ یہ اشتہار محرم کے مہینے کا تھا۔ اب تو خیر  
سے ربیع الاول کی 17 تاریخ ہو چلی تھی۔ یعنی محرم کا مہینہ  
گزر گیا تھا۔ ظاہر ہے اب سینما کو کھل جانا چاہئے تھا۔

میں تھوڑا سا آگے ہوا اور کھلے گیٹ سے اندر جھانکا  
وہ برآمدہ سامنے ہی ہے جس میں پوسٹر لگے ہوتے ہیں،  
میری نگاہ برآمدے کی اُن جالیوں پر گئی جس میں پوسٹر  
لگے ہوتے تھے پوسٹر غائب تھے۔ جالیاں ویران تھیں۔  
اندھنار کیا تھی۔ بندہ نہ بندے کی ذات۔ مجھے حیرت بھی  
ہوئی اور سینما ٹیجر کی ٹنگی پر رشک بھی آیا۔ اب سوال یہ تھا  
کہ محرم کا مہینہ تو ختم ہو چکا تھا جس کے احترام میں سینما  
بند کیا گیا تھا۔ اب ربیع الاول کی سترہ تاریخ تھی، اب  
نیک سینما کو دوبارہ کھل جانا چاہئے تھا مگر وہ ابھی تک بند  
تھا۔ اندھنہ کا عالم طاری تھا۔ میں نے ذہن پر ڈراما ساز ور  
دیا تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ سینما مالک نے  
جب دیکھا کہ فلمیں تو ویسے بھی فلاپ ہو رہی ہیں، لوگ  
آنے کا نام نہیں لے رہے تو اس نے بورڈ آؤٹ کر دیا  
کہ محرم کے پورے مہینے سینما احترام میں بند رہے گا۔ یہ  
ٹنگی کمانے کے اس کے ٹیک خیالات تھے۔ اب لوگ تو  
ویسے نہیں آ رہے تھے۔ کاش سینما میٹر لکھوا دیتا "سینما  
محرم اور ربیع الاول اور رمضان شریف میں بند رہے گا"  
اس طرح اس کی جڑا میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔



میں ذات کا ہر رنگ ہوں۔ اللہ نے حکومت دی ہے تو  
بھاگتے کیوں ہوا طمیتان اور فراغت سے زندگی بسر کئے جاؤ  
بگوان جسے جیسا چاہتے ہیں ماریتے ہیں۔ ان کی لپلا اہم اپار ہے۔

## روپ بہروپ



مظفر حسین ملک ایم۔ اے

☆

اپنی تقدیر پر قانع اور شاکر ہو چکے تھے لیکن پھر بھی رات کی  
تہائیوں میں جب کبھی وہ ایک دوسرے سے دلجوئی اور  
پیار کی بانٹیں کرتے تو اولاد سے محرومی کے تذکرے سے  
بازندہ رہ سکتے۔

”اللہ شور کے پاس کیا کمی تھی جو ایک چاند سا بچہ ہمیں  
بھی دے دیتا جو ہمارے گھر کی رونق اور ہمارے  
بڑھاپے کا سہارا ہوتا۔“ لیلادلی نہایت مایوسی کے انداز

1817ء کی ایک صبح کو جب ہمارے گھر کے بڑے  
مستی بازار میں گنگا دین چمار پر بھوکا نام چپتے ہوئے  
حسب معمول اپنی دکان کھولنے کے لئے آیا تو وہ یہ دیکھ  
کر حیران رہ گیا کہ پانچ چھ سال کا ایک خوبصورت لڑکا  
اس کی دکان کے گھڑے پر پڑا سو رہا ہے۔ گنگا دین چمار  
پچاس سال کی عمر میں بھی بے اولاد تھا۔ اس کی بیوی  
لیلادلی سن میں اس کی کئی گنی تھی۔

سے کہتی۔

بدکار لڑکا ایک بے اولاد گھر کی رونق کا سامان تو ضرور بن سکتا ہے مگر وہ چارہ سے اور لڑکا کیا معلوم کسی اونچی جاتی سے تعلق رکھتا ہو۔ آج ممکن ہے کوئی برہمن یا کھتری اسے گھر میں پناہ نہ دے مگر اسے جب ایک چارہ نے اپنا لیا تو یہ معاملہ فرقہ وارانہ کشمکش کا باعث بن کر خطرہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ لڑکے کو اس کے حال پر چھوڑ کر دکان کھولے۔ وہ اس کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ دوبارہ لڑکے کے معصوم اور خوبصورت چہرے پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی لڑکے کو اپنانے کی خواہش فرقہ وارانہ فساد کے خطرے پر غالب آ گئی اور گنگا دین دکان کھولنے کی بجائے چاند کو لے کر اپنے گھر کی طرف ہو گیا۔

لیلا دتی گھر کے آگن میں جھاڑو دے رہی تھی کہ خلاف معمول اپنے خاندن کو واپس آتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے گنگا دین کے گھر میں آئے تیس سال سے زیادہ گزر چکے تھے، وہ کبھی دوپہر کے کھانے سے پہلے دکان سے گھر واپس نہیں آیا تھا اور پھر یہ لڑکا کون ہے؟ اس نے اس سے پہلے تو اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گنگا دین نے گھر میں قدم رکھتے ہی لیلا دتی کو صبح کے واقعہ سے آگاہ کیا اور لڑکا اس کے حوالے کر کے دکان پر واپس چلا گیا۔ ٹھاکر ہر دت کے لڑکے کی شادی نزدیک آ رہی تھی اور بھوکے پاؤں کی جوتیاں ابھی تیار ہونا باقی تھیں، ٹھاکر صاحب کے آدمی روزانہ یاد دہانی کر جاتے تھے۔

لیلا دتی نے بچے کو دلنا سادیا۔ نسلی اور جوار کی روٹی کھانے کو دی اور پاس بیٹھ کر دلجوئی کی باتیں کرنے لگی۔ چاند بچے کی لیلا دتی کے لئے چاند بن کر آیا وہ اس سے مادرانہ شفقت سے پیش آتی اور بھی اپنی آنکھ سے اوجھل جہنہ ہونے دیتی۔

دکان پر واپس جا کر گنگا دین نے بچے کے خاندان اور ورثہ کی تحقیقات کی غرض سے اکثر گاہاؤں اور

گنگا دین کو لیلا دتی کی بے ثمری کا صدمہ اس سے کم نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی شریک حیات کی حوصلہ افزائی کے لئے "ایٹور کی مرضی" کا جملہ دہرا دیتا اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بات کا رخ کسی دوسری طرف موڑ دیتا۔ کبھی کبھی وہ کسی رشتہ دار یا مسائے کا بچہ لے کر پالنے کی تجویزیں بھی بناتے مگر یہ تجویزیں کسی نہ کسی بناء پر عملی جامہ سے محروم رہتیں۔

لڑکے کو دیکھتے ہی گنگا دین کے دل میں اولاد کی خواہش کے جذبات جاگ اٹھتے اور اس نے نرمی سے بچے کو جگایا اور پوچھا کہ وہ کون ہے۔ لڑکا جاگا اور گنگا دین کی طرف سبھی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "میں چاند ہوں، میری ماں مجھے چاند کہا کرتی تھی۔"

"کہاں ہے تمہاری ماں؟" گنگا دین نے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مر گئی ہے۔ چند دن ہوئے لوگوں نے اس کی لاش کو جلا دیا تھا۔" بچہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اور تمہارا باپ کہاں ہے؟" گنگا دین نے ابرو اٹھانے لگا۔

"میں نے اپنا باپ کبھی نہیں دیکھا۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ وہ بھگوان کے پاس میرے لئے کھلونے لپٹے گیا ہوا ہے۔" لڑکے نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا کوئی اور بھی بہن بھائی ہے؟" گنگا دین کا لہجہ پہلے سے بھی ہمدردانہ تھا۔ لڑکے نے سسکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے آنسوؤں کے قطرے گالوں اور چھوڑنی پر سے ہوتے ہوئے اس کی میلی کرتی پر گر رہے تھے۔

لڑکا روئے جا رہا تھا اور گنگا دین اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھے خاموش کھڑا تھا مگر اس کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک خوبصورت یتیم بے یار و

ہمیشہ اس تجویز کی مخالفت کرتی۔ وہ کہتی کہ بھگوان جانے یہ لڑکا کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ہم اسے چھار کیوں بنائیں۔ جہاں ہو کر اس شہر سے نکل جائے گا اور کہیں دور جا کر محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پال لے گا۔ ایشور کی دیا سے اگر اس کے بھاگ اچھے ہو گئے تو ہمارے احسان کو فراموش نہیں کرے گا۔ یہ اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ گفتگو اکثر چاند کے سامنے ہوتی اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ وہ برہمن کے اسباق میں روز بروز زیادہ دلچسپی لیتا غور سے سنتا اور محنت سے یاد کرتا۔

1808ء میں لارڈ ولیم بینٹ گورنر جنرل ہو کر ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہوں نے آتے ہی ننگل کے انسداد کی مہم شروع کی۔ ننگل کے جرم کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی اور شہر بہ شہر مٹادی کی گئی کہ جو کسی ٹھک کو پکڑوائے گا اسے خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔

یہ اعلان چاند نے بھی سن لیا۔ اب وہ اٹھارہ انیس برس کا نوجوان تھا کچھ کرنے اور کمانے کے دلوے سے سرشار اور جوانی کی جرأت سے مالا مال تھا۔ برہمن نے یا تو اپنے لڑکے سے مایوس ہو کر یا اپنا سرمایہ علم ختم ہو جانے کی وجہ سے اسباق کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ سوچا کہ اب وقت ہے کہ وہ اس شہر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے اور پردیس میں جا کر قسمت آزمائی کرے۔ لیلاوتی اور گنگا دین سے مشورے ہوئے اور چند دن بعد چاند ایک گڑوی، ڈوری اور چند کپڑوں کی ٹھڑکی لئے ایک قصبہ نکھنوی سڑک پر سفر کر رہا تھا۔

بٹارس سے ابھی چند میل ہی دور گیا تھا کہ پیچھے سے رتھ پیوں کی کھڑکھڑ سنائی دی۔ چاند سڑک کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا وہ کچھ مکان محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن کی حالت کچھ غیر یقینی سی تھی وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ ٹھکوں کے متعلق جو حکایات اس نے سن رکھی تھیں وہ خاصی خوفناک تھیں اسے خطرہ تھا کہ

دوسرے ڈکانداروں سے تذکرہ کیا مگر کوئی پتہ نہ چل سکتے پر خاموش ہو گیا۔ اس طرح چاند کی پردوش جو خدا جانے کس خاندان کا چشم و چراغ تھا، ایک چھار کے گھر ہونے لگی۔

گنگا دین کا کچا مکان ایک برہمن کے محل سے متصل تھا۔ محل کے ساتھ یہ کوٹھایوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ملک کے سامنے کوئی بھکاری بچہ کھڑا بھیک مانگ رہا ہو مگر قدرت کی ستم ظریفی سے یہ محل اور جموں پڑا برسوں سے ہم نشین تھے۔ برہمن چھار کی ہمسائیگی کو ناپسند کرنے پر بھی برداشت کر رہا تھا کیونکہ گنگا دین اس کے کنبہ کے سب افراد کی جوتیوں کی مرمت کی کوئی اجرت نہ لیتا تھا۔

برہمن کا ایک لڑکا تھا جو کندھنی میں اپنی مثال آپ تھا برہمن روزانہ اسے صبح سویرے بالا خانے میں بٹھا کر دیدوں سے منتر اور اشلوک یاد کرواتا۔ سو سو دلہہ کہلاتا مگر اس مالائقی کو کچھ نہ یاد ہوتا اور برہمن ٹھک کر اس محل کو دوسرے دن پر ملتی کر دیتا۔ اس بالا خانے کی ایک کھڑکی گنگا دین کے صحن کی طرف کھلتی تھی جہاں بیٹھ کر چاند مرفیوں کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ خالی الذہن ہونے کے باعث اس کے کان برہمن کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس طرح وہ اسباق جو برہمن اپنے لڑکے کو دیتا تھا چاند اپنی خدا داد ذہانت کی بناء پر اپنے ذہن میں مرفیاں ہنگاتے وقت یاد کر لیتا۔ کسی کو اس کا گمان بھی نہ تھا ورنہ اچھوت کے کانوں میں مقدس اشلوک کی سماعت کے جرم میں پکھلا ہوا سیسہ بھرنے والوں کی اس دور میں کی نہ تھی۔

وقت گزرتا گیا گنگا دین نے کئی دلہہ اس خیال کا اظہار کیا کہ چاند ڈکان پر جا کر مرمت کے کام میں اس سے ہاتھ مٹائے اور نئے جوتے بنانا سیکھ لے کیونکہ اب وہ بوڑھا ہو رہا تھا اور چاند کو وہ اولاد کی طرح اسی لئے پال رہے تھے کہ بڑا ہو کر ان کی ضیعی کا سہارا بنے۔ مگر لیلاوتی

ہوں۔ میرے پاس چند مجرب نسخے ہیں جو مختلف ڈبوں میں بند اس صندوق میں رکھے ہیں جس پر میں بیٹھا ہوں۔ تمہارے ذمے یہ کام ہوگا کہ جب میں مجمع لگا کر ادویات فروخت کرنے لگوں تو مجھے مختلف ڈبے جن کی طرف میں اشارہ کروں پکڑتے جاؤ۔ فرصت کے اوقات میں ادویات پیتا اور تمہ کے بیلوں کی خبر گیری بھی تمہارے ذمہ ہوگی۔“

چاند کو یہ مشغلہ دلچسپ معلوم ہوا اور وہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا وہ بھی ودائیاں کوٹنے کوٹنے سنیا سی بن جائے گا؟

سادھو نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ میں نے بھی کسی زمانہ میں تمہاری طرح ایک سنیا سی سے یہی سوال کیا تھا اور جواب تمہارے سامنے ہے۔

مرٹھے اور سادھو کی گفتگو کی شیرینی چاند کے خدشات پر غالب آ چکی تھی اور وہ بخوشی سادھو کی ملازمت پر تیار ہو گیا۔

سادھو نے جسے اب چاند سنیا سی جی کے لقب سے مخاطب کر رہا تھا چاند کو شاباش دیتے ہوئے اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی تعریف کی اور بتایا کہ اگلا قصبہ نزدیک ہی ہے جہاں پہنچ کر وہ قدرے آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد مجمع لگائیں گے۔

باتوں باتوں میں وہ قصبے میں پہنچ گئے۔ ایک سستی سی سرائے میں اترے بیلوں کے چارے اور پانی کے بعد انہوں نے فراغت سے کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد تیسرے پہر کے قریب سادھو نے اپنا صندوق کھولا اور چھ سات میسے میسے ڈبے اور ایک چمچی نکالی۔ ایک چھوٹے سے کنستری سے سیاہ روغن نکال کر اس میں اٹھ پلا اور دو چار مرے اور کھال اترے ہوئے سانڈے اس میں ڈال دیئے ایک بچہ کھولا اور اس میں سے خالی شیشیاں اور ڈیاں نکالیں۔ پڑیاں باندھنے کے لئے رومی

کہیں وہ بھی ان کا شکار نہ ہو جائے۔ اگرچہ اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی ٹھگ یا گروہ کا پتہ چلا کر اعلان کے مطابق انعام حاصل کرے مگر ظاہر ہے کہ اسے اس کام کا کوئی تجربہ نہ تھا وہ اس اپنی کشش میں جلا سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ تمہ اس کے پاس آ کر رک گئی۔ تمہ میں گیر دے پکڑے پہنے ایک سادھو سوار تھا اس نے چاند سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ چاند نے جواب دیا کہ وہ بیکار ہے اور تلاش معاش میں سرگرداں ہے۔ سادھو نے اسے تمہ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر اس پیشکش کو قبول کرنے پر چاند آمادہ نہ ہوا اور اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ سہا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سادھو نے اپنی پیشکش کو دہرایا کہ اسے تمہ میں سوار ہو کر اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے اور دوران سفر میں ملازمت کی شرائط طے کر لینی چاہئیں۔ اگر اسے سادھو کی پیش کردہ شرائط پر ملازمت منظور ہو تو بہتر ورنہ اسے اختیار ہوگا کہ اگلے شہر میں وہ تمہ سے اتر کر اپنی راہ لے، سادھو کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

اس تقریر سے چاند متاثر ہو کر نیم دلی سے تمہ میں سوار ہو گیا۔ سادھو نے اسے چاول کا مرٹھا کھانے کے لئے دیا اور اس طرح گفتگو کا آغاز کیا۔

”تمہارے چہرے پر ذہانت نمایاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ فائدے میں رہو گے۔ میں تمہیں اتنی تنخواہ دے دوں گا جو نہ صرف تمہاری موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہوگی بلکہ اگر تمہندی سے کام لے کر جس انداز کرتے رہے تو مستقبل میں بھی آسائش سے بسر کر سکو گے۔“

چاند نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کام کیا ہوگا۔“ اور مرٹھا کھانا شروع کر دیا۔ چاول اور گڑ کا امتزاج اسے بڑا لذیذ معلوم ہو رہا تھا۔

”جیسا کہ میرے لباس سے ظاہر ہے میں سنیا سی

اوٹ میں ہو گئے۔

اب سادھو نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

”صاحبو! میں سنیاسی ہوں۔ چودہ سال گورو گورکھناجھ کے ساتھ نیپال کی پہاڑیوں میں گھوما ہوں۔ اس سیر کے دوران میں دیوتاؤں کی سرزمین اور اگنی کنڈ میں بھی جانا ہوا۔ سرب ناگ دیوتا سے بھی ملاقات ہوئی۔ جڑی بوٹیوں کی دوا بھی شریمان گورو جی سے سیکھی اور اب کچھ خدمتِ خلق کی خاطر اور کچھ گورو جی کے فرمان کو پورا کرنے کے لئے شہر بہ شہر گھوم رہا ہوں تاکہ آپ کے دیکھوں میں کی ہو، بیماری اور کمزوری کی جڑ کٹ جائے اور روگ کا ناش ہو جائے۔“

اس کے بعد اس نے ہمدی کی قسم کی ایک گانٹھ ایک ڈبے سے نکالی اور مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”یہ جڑی گورو جی نے سرب ناگ دیوتا سے لے کر دی تھی۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ ذرا سے پانی میں رگڑ کر رات کو

کاغذ اور ڈبوں میں سے ادویات نکالنے کے لئے خالی جچے درست کئے اور سرائے کے باہر سڑک کے کنارے لے جا کر انہیں آراستہ کیا۔ چاند بھی ایک ہونہار شاگرد اور فرمانبردار نوکر کی طرح چیزیں اٹھا کر سڑک تک پہنچانے اور ان کی حفاظت میں بڑی مستعدی دکھاتا رہا۔ ادویات کو سچا کر رکھنے کے بعد سنیاسی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چند منتر چنے لگا۔ چاند نے محسوس کیا کہ سادھو کا تلفظ اور لب و لہجہ بہت زیادہ لٹلا ہے مگر چونکہ اس کی اپنی تعلیم بھی باقاعدہ نہ تھی اس لئے چپ ہو رہا۔

راہ چلتے لوگ جن میں بچے، بوڑھے، جوان، تجارت پیشہ، ملازمین، طالب علم، امیر غریب فرض ہر قسم کے لوگ شامل تھے، سادھو کے گرد جمع ہو گئے۔ اب سادھو نے منتر بند کر کے لٹینے اور پھبتیاں کہنی شروع کر دیں اور پھر تاہلغ لوگوں کو مجمع سے طے جانے کے لئے کہا۔ جن میں سے بعض تو چلے گئے اور بعض بڑی عمر کے لوگوں کی

# ایمان

20۔ اے سال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، گجرات

Ph: 053-3521253-3532224-3532225. Fax: 053-3535224

سرے کی جگہ چون دے دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے۔  
یا ارطی کے تیل کو کالا کر کے اس میں چڑھ اتر اہوا ساڑا  
ڈال دیا جائے تو وہ ساڑے کا تیل ہو جاتا ہے۔ یا  
سپہاں اور گھونگھے طبی اصطلاح میں سچے موتی اور گرہیں  
رہچھ اور شیر کی چربی کہلاتی ہے۔ ہر دو دوسری دوا کا بدل  
اور ہر مرض کے لئے باعث شفا ہو سکتی ہے اور سب سے  
بڑھ کر یہ کہ اس شہر یا قصبہ میں دوبارہ نہیں جانا چاہئے  
جس میں کسی ایک دفعہ جمع لگایا جا چکا ہو۔

لیکن ایک دفعہ یہ غلطی ہو گئی اور وہ کسی ایسے قصبہ  
میں جا لکے جہاں سنیاہی جی زیورات اور مد پے دگنے کر  
چکے تھے۔ سنیاہی کو دیکھتے ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں  
ہوئیں اور اس سے ہنسنے لگے کہ وہ راہ فرار اختیار کرتے  
دیہاتیوں نے رتھ اور بیلوں پر قبضہ کر لیا کچھ لوگوں نے  
سنیاہی جی کے کپڑے اتار لئے۔ کسی نے بچوں اور  
گھڑیوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہ خوش معلوم ہوتے  
تھے کیونکہ نقدی اور زیورات کی شکل میں جوگی کی بچیوں  
سے اس قدر مال برآمد ہو گیا تھا کہ اس نقصان سے کئی گنا  
زیادہ تھا جو روپے دگنے کرانے کے شوق میں وہ برداشت  
کر چکے تھے۔ دیہاتیوں کو نقد و جس کی تقسیم میں محویت  
سے مشغول دیکھ کر چاند اسے مالک کی پرڈا کئے بغیر ایک  
طرف کھسک گیا اور جب دیکھا کہ وہ محفوظ فاصلہ پر پہنچ  
چکا ہے تو اطمینان سے دوسرے قصبے کی راہ لی۔ کافی فاصلہ  
طے کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ شاید جوگی بھی ٹھک  
تھا اور اگر وہ اسے پکڑا دیتا تو انعام پاتا اور پھر اس نے یہ  
سوچا کہ اگر وہ خود بھی دیہاتیوں کے ہاتھ آ جاتا تو وہ دو  
فصلوں کے پکڑوانے کا انعام پاتے۔

وہ یہ سوچتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ  
پہنچ گیا۔ یہاں اسے ایک بننے کے پاس ملازمت مل گئی۔  
بنیادیں کا دوبارہ مالک تھا۔ اشیائے خوردنی کی تجارت  
کرتا تھا۔

سوئے وقت آنکھ میں لگائے تو اندھا نظر پائے کمزور  
بیٹائی والے کی بیٹائی تیز ہو اور تندرست آنکھ ہر دوگ اور  
بیماری سے محفوظ رہے۔

”صاحبو! میں اس کی کوئی قیمت نہیں لینا چاہتا مگر  
اس کو خالص حالت میں استعمال کرنا آپ لوگوں کے بس  
کی بات نہیں۔ آپ دنیا دار لوگ پاپ اور کشت کے جنم  
بھوک رہے ہیں اور اسے خالص استعمال نہیں کر سکتے۔  
چنانچہ اس کی شدت کو کم کرنے کے لئے اسے سچے موتیوں  
اور جواہرات کے ساتھ ملا کر چین لیا گیا ہے۔ پیتے وقت  
مقدس دیدوں کے منتر چنے پڑتے ہیں اور پہاڑوں کی  
گہماگہماؤں میں چلے کٹھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر میں قیمت نہ  
لوں تو سچے موتی کہاں سے خریدوں۔ اس لئے میرے  
دوستوں اس کی لاگت وصول کرنے اور دنیا کی بھلائی کا  
سلسلہ جاری رکھنے کے لئے اس کی مناسب قیمت کہنی  
بہادر کا ایک روپیہ فی شیشی رکھی گئی ہے جن دوستوں کو  
ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کر دیں۔“

چھ سات آدمیوں نے ہاتھ کھڑے کئے اور چاند  
نے سنیاہی کی ہدایت کے مطابق چھ سات شیشیاں بھر کر  
ان کے ہاتھ میں دے دیں اور اسی قدر روپے جوگی کی  
جیب میں جھنکار تے ہوئے داخل ہو گئے۔

سرے کے بعد چورن اور چورن کے بعد وردوں  
کی دوا نیکی گئی۔ سنیاہی اور دوا کے شاہکار ساڑے کے  
تیل کی باری آئی جس میں رہچھ اور شیر کی چربی کے علاوہ  
دیوتاؤں کی پسندیدہ اور مقبول بوٹیوں کا جوہر بھی شامل تھا  
وہ اس قدر بکا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس قصبہ کی تمام مرد  
آبادی کو اس تیل کی ضرورت ہے۔

دن گزرتے گئے، سنیاہی اور اس کا شاگرد ایک  
قصبے سے دوسرے قصبے اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں  
کھوتے رہے۔ اس دوران میں چاند پر اس پیشہ کے کئی  
اسرار و رموز منکشف ہوئے مثلاً اگر چورن کی جگہ سر مساو

## روشن باتیں

☆ فرمان رسول ﷺ: قیامت کے دن جینا اللہ کے نزدیک وہ شخص سب سے بڑا شمار ہوگا جسے لوگوں نے اس کی بڑبائی کی وجہ سے چھوڑ دیا ہو۔ (نبیلہ نازش)

☆ زمین کے اوپر عاجزی کے ساتھ رہنا سیکھ لو، زمین کے نیچے سکون سے رہ پاؤ گے۔

☆ دل میں برائی رکھنے سے بہتر ہے کہ ناراضگی ظاہر کر دو۔ (مسٹر - سرگودھا)

مال کی عقلی اور بننے کی گرفتاری کے لئے پہنچ گئے لیکن ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ مال بحق سرکار ضبط کرنے سے پہلے جس قدر قیمت اسباب ان کے اپنے گھروں میں پہنچ جائے وہی قیمت ہے۔ چنانچہ ہر ایک کو اپنی خواہش کی تکمیل میں محو پا کر چاند نے وہاں سے بھی راولپنڈی اور پٹنہ بھاتا لکھنؤ سے باہر ہو گیا۔

اس کے بعد اسے جن واقعات سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیل کسی آئندہ موقع پر اٹھا رکھتے ہوئے آج صرف اس قدر بتایا جاسکتا ہے کہ وہ گھومتا پھرتا وسط ہند کی ایک ریاست میں پہنچا۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں جس قدر پیشے ہیں ان سب میں کسی نہ کسی حد تک فکری ضرور ہے اور خطرہ سے خالی نہیں۔ بہتر ہے کہ اس علم کی تکمیل کی جائے جو بچپن میں اتفاقی طور پر حاصل ہوا تھا اور باقی عمر پوجا پاٹ میں بسر کر دی جائے چنانچہ اس نے برہمن کا روپ اختیار کیا اور کسی استاد کمال کا متلاشی ہوا۔

مختلف مندروں اور پانچ شالوں کا چکر لگاتے ہوئے اس کی رسائی شامی دربار کے برہمن تک ہو گئی۔ درباری برہمن اب بڑھا ہوا چکا تھا اس کے ہاں صرف ایک لڑکی تھی جو بڑی حیزی سے بچپن کی منہ لیس طے کرتی ہوئی جوانی کی دایوں میں داخل ہو رہی تھی۔ چاند کی

یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کا عہد تھا۔ شاہی محل کے توشہ خانے کا سارا مال اسی بنے کی معرفت منگایا جاتا تھا وہ اپنے پیشے کے اسرار و رموز کی بہت گہداشت کرتا تھا۔ مگر چاند کو کتنی اور دیا انداز ملازم سمجھ کر اس نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا مثلاً ہندی میں اگر نصف سے زیادہ اینٹیں پسوا دی جائیں تو ایک چھٹائی تک فی من کے حساب سے پیلا رنگ ضرور ملا لینا چاہئے۔ اگر کسی جس کو توشہ خانے کا داروغہ پسند نہ کرے تو اسے اس کی قیمت کا پانچ فی صدی پیشگی دے دینا چاہئے لیکن مال دیتے وقت وزن بے شک دس فی صد کم ہو کیونکہ ایسی صورت میں داروغہ صاحب مال تولنے میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے عہدہ داروں کی بھی بعض ضروریات ایسی ہوتی ہیں جو ہم لوگوں کی مدد کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں ایسے لوگوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

چاند کا وقت نہایت اطمینان سے گزر رہا تھا کہ ایک دن بنے کو خرید و فروخت کے سلسلے میں باہر جانا پڑا اس کی عدم موجودگی میں باہر سے کافی مقدار میں گھی آ گیا۔ کارندوں کو غالباً اس کا دھڑلہ ہو گیا تھا کہ بنیا ان ایام میں لکھنؤ سے باہر ہو گا انہوں نے گھی میں پچاس فیصد ملاوٹ کر دی۔ چاند اس ملاوٹ شدہ گھی کو بچان نہ سکا اور اپنے گودام میں اس نے بھی حسب معمول گھی کی مقدار کے برابر اس میں ملاوٹ کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح سے جو مواد تیار ہوا اس میں خالص گھی کس قدر تھا اس کے اندازے کے لئے اس عہد میں کوئی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

بد قسمتی سے یہی مواد توشہ خانہ سے ہوتا ہوا شاہی دسترخوان پر پہنچ گیا۔ توشہ خانے کا داروغہ تو ملازمت سے برخاستگی پر ہی چھوٹ گیا مگر بنے کے لئے سزائے قید اور سب جائداد کے بحق سرکار ضبط ہونے کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ بنیا ابھی لکھنؤ تک نہ پہنچا تھا کہ سرکاری کارندے

ذہانت، دیانت اور محنت نے برہمن کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ اس نے نہ صرف اسے گوہر تعلیم سے مالا مال کیا بلکہ خاندان داد بنا کر اپنے گھر رکھ لیا۔

چاند اب قسمت کی بلند یوں پر تھا۔ اس کے ایام نہایت اطمینان اور فراغت سے بسر ہو رہے تھے۔ اسے اگر کوئی دکھ تھا تو یہ تھا کہ وہ غریب چمار اور پتھارن جنہوں نے اسے کمال محنت اور شفقت سے پالا تھا اس کی دولت میں کسی طرح حصہ دار نہ ہو سکتے تھے وہ انہیں باآسانی ہلا سکتا تھا یا درپہ بذریعہ ڈاک یا کسی اور واسطہ سے ارسال کر سکتا تھا مگر اس طرح راز افشا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اگر یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ نقلی برہمن تھا یا اس کی پرورش چماروں کے گھر ہوئی تھی تو مہاراجہ کا غضب نہ صرف اسے بلکہ اس کے سسرال کو بھی تباہ و برباد کر دیتا۔

وہ اسی فکر میں تھا کہ اس نے ایک دن ایک بڑے چمار کو بازار میں "جوتا، بوٹ مرمت" کی صدا لگاتے ہوئے سنا۔ اسے اس کی آواز آشنا معلوم ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو گنگا دین تھا۔ "ارے یہ کیا غضب ہوا" وہ دیکھ کر گھبرا گیا مگر اس نے میں گنگا دین بھی اسے پہچان چکا تھا۔ چاند اسے ایک طرف لے گیا۔ شاہی برہمن کے داماد کا ایک پتھار سے گفتگو کرنا بہت معیوب امر تھا مگر مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے وہ اسے ساتھ لے کر شہر سے باہر نکل آیا۔ خیریت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ لیلادتی کا انتقال ہو چکا ہے اور گنگا دین کی دکان تباہ ہو جانے کا وجہ سے وہ اب شہر شہر گھوم کر جوتے مرمت کر کے روٹی کھاتا ہے اور ساتھ ساتھ چاند کی تلاش بھی کرتا ہے۔

اتنے میں وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ چاند نے گنگا دین کو وہاں بٹھایا اور کہا کہ وہ اپنے چماروں والے تمام ہتھیار دریا میں پھینک دے اور غسل کرے۔ اتنے میں وہ نئے کپڑے لے کر واپس آ جائے گا جنہیں پہن کر گنگا دین اپنے سہمیوں کے گھر چلے اور اپنی بہو کو آشیر باد

دے۔ پروگرام کے مطابق چاند نے کپڑے لے کر دریا پر پہنچا اور دیکھا کہ گنگا دین نہا چکا ہے اور تھوڑے سے دھامکے اور ایک طلا چڑھانے اور ہار یک سلائی کرنے والی کنڈی کے سوا تمام ہتھیار دریا میں پھینک چکا ہے۔ چاند نے اسے نئے کپڑے پہنائے اور پوچھا کہ یہ کنڈی اور دھا کہ کیوں دریا میں پھینکنے سے گریز کیا گیا ہے۔ گنگا دین نے کہا کہ غلطی سے رو گئے ہیں اور وہ جلد ہی پھینک دے گا لیکن کپڑے بدلتے ہوئے گنگا دین نے کنڈی اور دھا کہ گجری کے پلو میں چھپائے۔ عمر بھر کی رفیق اشیاء کی جدائی اسے ناقابل برداشت معلوم ہوئی۔

کپڑے بدل کر گنگا دین نے ماتھے پر تلک لگایا۔ چاند نے اسے غور سے دیکھا تو شکل و صورت اور انداز میں عام برہمنوں سے مختلف نہ پایا۔ کی صرف دریا کی تھی۔ اس کا یہ حل تلاش کیا کہ سوائے آشیرباد کی قسم کے عام الفاظ سے گفتگو آگے نہ بڑھنے پایا کرے اور یہ مشہور کر دیا جائے کہ سوائی جی گزشتہ کئی برس سے صرف گیان دھیان میں مگن رہتے ہیں اور کسی سے بلاوجہ اشد ضرورت گفتگو نہیں فرماتے۔

گنگا دین اپنے نئے مذہب میں بظاہر مطمئن معلوم ہوتا تھا مگر اس کے دل میں خطرات کا بے پناہ سمندر موجزن تھا۔ وہ تمام عمر برہمنوں کی ہمسائیگی میں رہ کر اور ان کے جوتے بلا اجرت مرمت کر کے بھی ان کی ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکا تھا اور آج وہ شاہی برہمن کے ہاں بطور سہمی کے جا رہا تھا۔ بھگوان اس کی اس جرأت کی کیا سزا دیں گے آئندہ جہنم میں اسے کون سی جون نصیب ہوگی اور اگر مجید کمل گیا تو اسی جہنم میں جو سلوک اس کے ساتھ ہوگا وہ آئندہ جہنم میں کتنے کا رہپ اختیار کرنے سے بھی کم نہ ہوگا۔ اس نے چاہا کہ وہ چاند سے معذرت کرے بلکہ اسے بھی ان خطرات سے نکال کر

اپنے ساتھ لے جائے۔  
میں تھے مگر سہمی اس قدر جلد انہیں اجازت دینے پر تیار نہ تھے۔

ایک دن جبکہ چاند کسی ضروری کام سے باہر گیا وہ تھا، اس کی بیوی جو خود اپنے ہاتھ سے سر کو کھانا پکا کر پیش کرنے میں اپنی سعادت سمجھتی تھی اپنے بیاہ کا سنہرا جوتا جس کی زہ سے تھوڑا سا حصہ پینا ہوا تھا اس کے کمرے میں بھول آئی اور پھر اپنے گھریلو کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ گنگا دین نے دیکھا کہ کتنا قیمتی جوتا معمولی سی لاپرواہی سے خراب ہو رہا ہے اس نے ادھر ادھر دیکھ کر یقین کر لیا کہ کوئی آدمی اس کی طرف متوجہ نہیں پھر آہستگی سے جوتا اٹھایا اپنی پجڑی میں سے کنڈی اور دھاگہ نکالا اور اسے مرمت کرنا شروع کر دیا۔

بہو کو کام کے دوران میں جوئے کا خیال آیا اور وہ دوڑی ہوئی اس کے کمرے میں آئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بنارس کے سواری جی نہایت اطمینان اور بے خیالی سے مرمت میں مصروف ہیں۔ کیا اس کی شادی ایک چار سے ہوئی ہے؟ یہ خیال ایک بجلی بن کر اس پر گرا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

بچ بن کر گنگا دین اس کی طرف متوجہ ہوا اور کنڈی دھاگہ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑے۔ دوسری طرف لڑکی کے والدین روزے روزے اسے دیکھنے کے لئے آگئے کہ اس پر کیا آفت آئی ہے اور صورت حال سے آگاہ ہو کر اسے علیحدہ لے گئے۔ اسے میں چاند بھی آگیا۔ اسے بھی صورت حال سے آگاہ کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ یہ راز افشا ہونے پر نہ صرف چاند اور اس کے والد کو عبرت ناک عذاب میں مبتلا کر کے قتل کیا جائے گا بلکہ باقی خاندان کے افراد بھی محفوظ نہ رہیں گے کیونکہ چاند کا دھبہ سے شاہی مندر اور درباری رسوم گاہ بھر شٹ ہو چکے ہیں۔

اس دردناک عذاب سے بچنے کے لئے صرف یہی

وہ ابھی اسی وقتی نگاہ میں تھا کہ چاند کے چند دوست راستے میں مل گئے اس نے کہا۔ ”پتا جی میرے دوستوں کو آشیر باد دیجئے۔“ اور گنگا دین نے طوطے کی طرح آشیر باد کا جملہ دہراتے ہوئے سب کے سر پر باری باری ہاتھ پھیر کر چپ ہو گیا۔ چاند نے جلدی سے کہا کہ پتا جی ایک عرصہ سے خاموش گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں اس لئے گفتگو سے انہیں پریشان نہ کیا جائے۔ گنگا دین دل میں سوچ رہا تھا کہ اس پر کلمہ آفت چھو کرے کی وجہ سے عجب مصیبت میں مبتلا ہوا اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ کنہت یہاں برہمن کے روپ میں ہے تو اسے پہچان کر بھی نظر انداز کر دیتا۔

چند گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ شاعری برہمن کے محل میں داخل ہو گئے جو شاہی محکمات کی مسابگت میں تھا۔ چاند نے اپنے پتا جی کی آمد کا اعلان کیا تو سب سے پہلے اس کی بہو نے دوڑ کر اپنے سر کے قدموں پر پرنام کیا۔ گنگا دین نے رلے ہوئے جیلے کو ڈھرایا اور پھر خاندان کے دیگر افراد سے ملا۔ چاند نے پتا جی کے گیان اور دھیان کا ذکر فلسفیانہ انداز میں کیا اور اس طرح گنگا دین کو مزید گفتگو کی رحمت سے بچالیا۔ اپنی مالاؤں میں سے ایک مالا اس کے حوالے کرتے ہوئے چاند نے اسے ایک علیحدہ کمرہ میں بٹھا دیا جہاں وہ مالا سرن کے ساتھ اپنے ہونٹ اپنے قدیم ہمسائے برہمن کی طرح ہلاتا رہتا۔

دن گزرتے گئے نئے بناری برہمن کے درشن کے لئے شہر کے عقیدہ مندوں کا ہجوم روزانہ جمع ہو جاتا بعض صرف درشن پر نل جاتے۔ بعض مرادیں مانگتے اور نذرانے پیش کرتے۔ سواری جی مہاراج کی خاموشی اور چپ کے برت نے سب کو متاثر اور خود سواری جی کو سخت پریشان کر رکھا تھا اور وہ وہاں سے جان بچا کر وہاں کی مگر

نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ شرجی آپ اس دور بار کے قدیم تنگ خوار اور مذہبی برہمن ہیں۔ وہ کون سی ایسی خطا آپ سے سرزد ہو گئی ہے کہ آپ جان کی امان مانگتے ہیں۔ آپ یقین رکھئے کہ آپ کی خطا خواہ کتنی ہی بڑی ہوگی آپ کو معاف کر دیا جائے گا۔ آپ خواہ مخواہ شرمندہ نہ کریں اور ان وجوہات سے آگاہ کریں جس کی بنا پر اس دور بار سے تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہوئے۔

برہمن نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضور میں برہمن نہیں ہوں بلکہ میرا تعلق سالی نام کے ایک خانہ بدوش قبیلہ سے ہے۔ میں چھوٹی عمر میں اپنے قبیلہ سے جدا ہو کر ایک برہمن کے ہاتھ آ گیا تھا۔ جس نے میری داستان مصیبت سن کر مجھے نہ صرف اپنے گھر میں پناہ دی بلکہ اپنے بچوں کے ساتھ مجھے تعلیم سے بھی بہرہ ور کیا۔ میں جب جوان ہوا تو آپ کے دربار میں حاضر ہو کر ملازمت سے بہرہ یاب ہوا۔ میرا یہ فریب آپ تک منکشف نہ ہوا اور میں نہایت فراغت سے اپنا وقت کاٹتا رہا لیکن باپ کو ایک دن ضرور ظاہر ہونا تھا اور اس کا ذریعہ میرا داماد ہوا جسے میں نے برہمن سمجھ کر اپنا لیا مگر حقیقت میں چھار لکھا۔ میرا گناہ معمولی نہیں لیکن اگر حسب وعدہ حضور میری اور میرے ہال بچوں کی جان بخش فرمائیں تو میں ان کو لے کر اس ریاست سے باہر نکل جاؤں گا اور کوئی مزدوری یا تجارت کر کے اپنا پیٹ پال لوں گا۔

برہمن کی داستان سن کر مہاراجہ نے غضب میں آنے کی بجائے زور کا قبضہ لگایا اور کہا کہ اے بے وقوف میں ذات کا چرنگ ہوں۔ ایثار نے حکومت دی ہے تو بھگتے کیوں ہو اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کئے جاؤ بھگوان جسے جیسا چاہتے ہیں بتا دیتے ہیں۔ ان کی لیلیا اپرم اپار ہے۔



صورت تھی کہ رات کی تاریکی کا سہارا لے کر سارا کنبہ شہر سے نکل جائے کیونکہ یہ راز زیادہ عرصہ تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وجہ سے ضرور افشا ہوگا۔ بہتر ہے کہ اس شہر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا جائے اور اس ریاست سے دور کسی دوسری ریاست میں جا کر تجارت کو ذریعہ معاش بنایا جائے اس کے سوا دوسری صورت ممکن نہ تھی۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ رات کی سیاہی میں گھر کے سب افراد مع چاند اور گنگا دین کے بھرا ہوا گھر چھوڑ کر صرف نقدی اور زیورات وغیرہ لے کر شہر سے باہر نکل گئے۔

دوسرے دن جب برہمن پوچا پاٹ کی شاہی رسوم سے غیر حاضر ہوا تو اس کا پتہ کر دیا گیا معلوم ہوا کہ رات سے مکان کھلا پڑا ہے اور گھر کے سب افراد غائب ہیں۔ مہاراجہ نے یہ سمجھ کر کہا کہ انہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے احکام جاری کر دیئے کہ برہمن اور اس کے کنبہ کو تلاش کر کے دربار میں حاضر کیا جائے کیونکہ مہاراجہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا قدیم درباری برہمن اس سے ناراض ہو کر کسی اور ریاست میں چلا جائے۔

شاہی سوار ہر سمت روانہ ہوئے اور تیسرے دن برہمن کو مہاراجہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

مہاراجہ نے برہمن سے بھاگ جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے علیحدگی میں عرض حال کی منظوری چاہی درخواست منظور ہوئی اور مہاراجہ دربار برخواست کر کے برہمن کو ہمراہ لے کر محل میں چلا گیا۔

تہائی پا کر برہمن نے عرض کیا کہ حضور! اگر جان کی امان پاؤں تو اپنے گناہ کا کچا چٹھا کھول کر سناؤں۔ میری خطا اس قابل نہیں کہ حضور معاف فرمائیں مگر قدیم تنگ خوار کی بنا پر رحم و کرم کا منتھی ہوں۔

مہاراجہ کے دل میں برہمن کا بے حد احترام تھا اس

## بھارتی وزیراعظم مودی کا دورہ کشمیر

☆ ..... 0345-8599944, 0301-3003908 ..... کھوار اختر کاشمیری

بھارت اس وقت دنیا میں اسلئے کاسب سے بڑا خریدار ہے اور حال ہی میں مودی نے اسلئے بنانے کے لئے غیر ملکی کمپنیوں کو مالکانہ حقوق پر سرمایہ کاری کی پیشکش کی ہے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق بھارت امریکہ سے بحری جہاز شکن ہارپون میزائل خرید رہا ہے۔ بھارت کے ان اقدامات کی وجہ سے چین ایران اور پاکستان کو بھی اپنے دفاعی اخراجات میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ بھارت اس وقت جنگی جٹوں میں جتا ہے جو پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

نریندر مودی نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز بھی جموں سے کیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے جموں کے قریب کڑہ کے مقام پر ٹرین سروں کے افتتاح اور مظفر آباد سری نگر شاہراہ پر جنگ بندی لائن کے قریب اوڑی بجلی پروجیکٹ کے دوسرے فیز کے افتتاح سے ترقیاتی مہم شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کڑہ کی اہمیت اس لئے ہے یہاں ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے۔ "مانا دشنو پوری" کی پوجا کے لئے تقریباً سالانہ ایک کروڑ ہندو یہاں آتے ہیں۔ یہ سب بھارت میں جن سنگھیوں کو مطمئن کرنے کے لئے ہے۔ اوڑی بجلی پروجیکٹ بھارت لے دے جائے

وزیراعظم نریندر مودی نے مورخہ 4 جولائی 2014ء کو مقبوضہ جموں و کشمیر کا دورہ کیا۔ کشمیر کے دونوں اطراف اس دن کشمیریوں نے ہڑتال کر کے اپنی لڑت کا اظہار کیا اور اس دن کو یوم سیاہ کے طور پر منایا۔ کشمیریوں کی جانب سے اس طرح کے اقدامات کا مقصد نریندر مودی کو حق خود ارادیت کا حق ہاور کرنا تھا اور کشمیریوں پر ظلم و ستم کے واقعات کو روکنا ہے۔ کشمیری عوام نے مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر دونوں اطراف بھارتی وزیراعظم کی آمد پر جو کیا یہ ان کا جمہوری حق تھا۔ نریندر مودی کو ان کی صدا پر کان دھرنا فرق ہے لیکن بی بی جے پی کے عزائم سب پر عیاں ہیں۔ مودی کشمیر کو ہندو مسلم میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ وہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ بھی چاہتے ہیں۔ وہ یہاں کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ان سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ کیا نریندر مودی برسرِ اقتدار ہونے کے بعد اپنے آپ پر لگے انتہا پسندی کے داغ دھو سکیں گے؟ لیکن یہ تصور غلط ثابت ہو رہا ہے۔ نریندر مودی ہر طرف ٹیش قدمی کر رہا ہے۔ وہ ہر محاذ پر جارحیت دکھا رہا ہے۔ چاہے وہ کشمیر کا محاذ ہو یا لائن آف کنٹرول کا اسلئے خریدنے کا ہو۔

یہ لوگ بھارت میں تحریک آزادی کے خلاف استعمال ہوئے۔ دنیا بھر کے سفارت خانوں میں انہیں بھیجا گیا تاکہ یہ کشمیر میں مسلح جدوجہد اور پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کر سکیں۔ یہاں تک کہ اسلام آباد میں بھی یہ قیادت رہے ہیں۔ نریندر مودی کشمیر کو ہندو مسلم میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ یکساں سول کوڈ کا نفاذ ان کا مقصد ہے جبکہ ان کے سیاسی عزائم بھی ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے عی بی ہے پی اقتدار میں آ سکی ہے۔

نریندر مودی نے گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور پارٹی میں جگہ بنائی۔ ایل کے ایڈوانی اور مرلی منوہر جوشی جیسے کٹر انتہا پسندوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اس لئے وہ کشمیر میں بھی نیا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ ہندو اور مسلم کیونٹی کو تقسیم کرنے اور لڑانے کا کھیل ان کا پسندیدہ شغل ہے۔ بھارتی وزیراعظم کا دورہ کشمیر کے وسائل کے لوٹنے کی بھی ایک کڑی ہے۔ کشمیر اندھیرے میں ہے اور یہاں پیدا ہونے والی بجلی بھارتی ریاستوں کو سپلائی کی جاتی ہے۔ ریلوے لنک کے لئے بھی مقاصد ہیں، ریلوے کے ذریعے ہندوؤں کو "دیشنوری" کی پوجا کے لئے آنے والے ہندوؤں کو سہولت دینے کے لئے بچھائی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ جموں کو اننگ ریاست بنادینے کا اور لدراخ کو براہ راست دہلی کے انتظام میں دینے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے لئے بھارت نواز کشمیری عمر عبداللہ، محبوب مفتی جیسے لوگ بھی استعمال ہوں گے۔

کشمیر میں آزادی پسندوں کی

جائیدادوں کی ضبطگی

پرانے دور میں بادشاہ اپنے مخالفین کے عزیز و

جہلم پر جاری کیا ہے۔ یہاں سے بجلی پیدا کرنے کے لئے بھارت کے کارڈرن گراڈ میں شامل کی جاتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پروجیکٹ کی سویش کمپنی سکسکا اور ایک برطانوی کمپنی 1984ء میں تعمیر کا آغاز کیا جبکہ اسی دوران سویش کمپنی سکسکا نے آزاد کشمیر کی داوی لیلیم میں جاگراں بجلی گھر بھی تعمیر کیا جو جگ بندی لائن کے بالکل قریب ہے۔ اوڑی پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے بعد اس کا دوسرا فیز شروع کیا گیا جو 16 سال میں مکمل ہوا ہے۔ وزیراعظم نریندر مودی نے اسی کا افتتاح کیا ہے۔ اس کی بجلی کشمیر کو نہیں بلکہ بھارت کو وقف کی ہے۔ مقبوضہ اور آزاد کشمیر میں دو مختلف بجلی گھر روپ کی ایک ہی کمپنی کی جانب سے تعمیر ہوئے ہیں۔ نریندر مودی نے اس حالت میں کشمیر کا دورہ کیا ہے جب جگ بندی لائن پر بھارتی فوج قازم کر رہی تھی۔ اس سے آزاد کشمیر کے شہری زخمی ہو رہے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں پوری ریاست میں ہڑتال رہی مگر جموں میں ہندوؤں نے زبردست استقبال کیا۔

داوی کشمیر اور آزاد کشمیر میں یوم سیاہ منایا گیا۔ کشمیری بی جے پی کے عزائم سے خوب واقف ہیں یہ ہندو انتہا پسندی کا مرکز ہیں یہی وجہ ہے کہ بی جے پی کشمیر میں پھڑتوں کے لئے الگ شہر بنا رہی ہے۔ یہ پھڑت 1988ء میں مسلح جدوجہد کے آغاز میں اس وقت کے انتہا پسند گورنر جگ موہن کی ہدایت پر کشمیر سے بھاگ کر بھارتی ریاستوں میں چلے گئے تھے۔ جگ موہن کا ارادہ ایک بڑے آپریشن کا تھا جس طرح شمالی وزیرستان سے آپریشن سے قبل لوگوں کو نکالا گیا ہے اسی طرح مقبوضہ کشمیر میں کسی بڑے آپریشن سے قبل صرف ہندو آبادی کو نکالا گیا تھا۔ راتوں رات انہیں لڑکوں پر لا کر جموں پہنچایا گیا۔

انہوں نے اپنے مسلم پڑوسیوں کو بھی آگاہ نہ کیا۔

تھا۔ ان کو حزب المجاہدین سے وابستہ مجاہدین کو پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ عوام کے بھرپور احتجاج پر اس وقت کے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ کو یہ مکان مالکان کو واپس گزار کرنا پڑا۔ فاروق عبداللہ کو عوامی رد عمل سے بچنے کے لئے اس کارروائی کو پولیس کے کھاتے میں ڈالنا پڑا اور تجلیات کا حکم دیا جو آج چودہ سال گزرنے پر بھی مکمل نہ ہوئی۔

جون 2012ء کو سی پولیس نے سوپور کے واقع علاقہ میں حزب المجاہدین سے تعلق کے الزام میں عبدالرزاق اور ان کے بیٹے عبدالحمید لون سمیت آزادی پسند لوگوں کے باغات اور چدرہ کنال اراضی پر قبضہ کر لیا جبکہ عبدالرزاق کی کار بھی ضبط کر لی۔ اس کے خلاف عمر عبداللہ کی حکومت کے خلاف شدید احتجاج ہوا۔ اس رد عمل کی وجہ سے کشمیر میں عمر عبداللہ کی حکومت نے وقتی طور پر آزادی پسندوں، مجاہدین اور ان کے رشتہ داروں کے مکان باغات اور زمینیں ضبط کرنی ترک کر دیں۔ یہ زمینیں پوٹا جیسے کالے قانون کی زد سے ضبط کی گئیں۔ یہ غیر قانونی سرگرمیوں سے بھاؤ کا ایکٹ ہے۔ اس کے تحت وقت کی حکومت اور فوج کو مخالفین کو جھکنے پر مجبور کرنا تھا۔

2001ء میں پوٹا قانون نافذ ہوا تھا لیکن آج یہ سلا موقع ہے مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے بھارت کی پیشکش ایٹمی جنس ایجنسی (NIC) کے حکم پر حکومت نے ایک مجاہد تنظیم سے وابستہ ایک مجاہد کے اہل خانہ کے نام پر رزرو زمین کو ضبط کر لیا ہے۔ (NIC) نام نہاد بھی حملے کے بعد تشکیل دی گئی تھی۔ اس نے مقبوضہ کشمیر کے علاقہ پہلگام کے غلام نبی خان عرف سیف اللہ خالد اور عامر خان ولد غلام رسول خان کو مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل کیا۔ اس بھارتی خفیہ ایجنسی نے نام نہاد عدالتیں بھی قائم کیں۔

اقارب کو انتقام کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں گرفتار کرتے تھے۔ کبھی قتل کروا دیتے تھے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جاتی تھیں، ان کی فصلیں جلا دی جاتی تھیں اور ان جائیدادوں پر قبضہ کر لیا جاتا تھا۔ یہ جنگ کا قانون مقبوضہ کشمیر میں آج بھر نافذ کر دیا گیا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کرنے والے مجاہدین کے رشتہ داروں کی زمینیں اور ان کے مکان بحق سرکار ضبط ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے حریت کالٹرس (گیلانی) کے رہنما اور چھٹا لیگ کے سربراہ غلام محمد خان سوپوری کا مکان سر بھر کر دیا گیا۔ (D.G.P) کلبہ بپ کھودا کے حکم پر یہ کارروائی کشمیر پولیس نے کی۔

یہ 30 جون 2012ء کا واقعہ ہے سری نگر کے ماتمہ کالونی نئی پورہ علاقے میں پولیس نے غلام محمد خان کے اہل خانہ کو زبردستی گھر سے باہر نکال کر اس کو سر بھر کر دیا۔ پولیس نے پہلے نہ کوئی گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا اور نہ مہلت دی۔ ان پر حرکت جہاد اسلامی کے ساتھ تعاون کرنے کا الزام لگایا۔ پولیس کے اس اقدام کو ظالمانہ قرار دیا گیا، اس کی مزاحمت کی گئی۔ یہ اصل میں ریاست کی حکومت کا حکم تھا۔ اگرچہ یہ زمین مرلے کا مکان سوپوری صاحب کی اہلیہ کے نام پر تھا لیکن اسے ضبط کر لیا گیا یہ مکان 1997ء میں بنایا گیا تھا ان کا آبائی علاقہ سوپور ہے جہاں ان کا مکان اور دکانیں جلا دیے گئے تھے۔ انہیں ہراساں کیا گیا ان کو جیلوں اور اذیت خالوں میں تار چڑھایا گیا۔ اسی وجہ سے اس خاندان نے روز بروز کے چھاپوں اور گرفتاریوں سے بچنے کے لئے سوپور سے سکونت ترک کر کے عمر بھر کی پونجی سے یہ ایک منزلہ مکان بنایا تھا جو حکومت نے ضبط کر لیا۔

اسی طرح کا دوسرے واقعہ 2001ء میں سری نگر کے ڈاؤن ٹاؤن صفا کدل کے علاقے میں کالے قانون کے تحت ایک مکان کو سر بھر کر دیا گیا۔ یہ غلام محمد ڈار کا مکان

عملی پر تعجب کا اظہار کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ کچن میں استعمال ہونے والے چھری کا سنہ تھے۔

کانگریس ہی کے دور میں مراد آباد ایسے جیل پور اور جشید پور میں مسلم کش فسادات ہوئے، مسلمانوں کی ڈکالوں اور گھروں کو لوٹا گیا اور آگ لگائی گئی۔ جشید پور کے فسادات نے تو کانگریس نواز عبدالغفار خان کو بھی مضطرب کر دیا تھا۔ جب بی بی کے کارکنان نے ہامری مسجد پر حملہ کیا تھا۔ تب کانگریس کی حکومت تھی۔ نریندر ادا اگر چاہتا تو فوج بھیج کر مسجد کا انہدام روک سکتا تھا مگر وہ اس سے سس نہ ہوا۔ نریندر مودی نے 2002ء میں جب گجرات میں مسلم کش فسادات کرائے تب بھی بھارت میں کانگریس کی حکومت تھی اور اہم ترین بات یہ کہ مسئلہ کشمیر سمیت پاکستان کے خلاف تمام مسائل کانگریس نے پیدا کئے جس میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ساری منصوبہ بندی کانگریس کے دور میں ہوئی۔

1965ء میں پاک بھارت جنگ بھی کانگریس کے دور میں ہوئی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سیکر جماعت کہتے تھے۔ "حکایت" میں تحریک پاکستان کے دور کے ہزاروں واقعات لکھے گئے دیگر رسائل "اردو ڈائجسٹ"، "سیارہ ڈائجسٹ"، "قومی ڈائجسٹ" اور دیگر اخبارات اس وقت کے ہندو مظالم سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ سب کانگریس کے دور کے واقعات ہیں جو اپنے آپ کو سیکر کہتے تھے۔ مگر بی بی کے نریندر مودی نے تو ہندوستان میں مسلم دشمنی سے شہرت پائی ہے۔ ہندو قوم پرستی اور ہندو مذہبی شخص رکھنے والے نریندر مودی کے حوالے سے اگر بعض لوگوں میں تشویش انگیز خدشات جنم لیں تو یہ غیر فطری بات نہیں ہے۔ نریندر مودی کے شدت پسندانہ رجحانات اور ہندو تعصب خطے میں عدم استحکام اور جنوبی ایشیا میں امن کے لئے شدید خطرات کو جنم دے سکتے ہیں۔

نخستین انجمنی کے حکم پر ہی عامر خان کی اہلیہ کے نام پر 9 کنال اراضی مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے سرکاری تحویل میں لے لی جبکہ پہلنگام میں امرنا تھ یا تروہ پر بھارتی حکومت کی طرف سے بھارتی شہریوں کو لیز پر زمینیں الاٹ کی جا رہی ہیں۔ یہ اس علاقہ سے مقامی آبادی کو زبردستی بے دخل کرنے کا آغاز ہے۔ عامر خان کو اس علاقہ میں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عامر خان کے کم سن تیرہ سالہ بیٹے کو بھارتی فورسز نے گرفتار کر کے انٹرویویشن سینٹر میں تشویش کے دوران شہید کر دیا تھا لیکن عامر خان نے سر نہ کیا۔

بھارتی حکومت اور اس کی کٹھ پتلی ریاستی انتظامیہ نے بھائی کے بدلے بھائی اور باپ کے بدلے بیٹے کو گرفتار کیا۔ بچوں اور عزت آئب خواتین کو بھی نہ بخشا گیا لیکن اس سارے دباؤ کے بعد بھی کسی نے سر نہ کیا تو حکومت نے ایک بار پھر جائیدادیں ضبط کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ قاروق عبداللہ کی حکومت بھارتی قوانین کو کشمیر میں نافذ کر کے دلہہ 370 کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔

### نریندر مودی ایک انتہا پسند لیڈر

ہوں تو پاکستان کی مخالفت میں کانگریس بھی کم نہیں رہی، مسئلہ کشمیر جو اہل نہرو نے پیدا کیا۔ مہاراجہ کو قبائلیوں سے ڈرا کر کشمیر کے عارضی الحاق کی دستاویز پر نہرو نے ہی دستخط کرائے تھے۔ 1947ء میں ہی اس وقت کے وزیر داخلہ سردار دلہ بھائی پٹیل اور وزیر دفاع نے دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بے بسی کا ڈرامہ رچایا۔ مسلمانوں پر فساد کے لئے اسلحہ جمع کرنے کا الزام لگایا اور جو اسلحہ برآمد کیا گیا اس پر خود انہراے لاڈر ماؤنٹ مشن نے کہا تھا کہ اگر مسلمان اس اسلحہ سے لڑنا چاہتے ہیں تو ان کی جنگی حکمت

نہیں چاہتا کہ مودی اقتدار میں آئے۔ عالمی برادری بھی مودی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے قاتل کی حیثیت سے جانتی ہے۔

543 رکنی بھارتی لوک سبھا میں 34 فیصد ممبران سنگین جرائم میں ملوث ہیں۔ بی جے پی کے کل ممبران کی ایک تہائی تعداد نو جداری مقدمات میں ملوث ہے۔ اس طرح کابینہ میں بھی اکثریت جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ اس واقعہ لوک سبھا میں کوئی اپوزیشن جماعت نہیں ہے۔ بھارتی آئین کے مطابق اپوزیشن جماعت کے لئے دس فیصد نشستیں جتنی ضروری ہیں اور کانگریس صرف 42 سیٹیں جیت سکی ہے۔ لوک سبھا کے 34 فیصد ارکان پر قتل اقدام قتل فرقہ وارانہ فسادات اور نسل فسادات میں ملوث ہونے کے مقدمات ہیں۔ صوبہ اتر پردیش سے بی جے پی کے 80 ممبر منتخب ہوئے، ان میں سے 28 ارکان مقدمات میں ملوث ہیں 22 پر اغوا قتل اور اقدام قتل جیسے سنگین جرائم ہیں۔

بی جے پی کے 282 نو منتخب ارکان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ کیا ایسی متعصب اور بدکردار لوگوں سے بھری پارلیمنٹ سے امن کی توقع رکھی جاسکتی ہے؟ بڑے انیسویں سے یہ کہا پڑتا ہے کہ ایسے کردار کا وزیراعظم جس کی اٹھان ہی پاکستان کی مخالفت پر ہوئی ہے ہمارے امن کی آشار رکھنے والے میڈیا والے بھی اپنے بھارتی آقاؤں اور مغربی آقاؤں سے مل کر پاکستانی انواع اور آئی ایس آئی کو بدنام کر کے خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

بھارتی میڈیا نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو دہشت گردی کا اڈا ثابت کرنے میں پورا زور لگا رکھا ہے۔ کرل مہتا، کرل آرائس سنگھ، جی ڈی بخش، جنرل اجیت سنگھ اور راجیو دگر نے ہندوستانی ٹی وی چینل پر حامد میر اور جیو چینل کے خلاف کارروائی کو براہ راست انواع پاکستان اور آئی ایس آئی سے جوڑ

نریندر مودی نے ایکشن جیتنے کے لئے پاکستان مخالف پمپنکس ماریں۔ انہوں نے کہا تھا کہ بھارت کو مطلوب واؤڈ ایما جیم کو اسامہ بن لادن کو اٹھانے کی طرز کا ایکشن کر کے بھارت لے آؤں گا۔ شیو سینا، بجرنگ دل اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی انتہا پسند تنظیمیں اتحادی جماعتوں کی حیثیت سے بھارت میں مسلمانوں کی تصویر کے مطالبات نہیں کریں گی؟ اس نے جو کچھ گجرات میں کیا تھا۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حکومت میں وہ سرحد پار ”دہشت گردی“ کے نام پر اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرے گا۔ وہ کسی بھی وقت آزاد کشمیر پر محدود حملے شروع کر داسکتا ہے۔ گجرات کے متعصب اور خوفناک مودی نے لٹکار کہا تھا۔ ”ہم نے چڑیاں نہیں بہن رکھی ہیں۔“ اس کے بعد گجرات میں ایسے خونی فسادات پھوٹ پڑے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

گجرات کی حکومت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 790 مسلمانوں کو ذبح کر کے گرون انگ کر دی گئی تھی، 2500 کو شدید زخمی کیا گیا۔ ایک لاکھ مسلمان اپنے گھر بھرے گھر چھوڑ کے جانے پر مجبور ہوئے۔ بی جے پی کے جتنوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے گھروں، دکانوں اور جائیداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ گجرات چیمبر آف کامرس کے مطابق گجرات کے مسلمانوں کے 110 ارب روپے کے کاروبار کو طے کا ڈھیر بھا دیا گیا تھا۔ اس دوران پولیس مسلمانوں کو تحفظ دینے کے بجائے بلوائیوں کی مدد کرتی رہی۔ بہار میں بی جے پی کے ایک امیدوار راج سنگھ نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بھارت میں جو بھی دہشت گرد گرفتار ہوتا ہے وہ مسلمان ہی ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا۔ جو مودی کو دہشت گرد نہیں دے گا اس کو پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ پاکستان

ہم مطمئن نہیں ہیں۔ ان منصوبہ سازوں کے خلاف کارروائی کی یقین دہانی کرائی جائے۔  
(3) ان کے ماحرہ لوگوں کی واپس سہیل یعنی ان کی آواز کے نمونے مہیا کئے جائیں۔

کاش مہاں صاحب ان کو بھارت کی اعلیٰ عدلیہ میں ان کی سیکرٹ سرورس کے ایڈیشنل سیکرٹری کا حلف نامہ دکھاتے جس میں اس نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں خود سیکرٹ سرورس کو گواہ اور بھیجی کے واقعات کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ کاش ہندوستان سے سمجھوتہ ایکسپریس کو تباہ کرنے والے کرل پروبت جس نے Cr4 مقبوضہ کشمیر سے چوری کر کے ٹرین کو تباہ کیا تھا جس میں 50 پاکستانی مارے گئے تھے۔ اس پر بات کی ہوتی یا کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کو بے گناہ شہید کرنے پر بات کی ہوتی۔ کاش کشمیر قیادت سے چند منٹ ہی بات کر لی ہوتی جو صرف ان کی ملاقات کے لئے کشمیر سے پاکستانی ہائی کمیشن میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ نواز شریف صاحب نے نہ تو کشمیر پر بات کی اور نہ ہی بلوچستان میں بھارتی مداخلت پر بات کی۔ ان حقائق کی روشنی میں کوئی غلط فہمی میں نہ رہے کہ ہندوستان میں نریندر مودی جیسے مسلم دشمن کی حکومت کے دور میں دوستی ہوگی یا امن کی آشا چلے گی یا امن قائم رہے گا۔

حکومت پاکستان کو فوری طور پر ہنگامی بنیادوں پر کام کر کے آزاد کشمیر پر ممکنہ حملے یا کسی بڑی کارروائی کو روکنے کی منصوبہ بندی کرنی چاہئے۔

مجاہدین کشمیر جن کو نریندر مودی پاکستان کی ریزرو فورس قرار دیتا ہے، ان کی امداد کرنی چاہئے اور ان کے ہاتھ ہتھیار کھول دیئے جائیں تاکہ وہ ثابت کر دیں کہ وہ واقعی پاکستان کی ریزرو فورس ہیں۔



دیا۔ انہوں نے حوالہ دیا کہ جیو نے خود کہا ہے کہ یہ ساری کارروائی جنرل ظہیر اسلام نے کروائی ہے۔ بھارتی میڈیا نے نواز شریف کو امن کا داعی اور پاک فوج کو امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ اور جیو گروپ اس لئے ان کا نشانہ بنے ہیں کیوں کہ وہ امن کی آشا کی بات کرتے ہیں اور افواج پاکستان کے علم اور زیادتیوں کی بات کرتے ہیں۔

کیا پاکستانی میڈیا بھارتی کردار کو واضح کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھارت کے کردار پر بات نہیں کر سکتا؟

بلوچستان اور کراچی کے حالات میں بھارتی مداخلت بھارتی اسلحہ اور سامان سپاہی جماعتوں کے دفاتر سے پکڑا جاتا ہے اس کو ہمارا میڈیا بھارتی اسلحہ کی بجائے غیر ملکی اسلحہ کہتے ہیں۔ افغانستان میں بھارتی تو نفعیت کے کردار کو ہمارا میڈیا کیوں اجاگر نہیں کرتا؟ ہم ماضی کو دفن کرنے اور مودی کے کردار کو زندہ کرنے اور احکامات دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ بھارتی میڈیا جمہوریت کے مقابلے میں افواج پاکستان کو من مانی کرنے والی قوت قرار دینے میں پورا زور لگا رہا ہے جبکہ ہندوستان نے آج کشمیر کا خصوصی درجہ ختم کرنے پر کام شروع کر رکھا ہے۔ ہم لوگ اس پر حیران ہیں کہ وزیراعظم نواز شریف ہندوستان سے اتنے دبے ہوئے کیوں ہیں۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ وزیراعظم نواز شریف ہندوستان سے جنگ کی باتیں کریں مگر ایک ایسی ملک کا وزیراعظم بھارت جا کر فقط چارج شیٹ حاصل کرتا ہے جس کے تین نکات درج ذیل تھے:

(1) کراس بارڈر دہشت گردی روکیں اور جس طرح اندر کمال گجراں سے تعاون کیا تھا اسی طرح کا تعاون کریں۔ کشمیری مجاہدین کی حمایت سے باز رہیں۔

(2) بمبئی حملے میں ملوث افراد کی پیش رفت سے



## دھوپ کے پچھلے تنگ

اُس سر پھرے کی کہانی جو اندھیر گہری میں اُجالا کرنے نکلا تھا۔

امجد جاوید



قسط: 8



سوہنے نے خوشگوار انداز میں اپنی رائے دی۔  
 ”اوچا چا کوئی خدا کا خوف کرو۔ اسے برس ہو گئے  
 چوہدریوں نے یہ سکول نہیں کھلنے دیا۔ اب گاؤں میں ایک  
 نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ تھنٹی تو کسی نئے لساد کی  
 آواز ہے۔“ حنیف دوکاندار نے خوف زدہ ہوتے ہوئے  
 کہا تو چاچا سوہنا بولا۔

”کس، بالکل نہیں۔ یہ شرکی نہیں، خبر کی آواز  
 ہے۔ تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ چوہدری کون ہوتے  
 ہیں، ان معصوم بچوں کو ان کے حق سے محروم کرنے  
 والے۔“

”یہ بھی فہد کی نئی شرارت ہے۔ دیکھنا اب خون  
 خرابہ ہوگا۔ یہ بند کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے نہیں دے  
 رہا۔ جب سے یہ گاؤں میں آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی فساد ہی  
 پڑا رہتا ہے۔“ حنیف دوکاندار نے کہا۔

”وہ تم جیسے بے غمیروں کو تنہو رہا ہے کہ فہد سے  
 اٹھو اور اپنا حق پہچانو۔ وہ ظالموں کو لٹکا رہا ہے مگر ظالم  
 بجائے اس کا سامنا کرنے کے کمزوروں پر ہاتھ اٹھا رہے  
 ہیں اور کمزور خواہ مخواہ خوف سے دبے جا رہے ہیں۔ یہ  
 تہدیلی ہے۔ اب وقت نہ بدلا تو کبھی نہیں بدلے گا۔“

چاچے سوہنے نے اسے حقارت سے کہا  
 ”یہ تیرے جیسے چند بے عقل اُسے فہد دے رہے  
 ہیں۔ اس وقت تمہارا پتہ بھی نہیں چننا جب چوہدری اپنی  
 آئی پر آگئے۔“ حنیف دوکاندار نے ڈرایا تو چاچا سوہنا  
 بولا۔

”تو آجائیں نا اپنی آئی پر، بس نے روکا ہے، فہد کا  
 سامنا کرتے ہوئے کیوں ڈرتے ہیں۔ سکول حل گیا  
 ہے۔ اب اس میں بچے پڑھیں گے۔ اب چوہدری جو  
 مرضی کر لیں یہ بند نہیں ہوگا۔“

”دیکھو کیا ہوتا ہے، سکول بند ہوتا ہے یا اس کے  
 کھولنے والے۔“ حنیف دوکاندار کہتے ہوئے خاموش

والوں سے ملنے کے بعد فہد اپنی کار میں سلیکی کے  
 ٹاور گھر پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے کر سکول کے  
 سامنے جا پہنچا۔ جہاں کبھی وہ پڑھا تھا۔ ایک لمحے کے  
 لئے اس کے دل میں نہیں اٹھی۔ ماضی اسے اپنی پیٹ  
 میں لے لینا چاہتا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔  
 اس نے دیکھا سکول کی عمارت پر رنگ آلود تالا پڑا ہوا  
 تھا۔ فہد کی گاڑی وہاں آ کر رکی اور اس میں سے فہد اور  
 سلیکی باہر آ گئے۔ انہی لمحات میں اطراف میں سے سراج  
 اور چھٹا کا ٹکڑے۔ سراج کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کے  
 ساتھ کافی سارے اسلحہ بردار لوگ تھے۔ سلیکی بہت جذباتی  
 ہو رہی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو رواں تھے۔ فہد نے کار  
 میں سے اتھوڑا نکالا۔ وہ ہاتھ میں اتھوڑا لئے آگے بڑھا  
 اور تالے پر ضرب لگانے لگا۔ تالا ٹوٹ گیا تو فہد نے سلیکی  
 کو ساتھ لیا اور سکول میں داخل ہو گیا۔ چھا کا اور سراج ان  
 کے ساتھ تھے۔ اندر جا کر انہوں نے تھنٹی لی اور سلیکی کے  
 ہاتھ میں دے دی۔ سلیکی اس تھنٹی کو اپنے ہاتھ میں لئے چند  
 لمحے دیکھتی رہی۔ پھر بڑے جذباتی انداز میں تھنٹی بجانے  
 لگی۔ ایک ضرب، دوسری ضرب تیسری ضرب۔

تھنٹی کی آواز پورے قسمت گھر میں پھیل گئی۔ لوگ  
 چونک اٹھے۔ سکول بیل بج رہی تھی۔ گھر، بازار، گلی،  
 کھیت، راستے سب جگہ آواز سنی جا رہی تھی۔ لوگ حیران  
 ہو کر ن رہے تھے۔ ماسٹر دین محمد وہ آواز دہی مسکراہٹ  
 سے بول کر رہا تھا جیسے کوئی نغمہ ہو۔ چوراسے میں بھی  
 سکول کی تھنٹی سنائی دے رہی تھی۔ حنیف دوکاندار اور چاچا  
 سوہنا بھی سن رہے تھے۔

حنیف دوکاندار نے حیران کن انداز میں پوچھا۔  
 ”یہ ہمارے گاؤں کے سکول کی تھنٹی بج رہی ہے  
 نا؟“

”حقیقت تو یہی ہے حنیف، بلکہ یہ قسمت گھر کی  
 بدلتی ہوئی قسمت کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔“ چاچے

”ہم اس کا سہارا ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جتنا مرضی وہ اس پر دباؤ ڈالیں۔ صنفی نہیں مانے گی۔ وہ ان کے لالچ میں بھی نہیں آئے گی۔“

”کسی کا کیا اعتبار افرض کیا وہ لالچ یا دباؤ میں آ جاتی ہے تو ہم اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ جبکہ چوہدری تو ہر ممکن کوشش کریں گے نامعاملہ اس کے بیٹے کا ہے۔ اب معاملہ صنفیہ پر ہے۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ حالات کا رخ موڑ سکتا ہے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو فہد بولا

”آپ ٹھیک کہتے ہیں استاد جی، میں مان لیتا ہوں کہ وہ لالچ یا دباؤ میں آ کر اپنا فیصلہ تبدیل کرے گی۔ تو پھر کیا ہوا۔ چوہدری کے ساتھ ہمارے حالات تو ویسے ہی رہیں گے۔ اور اگر دشمنی برپا ہوتی ہے تو پھر بڑھ جائے۔“

”لہاجی! آپ گھبرا نہیں مت۔ میں ابھی اس سے ملتی ہوں۔ اسے حوصلہ دوں گی۔ جس طرح کا سہارا چاہے گی میں اسے دوں گی۔“ سلمیٰ نے کہا تو ماسٹر دین محمد پوچھا۔

”کیا سہارا دوں گی۔ کیا دے سکتی ہوں۔ چوہدری تو اسے روپے پیسے اور زمین کا لالچ دے رہے ہیں۔ تم کیا دے سکتی ہو۔ کیا ہے تمہارے پاس؟“

”کیا نہیں ہے سلمیٰ کے پاس استاد جی۔ مگر روپیہ پیسہ زمین سب کچھ ہے سلمیٰ کے پاس۔“

اس کے یوں کہنے پر ماسٹر دین محمد چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”میں تو اپنی رائے دے رہا تھا۔ باقی تم لوگ جانو کہ کیا فیصلہ کرتے ہو۔“

”آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری ساری کوششوں کا محور فقط صنفیہ نہیں ہے اور بہت کچھ ہے۔“ فہد نے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا۔

”تم جو بہتر سمجھتے ہو کرو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اب ناراض ہیں؟“ فہد نے اچانک پوچھا تو

ہو گیا اور پینٹ کراہی دوکان کی طرف چلا گیا۔

سکول کی گھنٹی بج رہی تھی اور اس وقت تک بجتی رہی جب تک سارے قسمت مگر نے نہ سن لیا۔

فہد اور ماسٹر کھانا کھا چکے تو سلمیٰ چائے کا گلاسے کر آئی اور پھر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ بھی ماسٹر دین محمد نے کہا

”سکول کا کالا تو زودیا ہے تم لوگوں نے، ایک خواب تھا وہ پورا ہو گیا، لیکن یہ چوہدری اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔ وہ ضرور۔۔۔“

”سکول کا کالا توڑنے سے پہلے میں نے سب سوچ لیا تھا اور اس کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں میں نے محکمہ تعلیم کے آفیسرز سے بھی بات کر لی ہے۔ بلکہ آج کل میں آپ کے پٹن کیس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ آپ بس دیکھیں، ان چوہدریوں کی بے بسی۔ اب آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ فہد نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا

”فہد پترا! اب تشویش والی بات یہ ہے اگر صنفیہ فکر مگنی تو اب تک جو تمہاری کوششیں ہیں۔ وہ سب نایاں جائیں گی۔ دشمنی بھی بڑھ جائے گی۔ یہ تم لوگوں کو پہلے سوچنا چاہئے تھا نا کہ اس کا اثر و سورت بہت زیادہ ہے۔“

”بات اثر و سورت کی نہیں اور نہ ہی دشمنی کی ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر صنفیہ دباؤ میں آ کر ان کی بات مان لیتی ہے تو پھر چوہدری کے جبر کا جال تو زنا مشکل ہو جائے گا لیکن یہ ناممکن تو پھر بھی نہیں ہے۔“ فہد نے سنجیدگی سے کہا

”میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں فہد! اس قدر مشکل حالات میں بھی تم حوصلہ نہیں ہارے ہو۔ جبکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے جتنا کہ بندہ اپنی لڑائی توڑ سکتا ہے۔ کسی کی لڑائی کیا لڑے۔ اب صنفیہ جیسی کمزور عورت ان کا دباؤ کب تک برداشت کرے گی۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سلمیٰ بولی۔

گے۔ اور اس کے لئے جا ہے جو بھی کرنا پڑے۔ ظاہر ہے اسے سیاسی ایجنڈا نہیں کے تو ہی اس مظلوم عورت کی فریاد سنی جائے گی۔"

"اسے قانونی مدد بھی تو فراہم کرنی ہے۔" فہد نے یاد دلایا تو ملک نعیم نے کہا۔۔

"میں ہوں نا۔ اس میں جو خرچ وغیرہ ہوگا، وہ میں کروں گا۔ آپ کو اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہترین وکیلوں کی مدد لیں گے۔"

"چلیں یہ تو طے ہو گیا۔ اس کے علاوہ جو آپ کہیں میں حاضر ہوں۔" فہد نے خوش ہوتے ہوئے کہا

"میں تو یہاں تک سوچ رہا ہوں کہ یہاں لوگوں کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع دوں تاکہ وہ ساری زندگی کمی کم نہ رہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جائیں۔" ملک نعیم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"میں بھی اس سچ پر سوچ رہا ہوں دیکھیں، جاگیر دار ہونا سرمایہ دار دونوں کو اپنے منافع سے غرض ہے۔ لیکن مزدور کو وہ فائدہ کہاں ہے، روزگار کے مواقع کون پیدا کرتا ہے؟" فہد نے بھی اپنا خیال بتایا تو ملک نعیم بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات، فہد آپ ملے ہونا تو مجھے ہی توانائی مل گئی ہے۔ اس علاقے کا سیاسی سینٹ اپ بھی نئے سرے سے دیکھیں گے۔ ظاہر ہے، کچھ وقت بعد ہم نے الیکشن میں تو جانا ہی ہے۔ اس وقت تک ہمیں سیاسی طور پر مضبوط ہونا ہے۔"

"عوام اب ہاشور ہے ملک صاحب! عوامی فائدے کی بات تو بہت ہوتی ہے لیکن عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا عوام اب تنگ آ گئے ہیں ان خالی خولی وعدوں سے اب وقت آ گیا ہے کہ ان کے لئے کچھ کرنا ہوگا ورنہ آپ اور ہم انقلاب کی چاب تو سن رہے ہیں۔" فہد نے اسے آلے والے وقت کا احساس دلایا۔

"بالکل! جب پہنچیں۔ اس انقلاب کے بعد جو

ماسٹر دین محمد نے جلدی سے کہا۔

"او نہیں چترا میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ میں آئندہ آلے والے حالات کی سختی سے آگاہ کر رہا تھا۔"

اس پر فہد نے اپنے استاد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حوصلہ مند لہجے میں کہا

"آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔"

ماسٹر دین محمد نے اپنا سر ہلایا تو فہد اٹھ کر چل دیا۔ جہاں ملک نعیم اس کے انتظار میں تھا۔

فہد اور ملک نعیم دونوں کمرے میں خوشگوار موڈ میں بہت دیر تک عطا کرتے اور اس کی صوت حال پر باتیں کرتے رہے۔ تبھی ملک نعیم نے کہا۔۔

"آپ سے اتنی ڈھیر سے ساری باتیں کر کے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ خیر! باتیں اور ملاقاتیں تو اب ہوتی رہیں گی۔"

"کیوں نہیں ملک صاحب! آج جیسا سیاسی بندہ سیاست کے بغیر بھلا کہاں رہ سکتا ہے اور پھر جدوجہد تو اس جاگیر دار کے خلاف ہے جس نے جبر سے علاقے پر حکمرانی کر رکھی ہے۔ میرا مقصد تو اس جبر کے خلاف لڑنا ہے۔" فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا تو ملک نعیم صاف انداز میں بولا۔

"سیاست یا الیکشن جیتنا ہی میرا مقصد نہیں ہے مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ میں نے پہلے بھی اپنی بساط مطابق کوشش کی تھی، اب بھی کر رہا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔" فہد نے زوردار لہجے میں کہا تو ملک نعیم حتی لہجے میں بولا۔۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ نذیر کا خون مایاں نہیں جائے گا۔ ہم اس مظلوم عورت کی ہر ممکن مدد کریں

ایک معمولی عورت ہمارے سامنے آکھڑی ہوگی۔ اور وہ ہماری مجبوری بن جائے گی۔" چوہدری جلال نے کہا۔  
"میں نے وکیل کی ساری باتیں سن لی تھیں۔  
چوہدری صاحب اس سے پہلے کہ حالات مزید ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ ہمیں انہیں سنبھالنا ہوگا۔ منیہ اگر مان جاتی ہے تو پھر معاملہ ختم ہو سکتا ہے؟" بشری بیگم بولی

"مشکل تو یہی ہے۔ وہ ہمارے مخالفین کے ہاتھوں میں ہے۔ معاملہ اگر اپنے ہی علاقے میں رہتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن مخالفین اسے بہت دور تک لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کے اثرات ٹھیک نہیں ہوں گے۔"  
چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا  
"کیا فہد اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ آپ اسے نہیں روک پارہے ہیں؟" اس نے تشویش سے پوچھا  
تو چوہدری جلال نے غصے سے کہا۔

"فہد اسے تو میں ابھی ایک چوڑی کی طرح مسل دوں لیکن اس وقت وہ ایسی عورت کے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ جیسے وہ مظلوم بننے پر تیار ہے۔ اگر اس وقت اسے کچھ کہتے ہیں تو وہ ابھی مظلوم بن جائے گا۔"

"لے دے کر بات منیہ پر ہی آن گئی ہے نا چوہدری صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ میں چل جاتی ہوں اس کے پاس۔" بشری بیگم نے مان سے کہا تو چوہدری جلال نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ابھی ہم پر ایسا وقت نہیں آیا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کیا میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ اپنے معاملات کے لئے تمہیں کسی کے پاس بھیجوں۔ نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"چوہدری صاحب اب معاملہ میرے بیٹے کا بھی ہے۔ میں اگر آپ کی بیوی ہوں تو ایک بیٹے کی ماں بھی

بیٹا اب بنے گا۔ اس میں ہم کہاں ہوں گے۔ یہ شاید ہم ابھی سوچ نہیں رہے ہیں۔ خیرانی الحال مجھے اجازت دیں، گاؤں تک پہنچنے کا کافی وقت ہو جائے گا۔ اب ملاقات تو ہوتی رہے گی۔" ملک نعیم نے اجازت چاہی تو فہد خوش دلی سے بولا۔  
"کیوں نہیں ضرور ہوگی ملاقات۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا، پھر ملک نعیم دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ جاتے ہوئے اس کے چہرے پر خاصی خوشی تھی۔

☆.....☆.....☆

حویلی کے ڈرائنگ روم میں بشری بیگم گہری سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے رانی اسے چائے دے گئی تھی جواب تک دیے پڑی تھندی ہو رہی تھی۔ رات کی باتیں اسے بھول نہیں رہی تھیں۔ پہلی بار اس نے چوہدری جلال کو بدلا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ لان میں اکیلا بیٹھا آدانتھا۔

رات چوہدری جلال خواب گاہ میں تھا۔ بشری بیگم نے اس کی محویت دیکھ کر پوچھا۔  
"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"سوچنا کیا بیگم! دنیا داری کے مسائل قھوڑے ہیں۔ ایک کو حل کر دو تو دوسرا سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ ارد گرد پھیلے ہوئے قھوڑے جھنجٹ ہیں۔ ان کے لئے سوچنا تو پڑتا ہے۔" چوہدری جلال نے عجیب سے لہجے میں کہا تو بشری بیگم نے اس کے لہجے پر غور کرتے ہوئے بولی۔

"آپ پہلے کبھی اسے فکر مند دکھائی نہیں دیئے، آپ مجھے مال رہے ہیں؟"

"بیگم! تمہیں معلوم ہی ہے کہ معاملہ کیا چل رہا ہے۔ میں نے کبیر کو بہت سمجھایا کہ حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ مگر وہ ماننا ہی نہیں۔ یہ وقت بھی آنا تھا کہ

ہوں کیا میں اپنے بیٹے کے لئے اتنا بھی حق نہیں رکھتی ہوں کہ اس کے لئے کچھ کر سکوں۔" وہ جذباتی انداز میں بولی تو چوہدری جلال نے کہا۔

"میں ہوں نا۔ اور اس معاملے کو دیکھ رہا ہوں۔ جنہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔"

"جنہیں چوہدری صاحب! مجھے اپنے بیٹے کے لئے ایک کوشش کر لینے دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بھی کوششیں کی ہیں لیکن وہ نہیں مانی میں ایک بار۔۔۔۔۔" بشری بیگم نے کہا چاہا تو چوہدری جلال نے سختی سے کہا۔

"بیگم! تم مجھے مجبور کر رہی ہو۔ مجھے یہ احساس دلا رہی ہو کہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ میں کوشش کر رہا ہوں نا۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان جائے گی۔" بشری بیگم نے بحث کرتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال نے جوتے ہوئے کہا۔

"جنہیں۔ چاہے یقین بھی ہے لیکن میں نے جب کہہ دیا ہے تو بس کہہ دیا اب تم سو جاؤ۔" چوہدری یہ کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بشری بیگم قم زدہ سی کردٹ بدل کر لیٹ گئی۔ وہ تب سے سوچ رہی تھی۔ پھر اسے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ چوہدری جلال باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے رانی کو بلایا اور اسے باہر لان میں چائے لانے کا کہہ کر چوہدری جلال کے پاس جانے کے لئے اٹھ گئی۔

چوہدری جلال اور بشری بیگم لان میں تھے اور رانی انہیں چائے سرو کر رہی تھی۔ بشری بیگم نے ادھر ادھر کی باتوں میں چوہدری جلال کا سوڈا بہتر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایسے میں چوہدری کبیر کی گاڑی پورچ میں آ کر رکی۔ وہ گاڑی میں سے نکلا اور تیزی سے ان کی جانب آ گیا۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے آثار تھے۔ بشری

بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
"آؤ کبیر، چائے پیو گے؟"

چوہدری کبیر نے ماں کی بات سن کر طے میں کہا  
"ہا ہا! پہلے تو فہدیٰ یہاں کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکا تا پھر رہا تھا۔ لیکن اب ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلسلی اور صفیہ دونوں مل کر واضح طور پر ہمارے خلاف اعلان جنگ کر رہی ہیں۔"

اس کے یوں کہنے پر چوہدری جلال اور بشری بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔ چوہدری جلال چند لمحوں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"ہوا کیا کبیر بیٹا۔ کچھ بتاؤ مجھے بھی؟"

"اتنے برس سے جو سکول ہم نے بند کروا دیا ہوا تھا۔ وہ آج سلسلی اور فہدیٰ نے چاکر کھول دیا ہے اور انہوں نے اعلان کیا کہ اب یہ سکول روزانہ کھلے گا۔ پولیس اب کیا کرنا چاہئے؟"

یہ خبر چوہدری جلال کے لئے کسی تازیانے سے کم نہیں تھی، یہ اس کی لڑائی کے لئے بہت بڑا جھٹکا تھا۔ وہ خاموش ہی تھا کہ بشری بیگم نے کہا

"مگر اس میں اتنا غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ حیرے باپا دیکھ لیتے ہیں۔ تم ذرا صبر سے کام لو۔"

"جنہیں بیگم! یہ صبر کرنے والا کام نہیں ہے، سکول کی کھٹی، ہماری شکست کی صدا ہے۔ یہ برداشت نہیں ہوگی۔" چوہدری جلال نے دبے دبے غصے میں کہا تو چوہدری کبیر بولا۔

"اتنے برس سے جو ہمارا رب و دہبہ یہاں کے لوگوں پر طاری ہے، وہ انہوں نے چیلنج کر دیا ہے۔ کب تک انہیں نظر انداز کرتے رہے گے۔"

"سکول چلائے گا کون، ہماری مرضی کے بغیر یہاں عملہ نہیں آسکتا۔ پہلے کیا یہاں عملہ آیا ہے، سب اپنے گھروں میں بیٹھے تنخواہیں لے رہے ہیں۔ میرے

پتھر جہاں تک پہنچ کرنے کی بات ہے، اس کی انہیں سزا جھکتا پڑے گی۔"

"لیکن بابا، انہیں روکنا تو ہوگا؟" چوہدری کبیر نے نصیحت میں کہا۔ پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد بولا۔ "بابا آپ وقت حالات اور سیاست کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ میں آپ کو فقط یہ بتانے آیا ہوں، میں انہیں روکوں گا۔ ابھی اور اسی وقت....."

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتے اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں اس بارے میں سوچو بھی۔" بشری بیگم نے تیزی سے کہا تو چوہدری کبیر نے سنی آن سنی کرتے ہوئے کہا "دن بدن ان کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ کی مصلحت حالات خراب کر رہی ہے، ایک دن سب کچھ اٹھ سے نکل جائے گا۔ میں یہ تمنا نہیں دیکھ سکتا۔"

"تم صرف تمنا نہ دیکھو، کہا نا تمہیں کچھ نہیں کرنا۔" بشری بیگم نے درشتی سے کہا تو چوہدری کبیر نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا اور اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ رات نے کچھ برتن اٹھائے اور وہاں سے چل دی۔

☆.....☆.....☆

شام داخل کر رات میں بدل چکی تھی۔ صبیہ اپنے گھر کے اکلوتے کمرے میں زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا دھیان نہ جانے کہاں تھا۔ اس کے قریب اس کے بچے چار پائی پر پڑے سو رہے تھے۔ وہ شام ہی سے رو رہی تھی۔ ایسا دکھ اس کے اندر سرایت کر گیا تھا کہ آنسو ٹپک ہی نہیں ہو رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ سو جاتی، اس کا دکھ مزید بڑھ جاتا۔ جیسے اس کے اندر سادون برستے برستے رک ہی نہ رہا ہو، انتقام کی آگ ہی اتنی زیادہ تھی۔

دھلتی ہوئی شام کے وقت صبیہ چار پائی پر بیٹھی تھی۔ وہ سوئی سے کوئی کپڑا اسی رہی تھی۔ باہر سے بابا نعمت علی آیا تو وہ اسے دیکھ کر اٹھ گئی۔ بابا خاموشی سے آکر

بیٹھ گیا۔ بھی صبیہ نے دھیرے سے پوچھا۔

"خیر تو ہے بابا! سارا دن کہاں تھے۔ پلٹ کر گھر ہی نہیں آئے؟ کچھ کھایا یا ابھی نہیں ہے منج سے۔"

"کھانا چٹا کیا ہے بیٹی! جب ہر طرف خوف کا اندھیرا چھا جائے تو پھر کھانے پینے کا خیال کہاں رہتا ہے۔ بھوک پیاس تو جیسے اڑ گئی ہے۔ کچھ سوچ سمجھ ہی نہیں آئی۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟" بابا نعمت علی نے بے بسی سے کہا تو صبیہ نے پوچھا۔

"کیا کرنا چاہتا ہے ٹو بابا؟"

"سو دلہہ تمہیں سمجھایا ہے بیٹی۔ ہم غریب لوگ چوہدریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اب تو ہم یہاں سے کہیں اور بھی نہیں جا سکتے کہ چلو اپنی جان بچا کر کسی طرف نکل جائیں۔" بابا نعمت علی رو ہانسا ہوتے ہوئے بولا تو صبیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"لیکن کیا بات ہو گئی ہے بابا۔ ٹو ایسے کیوں سوچ رہا ہے۔"

"میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہا۔ میری اب سوچ کہاں رہی ہے۔ مجھے تو حکم کا پابند کر دیا گیا ہے۔"

بابا نعمت علی نے صاف انداز میں کہہ دیا

"کیسا حکم! ضرور انہوں نے تمہیں ڈرایا دھمکایا ہو گا۔ پر ٹو انہیں بتادے میں مر ٹو سکتی ہوں لیکن میں بدل ضرور لوں گی۔" اس نے صاف کہہ دیا تو بابا نعمت علی نے نصیحت سے کہا۔

"کیسے نے گی بدل، اتنی رقم ہے تیرے پاس جو ٹو خرچ کر سکے، جن لوگوں کے سر پر ٹو بڑی بڑی باتیں کر رہی ہے نا۔ وہ کل تیرے ساتھ نہ رہے ٹو کیا کرے گی۔ کون دے گا اتنی دیر تک تیرا ساتھ، تیرے ساتھ کون تھا نے پچھریوں کے دھکے کھائے گا۔ کل کو جو تو تھک ہار کر چوہدریوں کے سامنے ہاتھ جوڑے گی، اچھا نہیں ہے کہ ٹو آج ان کی بات مان لے۔" بابا نعمت علی نے اسے

سمجھایا تو صنفیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ان کی بات ماننے سے پہلے میں مر جانا قبول کر لوں گی۔“

”تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جا۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اگر ٹوٹیں مانی تا تو پھر.....“ وہ بے بسی سے کہتے ہوئے خاموش ہو گیا تو صنفیہ نے کہا۔

”وہ یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔ جیتے جی تو انہوں نے مجھے اور میرے بچوں کو مار ہی دیا ہے اب جان سے بھی مار دیں۔ میں نہیں ڈرتی ان سے۔“

”دیکھ تو سمجھ جا وہ جو دے رہے ہیں۔ لے کر میرا شکر لے۔ ورنہ بہت بچھتا بنا پڑے گا۔ کیوں غلاب کو دعوت دے رہی ہے۔ کون ہے تیرا جو تجھے سنبھال لے گا۔ اپنے مستقبل کا سوچ، اپنے بچوں کا سوچ۔“ ابا اعلیٰ نے غصے میں کہا اور چار پائی سے اٹھ کر باہر کی طرف نکل گیا۔ صنفیہ ایک دم سے افسردہ ہو گئی۔ اسے کوئی بھی حوصلہ دینے والا نہیں تھا۔ کیا وہ اپنا حق بھی نہیں لے سکتی؟ جس نے جرم کیا، اسی کی طرف داری ہو رہی ہے۔ کیا نظام ہے۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر آلسو تجھے کہ تمہیں کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

رات ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ صنفیہ اپنے کمرے میں افسردہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے بچے سو گئے ہوئے تھے اسنے میں دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا، پھر دروازہ کھولنے کے لئے اٹھی۔ اس نے لائین اٹھائی اور صحن پار کر کے دروازہ کھولا تو سامنے بشری بیگم کو کھڑی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کے ساتھ حویلی کی ایک ملازمہ رانی تھی۔ صنفیہ کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا

”چوہدرانی جی۔ آپ؟“

چوہدرانی نے اس کی طرف دیکھا اور نرم لہجے

میں بولی۔

”اندرا نے کے لئے نہیں کہوں گی صنفیہ؟“

”آں، آڈ آڈ چوہدرانی آڈ۔“ صنفیہ نے کہا اور دروازے میں سے ہٹ گئی۔ چوہدرانی بشری بیگم اندر آ گئی۔ بچے سوئے پڑے تھے۔ وہ دونوں آنسوئے سامنے تھیں اور رانی ایک جانب کھڑی تھی۔ بشری بیگم خاموش تھی

”کہو چوہدرانی جی، کیسے آنا ہوا اور وہ بھی اس وقت؟“ باوجود کوشش کے صنفیہ کے لہجے میں طنز درآیا تھا، اس پر بشری بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔

”رات کے اندھیرے میں کسی کے دروازے پر یا تو کوئی چور جاتا ہے یا پھر بہت مجبور، تمہارے سامنے ایک مجبور ماں کھڑی ہے۔ تم چاہو تو اس کی جھولی بھر سکتی ہو۔“

”چوہدرانی۔ میرا اللہ تو کسی کے ساتھ ہے انصافی نہیں کرتا پھر یہ جھولیاں بھر داتے رہتا، تم لوگوں کا ہی عقیدہ کیوں ہے۔ ہے کوئی اس کا جواب؟“ صنفیہ نے غصے میں پوچھا تو بشری بیگم بولی

”میں مانتی ہوں کہ میرے بچے سے ظلم ہو گیا۔ اس کے لئے میں تمہارے دروازے پر اس لئے چل کر آئی ہوں کہ تم بھی ماں ہو۔ میرے دکھ کو سمجھو گی اور.....“

”میں بھی تو ماں ہوں۔ کیا میرے یہ بچے مٹی کے کھلونے ہیں یا ان میں جان ہی نہیں ہے۔ ان کے سر سے تمہارے بچے نے باپ کا سایہ چھین لیا تو میں ماں ہو کر ان کا دکھ محسوس نہیں کرتی، کیا ہم غریبوں کے جذبات نہیں ہوتے۔ ہم سانس نہیں لیتے، ہمیں دکھ نہیں ہوتا؟“ صنفیہ غصے کی شدت میں کہتی چلی گئی تو بشری بیگم نے اسی نرم لہجے میں کہا۔

”میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں لیکن جو ہونا تھا وہ ہو گیا صنفیہ اب نذیر واپس تو نہیں آئے گا، تم ان بچوں کے مستقبل کے لئے جو مانگو میں دینے کو تیار ہوں بس میرے

بیچے کو معاف کر دو۔“

صبح کے وقت صفیہ چوہے کے پاس بیٹھی آگ  
جلائے کی کوشش کر رہی تھی۔ بھی بابا نعمت علی گھر میں آیا  
اور آتے ہی پوچھا

”صفیہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں رات چوہہ رات آئی  
اور ٹوٹنے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ تیرا دامخ تو نہیں خراب  
ہو گیا۔ جانتی ہو وہ ہمارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟“

”کیا کر سکتے ہیں۔ یہی ناکہ وہ ہمیں مار دیں  
گے تو مار دیں۔ ایسی زندگی جی کر ہم کیا کریں گے۔ جس  
میں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔“ اس نے نفرت سے  
جواب دیا تو بابا نعمت ہلکا

”اصل میں تیرا دامخ خراب کیا ہے ماسٹر دین محمد  
کی بیٹی نے دو کچھ لیتا وہ تیرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ وہ  
خود ساری زندگی چوہہ دہری کے سامنے لادھی سانس نہیں  
لے سکے۔ وہ تیرا کیا ساتھ دیں گے؟“

”جب خون کے رشتے ہی صفیہ ہو جائیں تو پھر کوئی  
ساتھ دے یا نہ دے نذر تیرا بھی تو بیٹا تھا بابا۔ ٹوٹا ان سے  
بدلہ لینے کی بجائے مجھے خوف زدہ کر رہا ہے؟“ صفیہ نے  
جناپا تو بابا نعمت نے سمجھایا۔

”بدلہ تو وہاں لیا جاتا ہے جہاں طاقت ہو۔ ہم بے  
طاقت بے بس لوگ بھلا ان سے کیا بدلہ لے سکتے  
ہیں۔ ہم لوگ تو سکون سے سانس لے لیں یہی قیمت  
ہے۔“

”تو پھر ہمیں بیچے کا بھی کوئی حق نہیں ہے بابا۔“  
صفیہ غصے میں بولی

”لو پہلے ایسی تو نہیں تھی۔ بات مان جایا کرتی  
تھی۔ لیکن جب سے ماسٹر دین محمد کی بیٹی نے تیرا دامخ  
خراب کیا ہے۔ ٹو آگ اگل رہی ہے۔ میری بات مان  
جائیں اس بڑے حبابے میں میری زندگی خراب کر رہی  
ہے۔ مان جا۔ درخت۔۔۔“ وہ غصے میں کہتا ہوا رک گیا۔

”ورنہ کیا بابا تو کہنا کیا چاہتا ہے۔“ وہ ایک دم

”نہیں اتم نہیں دے پاؤ گی اور نہ ہی تمہیں  
ہمارے دکھ کا احساس ہے۔ اگر احساس ہوتا تو میں  
میرے زخموں پر نمک چھڑکنے نہ آ جاتی۔“ وہ انتہائی دکھ  
سے بولی تو بشری بیگم نے مان سے پوچھا۔

”تم مانگ کر تو دیکھو صفیہ! میں دوں گی۔ بولو؟“  
”کیا تم اپنا بیٹا مجھے دے سکتی ہو یا میرے بچوں کی  
طرح اس کے باپ کا سایہ دے سکتی ہو اسے بھی جیم کر  
سکتی ہو۔“ صفیہ نے غصے میں کہا تو بشری بیگم بھی غصے میں  
بولی۔ ”یہ کیا بک رہی ہو؟“

”ابھی تو میں نے بات کی ہے اور چوہہ دہری تم  
اپنے آپ میں نہیں رہی۔ دکھ سکتی ہو میرا؟ تم لوگ کیوں  
نہیں سمجھتے ہو کہ غریب بھی حق پر ہو سکتا ہے۔ تم میرے سر  
کے سائیں کا خون خریدنے آئی ہو۔“ صفیہ نے نفرت  
سے کہا تو بشری بیگم غصے میں بولی۔

”ہوش کی دوا کر صفیہ! تم جس کی زبان بول رہی  
ہو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتی؟“

”کون کسی کو کچھ دے سکتا ہے، ابھی تم نے بھی  
دعویٰ کیا تھا۔ سنو چوہہ دہری! مجھے اس دنیا میں انصاف ملے  
یا نہ ملے لیکن قیامت کے دن تم لوگوں کا گریبان میرے  
ہاتھ میں ہو گا میں اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوا کر رہوں  
گی۔ اس دنیا میں کوشش کروں گی۔ اگلے جہان میرا رب  
مجھے انصاف دے گا۔“ وہ غصے بھرے لہجے میں حیرانہ  
میں بولی تو بشری بیگم نے حقارت سے کہا

”ابھی تم ہوش میں نہیں ہو۔ جب ہوش میں آؤ تو  
میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں تمہارے قصور سے بھی  
زیادہ دے دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے رانی کو چلنے  
کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر کی جانب چلی گئیں تو صفیہ  
بے بس ہو کر رونے لگ گئی۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ  
لگ گئی۔

بڑک اٹھی تو وہ بھی غصے میں بولا۔

"میں یہی کہنا چاہتا ہوں تو اگر میری بات نہیں مانے گی۔ تو پھر تیرا ہمارا تعلق کیا رہ جائے گا۔ تو پھر جہاں جانا چاہئے چلی جا۔"

"بابا! تو کبھی اتنا کمزور تو نہیں تھا۔ میں ان بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔ نہیں رہوں گی، چلی جاؤں گی۔" اس نے بھی کہا

"ہاں ہاں چلی جا ہماری جان تو عذاب میں نہیں رہے گی نا" بابا نعمت نے تنگ آتے ہوئے کہا تو وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔  
"چلی جاؤں گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رو دی۔ بابا چند لمحوں کے لئے ہاتھ مار کر طرف نکل گیا۔ صفیہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

صفیہ اپنے گھر کے مچن میں دھری چار پائی پر بیٹھی رہ رہی تھی۔ ایسے میں سسکی اس کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے دور سے دیکھا اور پریشان ہو گئی۔ وہ اس کے قریب گئی تو صفیہ نے اس کی طرف دیکھا اور مزید شدت سے رونے لگی۔ تب سسکی نے تشویش سے کہا

"کیا ہوا صفیہ! کیوں رو رہی ہو۔ کیوں بکایا مجھے۔ خیریت تو ہے نا۔"

"بابا نے مجھے اس گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا ہے۔" صفیہ نے سسکتے ہوئے کہا اور شدت سے رو پڑی تو سسکی نے چوکتے ہوئے کہا۔ "اُدھ! ادھی ہونا جس کا ڈر تھا۔ پر تم گھبراتی کیوں ہو، کیوں حوصلہ ہار رہی ہو۔ میں ہوں نا۔"

"تم کب تک میرا اور میرے بچوں کا یہ جھگڑا پاؤ گی۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالوں گی لیکن یوں میرے سر سے چھت چھین لی جائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کہاں جاؤں گی؟"

صفیہ نے روتے ہوئے کہا

"تو حوصلہ کر اور چل میرے ساتھ کہتے ہیں، ایک در بند سو در کھلے۔ اپنا سامان اگر لینا چاہتی ہے تو لے لو اور سیدھی میرے پاس آ جا، اپنے بچوں کو لے کر۔ میں تمہارا سہارا ہوں گی۔" سسکی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

"تم کیسے؟" صفیہ نے خیریت سے پوچھا  
"میں نے کہا نا، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ رو نا دھونا بند کر دو اور چلو میرے ساتھ۔" سسکی نے کہا۔

"سسکی! کیا مجھے انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ بابا غصے میں کہہ کر تو گیا ہے۔ شاید اسے اپنے پوتوں کا خیال آ جائے۔ مجھے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا تو سسکی بولی۔

"تم چاہو تو انتظار کر لو مگر ایک دن تجھے اس گھر سے جانا ہوگا۔ یہ چوہدریوں کی ملکیت ہے۔ بہر حال تم جب چاہو اور جس وقت چاہو میرے پاس آ سکتی ہو۔ میں تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھوں گی۔"

"تو پھر میں دیکھ لوں بابا کو؟" صفیہ نے پوچھا۔  
"ہاں دیکھ لو جیسے تمہارا دل چاہے۔" سسکی نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔ صفیہ نے حسرت بھری نگاہوں سے اس گھر کے دروازے پر نگاہ ڈالی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سسکی اسے دلاسا دیتے گئی۔

ماسٹر دین محمد اور فہد دالان میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ فہد نے کہا

"استاد جی۔ آپ ایک دو دن میں تیار رہیں۔ آپ کو میرے ساتھ فوراً پور جانا ہوگا۔ وہ آپ کا ٹکشن کیس منظور ہو گیا ہے۔ وہاں سے چیک لینا ہوگا۔"

"اُدھر۔ میں جانتا ہوں ان جگہ والوں کو اتنی جلدی کہاں وہ چیک دینے والے ہیں۔ ابھی سپینڈ ڈیوٹ نہیں تو لگ ہی جائے گا۔ یہ جگہ فرض شناسی سے کام کریں نا تو اس ملک کے آدمی مسائل خود بخود حل ہو

☆.....☆.....☆

چوہدری کی حویلی میں در آنے والی وہ صبح اتنی خوشگوار نہیں تھی۔ چوہدری جلال گہری سنجیدگی کے ساتھ والاں میں بیٹھا گہری سوچ میں گم تھا۔ چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں بشری بیگم چائے لے کر دیر دیر سے قریب آئی اور میز پر چائے رکھ کر اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سر دلچسپی میں پوچھا۔

"تمہیں جب میں نے ہدکا تھا کہ اس بیچ ذات کی عورت کے پاس نہیں جانا تو پھر تم کیوں گئیں؟"

"چوہدری صاحب! میں نے پہلے ہی آپ سے کہا ہے کہ میں ماں ہوں۔ اور میں اپنے بیٹے کے لئے....."

بشری بیگم نے کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات ٹوک کر بولا۔

"مگر شوہر کی حکم عدولی کر چکی ہو۔ کیا میں سمجھ لوں کہ آپ تمہیں شوہر سے زیادہ اپنا بیٹا عزیز ہو گیا ہے۔ جو کہ واقعی گناہ گار ہے۔"

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی سرباز کہ میں آپ کی حکم عدولی کروں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "مجھے معاف کر دیں۔ پہلی اور آخری بار معاف کر دیں۔"

"تم جانتی ہو بیگم، ان بیچ ذات کے لوگوں کے بارے میں۔ ان لوگوں سے نرم لہجے میں بھی بات کر لو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تمہاری بات نہیں مانی۔" چوہدری جلال نرم پڑتے ہوئے بولا تو بشری بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چائے کی پیالی اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے دماغ میں تو بہت آگ بھری ہوئی ہے۔ وہ کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتی۔"

"وہ اس وقت پوری طرح دشمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسے تمہارے طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن

جانتے۔" ماسٹر دین محمد نے کہا۔ اسی وقت سلسلی باہر گیٹ سے اندر آ گئی۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ قریب آ کر رک گئی تو ماسٹر دین محمد نے اس سے پوچھا۔ "خیر تو تمہیں صاف نے بڑی جلدی میں تمہیں بلایا تھا؟"

"وہ ہالائٹ علی نے اسے اپنے گھر سے گل جانے کو کہا ہے چوہدریوں کی بات نہ مانے پر۔" سلسلی نے اسردگی سے کہا۔

"تو پھر تم نے کیا کہا؟" ماسٹر دین محمد نے پوچھا۔

"میں نے کہا۔ آ جاؤ۔ میرے گھر میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔ آپ کہیں....." یہ کہتے ہوئے اس نے موالیہ اعجاز میں ان دونوں کی طرف دیکھا تو فہم لے تیزی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ وہ جب بھی آئے تم اسے چاہے عمر حیات کے گھر ٹھہرا دو۔ اگر وہ وہاں خطرہ محسوس کرے تو یہاں۔ جیسا تم چاہو۔"

"اب اگر اس کی ذمہ داری لی ہے تو پوری طرح سے نبھانا۔ یاد رکھنا، اس کے آنے کے ساتھ تمہیں دکھ اور پریشانیاں بھی مل سکتی ہیں۔" ماسٹر دین محمد نے سمجھایا۔

"مجھے احساس ہے لما جی، میں نے یہ ذمہ داری صرف ایک مظلوم کا ساتھ دینے کے لئے لی ہے۔" سلسلی نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے سکون سے حاصل دیا۔

"تو پھر ٹھہرانا نہیں، وہ اوپر والا جیسا ساتھ ضرور دے گا۔"

"آپ نے چائے وغیرہ پی، میں لادوں؟" سلسلی نے پوچھا تو فہم نے کہا۔

"نہیں! ضرورت نہیں۔ میں بھی ذرا سراج کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے استراحتی لے مجھے بلوا لیا۔ اچھا، میں اب چلتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چل دیا۔ سلسلی نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔

لئے فہد اور اس کے ساتھ بندے بھی موجود ہیں۔" ماکے نے بتایا تو چوہدری کبیر نے چوکتے ہوئے پوچھا۔ "کتنے بندے لے پھرتے ہیں؟"

"تھوڑے سے ہیں۔" ماکے نے بتایا۔  
"آخر ہے، جتنے بھی ہوں۔ تیاری کرو سکول تو بند ہونا ہی ہے۔ آج اس فہد کی زندگی کی کتاب بھی بند کر دیتے ہیں۔ دیکھتا ہوں کون سکول چلاتا ہے؟" چوہدری کبیر نے طے میں کہا تو ماکھا بولا۔  
"جو حکم چوہدری صاحب۔"

چوہدری کبیر کا ریڈور سے نکلا، میز پر پڑے ہوئے سے ریوالتور نکالا اور پھر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ چوہدری کبیر نے گاڑی سٹارٹ کر لی۔ اس دوران اس کے ملازمین بھی ایک دوسری جیب میں بیٹھنے لگے۔ ایسے میں ڈیرے کے پھاٹک میں گاڑی آ کر رک گئی۔ اس میں سے ٹشی نے نکل کر سوپ انداز میں وردا نہ کھولا۔ تو بشری بیگم ہاہر نکل آئی۔ چوہدری کبیر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ وہ حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے جلدی میں اپنی گاڑی میں سے باہر آ کر فیسے میں اپنی ماں سے بولا۔

"آج تک حویلی کی کوئی عورت ڈیرے پر نہیں آئی۔ یہ بات آپ جانتی ہو ماں، ایسا کیا ہو گیا ماں ک....."

"کہاں جا رہا ہے تو؟" بشری بیگم نے پوچھا۔  
"جن لوگوں نے سکول کھولا ہے نا انہیں سبق دینے جا رہا ہوں۔" چوہدری کبیر نے طنز یہ لہجے میں کہا تو بشری بیگم سکون سے بولی۔

"محل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔"  
"او کیا ہو گیا ہے ماں، میں کوئی کچ کی گولیاں کھینے نہیں جا رہا۔ میرا راستہ مت روک۔" چوہدری کبیر نے احتجاجاً کہا تو بشری بیگم ہنسی سکون سے بولی۔  
"میں تیری گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں۔ تو چاہے تو

نہیں جانتے۔ ان کا سامنا کس سے ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔" چوہدری جلال نے حقارت سے کہا اور پیالی پکڑ لی۔

"کہیں میرے بیٹے کبیر کو کچھ....." بشری بیگم نے جان بوجھ کر فخر اور احموراء چھوڑ دیا۔

"میرا بھی وہ بیٹا ہے اگر اسے کچھ ہوتا ہے تو پھر ہماری سیاست کا کیا فائدہ؟ میں تو ان کی اچھل کود دیکھ رہا ہوں۔ کبیر محفوظ ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کی پیالی اٹھالی اور پکا سب لیا۔ بشری بیگم حسرت و اس سے اپنے شوہر کی جانب دیکھتی رہی، جو سوچ میں کھویا ہوا سب لے رہا تھا۔  
بشری بیگم نے چوکتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہے میرا کبیر وہ حویلی میں تو نہیں ہے۔"  
"ڈیرے پر ہے بلوا لوارے، اگر بلا سکتی ہو تو، کیونکہ آج سکول کی ٹشی پھر بجے گی اور وہ لوگ یہ ٹشی پونجی نہیں بھارے ہیں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا، وہ نہیں مان رہا۔" چوہدری نے بے بسی سے کہا۔

"مطلب، دشمن یہ چاہتے ہیں کہ تصادم ہو اور....." بشری بیگم نے کہا اور پریشانی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی، چوہدری جلال نے پیالی واپس میز پر رکھ دی۔

چوہدری کبیر خطرناکی انداز میں ڈیرے کے کو ریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور غصے کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس نے ماکھا آگیا تو چوہدری کبیر نے پوچھا۔

"ہاں بول ماکھے، کیا خبر ہے۔ آج بھی انہوں نے سکول کھولنا ہے یا پھر بس تالا توڑنے ہی کا شوق تھا اور ایک دن ہی گھنٹیاں بجا کر غائب ہو گئے؟"

"نہیں چوہدری صاحب، سلی کچھ بچوں کے ساتھ سکول کی طرف ہی جا رہی ہے اور اس کی حفاظت کے

جہاں کی جگہ اے ایسی پی آ رہا ہے اس کا موڑ کوئی آپ کے حق میں نہیں لگتا۔ وہ سیدھے سیدھے فہد کی بات کرتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے جو ہداری صاحب، کیا ملک نعیم، انتظامی طور پر اتنی اپروچ رکھتا ہے؟" وکیل نے سمجھا تو جو ہداری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"لگتا نہیں ہے کہ وہ اتنی اپروچ رکھتا ہوگا۔"

"نہیں آپ یقین سے بات کریں۔" وکیل نے پوچھا۔

"نہیں، نہ اس کی اہمیت ہے اور نہ اس کے اس قدر تعلقات ہیں۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا تو وکیل بولا

"تو پھر سوچئے جو ہداری صاحب، کہیں آپ سیاسی طور پر ناکام تو نہیں ہو رہے؟ آپ کا اثر و رسوخ کدھر گیا؟ یا پھر مان لیں کہ ملک نعیم اپروچ رکھتا ہے اور وہ سیاسی طور پر مضبوط ہو گیا ہے۔"

"میرا ذہن نہیں مانتا کہ وہ اتنا بڑا کھیل، کھیل سکتا ہے۔ جہاں دشمن کی کنزرویٹو اور خاموشی پر نظر رکھی جانی ہے، وہاں اس کی خوبیوں پر بھی نگاہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی اہمیت نہیں کر سکتا۔" جو ہداری جلال حتمی لہجے میں بولا۔

"کیا وہ اہمیت کر بھی نہیں سکتا؟" وکیل نے پوچھا۔

"اگر اس نے حوصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کا راستہ روکنا بہت ضروری ہوگا۔" اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"کب راستہ مدد کیں گے آپ جب اس کے مہرے مضبوط ہو کر آپ کو شہید مات دینے کے لئے آپ کے سر پر آنکھیں مل گئے؟" وکیل نے کہا تو جو ہداری کبیر تڑپ کر بولا۔

"بابا، اجازت دیں ملک نعیم کا ہی پتہ صاف کر دیجئے ہیں سارے مہرے خود ہی پٹ جائیں گے۔"

"پتہ صاف کر دینا بہت آسان ہوتا ہے کئے جو ہداری جی۔ مگر پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، یہ احساس ہوگا آپ کو۔ میں کبھی بھی یہ مشورہ نہیں دوں گا۔"

مجھے سکول نے جایا داپس حویلی۔ میں نے میرے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اب تجھے کوئی خون نہیں کرسنے دوں گی۔"

وہ اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے جو ہداری کبیر کی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ وہ بے بسی میں چھ لکے سوچتا رہا پھر ملازمین کو داپس جانے کا اشارہ کر کے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

حویلی کے ڈرائیونگ روم میں جو ہداری جلال، وکیل اور جو ہداری کبیر تینوں صوفوں پر بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔

منشی کھڑا تھا۔ جو ہداری کبیر غصے میں کہہ رہا تھا۔

"بابا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ جو اچانک یہاں تماشے ہونا شروع ہو گئے ہیں، یہ کوئی فہد کا کمال نہیں بلکہ اس کے پیچھے ملک نعیم ہے۔ وہی سب کچھ کروا رہا ہے۔"

"نکے جو ہداری جی آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟ یا فقط آپ کا اندازہ ہے؟" وکیل نے پوچھا۔

"دوسری بار الیکشن ہارنے کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گیا اور ہم نے اس کی خاموشی کو نظر انداز کر دیا مگر وہ اندر ہی اندر ہمارے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صفیہ کے لئے اس نے پریس کانفرنس کر دی تو وہ کھل کر سامنے آیا۔ اب وہ ہا قاعدہ فہد سے مل کر گیا ہے۔ یہاں اس گاڑی میں آکر، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"یہ ثبوت نہیں ہیں نکے جو ہداری صاحب۔" وکیل نے کہا تو جو ہداری جلال بولا۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب۔"

"ذرا غور کریں جو ہداری صاحب، ریونیو آفیسر نے فہد کے حق میں فیصلہ دیا تو آپ نے اس کا تدارک کروا دیا۔ ڈی ایس پی کا تدارک کروا گیا، اس نے سیاسی دباؤ برداشت نہیں کیا۔ مطلب آپ کی بات نہیں مانی اور

"میں ٹھیک ہوں، سن اتے، سن اتے، ایک کام لگا، ہے۔"

"کام، کیسا کام؟" اس نے پوچھا۔

"کو ہے کہ نہ حویلی آیا ہے، اور نہ ڈیرے پر، اور نہ ہی تو فون پر مٹا ہے۔ لگتا ہے نئے اے ایس پی نے جھ سے کوئی زیادہ ہی کام لینا شروع کر دیا ہے۔" منشی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو تھانیدار چڑھتے ہوئے بولا۔

"اویئے کام کیا منشی، اس نے ایس پی نے تو پڑھنے پادیا ہے۔ یہ پہلا انفر ہے جس کی ابھی تک مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اور جس دن اس کی مجھے سمجھ آگئی اس کی ساری انفری گھما کر رکھ دوں گا۔ خیر، کام بول۔"

"کام یہ ہے کہ وہ جو چھما کا ہے نا، اسے کچھ دن اس طرح اندر رکھنا ہے کہ وہ باہر نہ آ پائے۔ بس اتنا سا کام ہے، جو ٹوٹنے کرنا ہے۔" منشی نے بتایا۔

"کچھ دن، مطلب؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، اگر بات نہیں مانتا تو پھر اسے لٹا بیچ دے مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" منشی نے کہا۔

"اویئے مدعا کیا ڈالنا ہے اس پر؟ دیکھتے تھے پتہ ہے نئے انفر کا، جو کام بھی ہوتا ہے وہ پھر پکا ہی ہوتا ہے۔" تھانیدار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں کون سا کہہ رہا ہوں کہ ڈکچا کام کر۔ کام تو پکا ہی ہوتا جائیے۔ وہ خود کو چشم دید گواہ بنائے پھرتا ہے نا نذیر کا۔" منشی نے اسے سمجھایا تو تھانیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اویئے ایک تو یہ چشم دید گواہوں نے میری مت مار دی ہے۔ دیے چوہدری کبیر کو بھی چاہیے کہ اتھ بولا رکھے وہ بھی نا۔"

"اویئے وہ بھلے لوگ جانے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چھما کے پر جو مدعا ڈالنا ہے اور جیسے ڈالنا ہے وہ بتا دیتا میں سارا ہندوستان کروں گا۔" منشی نے اس کی بات نظر انداز

دیکھنے سے کہا تو چوہدری کبیر انتہائی طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تو پھر کیا کریں دیکھل صاحب، اب ان کی منت تو کرنے سے رہے۔"

"یہ وقت جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ کچھ لو کچھ دو کا اصول اپنا کر سیاست کریں۔ علاقے کے لوگوں کو اعتماد میں لیں۔ ان پر نوزائشیں کریں۔ ڈرمانے دھمکانے کی بجائے ان کو یہ باور کرائیں کہ آپ ان کے اہل ہیں۔

ان کے چھوٹے چھوٹے کام کروادیں۔ اپنی سیاسی جماعت میں اثر و رسوخ بڑھائیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر چوہدری جلال کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ نے ساری زندگی سیاست کی ہے کیا آپ نہیں جانتے؟"

"میں تو جانتا ہوں دیکھل صاحب، لیکن کبیر کو کون سمجھائے۔ یہ جو چند لوگ یہاں کھیل تماشے کر رہے ہیں ان کی کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔ بس اصل وجہ تک پہنچنا ہے۔ اس کی سمجھ آگئی تو یہ سب خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

چوہدری جلال نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"یہی بات اس وقت سمجھ آئے گی جب یہ نئے چوہدری سیاست سیکھیں گے تو پتہ چلے گا۔" دیکھل نے سمجھایا تو چوہدری جلال بولا۔

"وہ تو میں نے آپ سے کہا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ باقی میں سب دیکھ لوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے منشی کی طرف دیکھ کے پوچھا۔

"دیکھو کھانا لگ گیا ہے؟"

"جی لگ گیا ہے، آپ آئیں۔"

اس نے کہا تو سبھی اٹھ گئے تو منشی فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تھانے کے نمبر ڈائل کئے اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار نے فون اٹھالیا۔ اس نے منشی کو پہچانتے ہوئے پوچھا۔

"اویئے منشی جی کیا حال ہے تیرا؟ کیسے کیا فون؟"

”تو پھر اور کیا کروں میں۔ اس صفیہ کو منانے مگنی تھی لیکن اس نے تو کوئی اُمید بھی نہیں چھوڑی۔“ بشری بیگم نے حسرت سے کہا۔ اس دوران چوہدری کبیر نے کمرے میں آتے ہوئے اپنی ماں کی بات سن لی۔ تبھی اس نے وہ دے دے غصے میں کہا

”آپ نے وہاں جا کر اچھا نہیں کیا ماں! نہیں جانا چاہئے تھا وہاں۔“

”تم! میں تو اس کے پاس.....! بشری بیگم نے چونک کر کہا تو چوہدری کبیر حقارت سے بولا۔

”یہ ہماری شان اور مرتبے کے خلاف ہے کہ آپ اس کی کمین عورت کے دروازے پر چل کر مگنی ہو۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا پولیس پکڑ کر لے جاتی مجھے ہزارا جاتی۔ میں مر جاتا۔“

”اللہ نہ کرے پتر ایہ تو کیسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ براہو دشمنوں کا تمہارے سر پر تو میں نے ابھی سہرے دیکھنے ہیں۔“ بشری بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ یہ بات کی ہے نا آپ نے کام کی، میں یہی بات کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے کہا تو بشری بیگم نے چونک کر کہا۔

”یہی بات۔! کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔“

”آپ نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میری پسند کون ہے؟“ چوہدری کبیر نے کہا۔

”ہاں پوچھا تھا کون ہے وہ بتاؤ مجھے، میں اسے حق تمہاری دلہن بناؤں گی۔ بتا پتر؟“ بشری بیگم نے خوش ہو کر کہا تو چوہدری کبیر بولا۔

”تو سنو ماں، میری پسند، ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلٹی ہے، وہی میری دلہن بنے گی۔“

”یہ.....! کیا کہہ رہے ہو تم سلٹی، وہ کیوں؟“ بشری بیگم نے شدید حیرت سے کہا تو چوہدری

کرتے ہوئے کہا

”وہ تو ٹھیک ہے بتا دوں گا۔ پر ہم جو چوہدریوں کی اتنی غلامی کر رہے ہیں اور ہر اُدھر جو دینا ہے وہ بھی ہم اپنے سے ہی دیں۔“ تمنایدار نے کہا

”کتنا چاہئے ہوگا اس کام لے لئے؟“ فطی نے پوچھا۔

”کام دیکھ لو، رقم بھی خود طے کر لو تم نے کون سا رقم دینی ہے۔“ فطی نے پتہ تو ہے کہ گاڑی بنا پیٹرول کے نہیں چلاتی۔ اس نے واضح انداز میں کہا تو فطی بولا۔

”تو مدعا وال، رقم تجھے پہنچ جائے گی۔“

”بس تو کوئی کام کا بندہ تلاش کر کے رکھ باقی لگرنہ کر۔“ تمنایدار نے بھی یقین دہانی کروادی تو فطی بولا۔

”بندے بڑے، سب میں خون رکھتا ہوں۔“ فطی نے رسیور کر لیل پر رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

بشری بیگم السردہ سی بیٹی سوچ رہی تھی کہ رانی آگئی۔ اس نے پاس بیٹھ کر ہولے سے پوچھا۔

”بیگم صاحبہ! آپ تو بہت زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہیں۔“

”معاملہ میرے پتر کا ہے۔ کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی میرے بس کی بات ہے پتر نہیں کیا ہو گا۔“ بشری بیگم نے حسرت سے کہا تو رانی قالین پر

صوفے کے ساتھ بیگم کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بیگم صاحبہ! بھلا مجھے بتائیں۔ آپ اگر یونہی پریشان رہیں تو کیا یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ نہیں نا“

”تم کہتی تو ٹھیک ہو لیکن یہ میرا دل جو ہے نا، بہت لر رہا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“ بشری بیگم نے سوچتے ہوئے کہا تو رانی بولی۔

”آپ ماں بن کر سوچ رہی ہیں نا لیکن پریشانی سے کچھ نہیں ہو گا۔“

کیر سکرانے ہوئے بولا۔  
 ”اس کیوں کا جواب، میں اس وقت دوں گا، جب وہ میری دلہن بن گئی۔“

”یہاں وہ کہاں تم؟ یہ جوڑ بنائی نہیں ہے۔ تم خواہ خواہ ضد کر رہے ہو۔ ایسا مت سوچو تمہارا معاملہ جلدی ختم ہو جائے گا تو ہم تمہیں بہت اونچے گھر لے سہیں اور دیں گے۔ پھر ایسا نہیں سوچنا۔“ بشری بیگم نے الکار کرتے ہوئے کہا

”ماں! میں نے کبہ دیا اور بہت سوچ سمجھ کر یہ کہا ہے۔ وہ ہر حال میں میری دلہن بنے گی۔ اور بس۔“  
 چوہدری کیر نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بشری بیگم حیرت زدہ سی بیٹھی رہ گئی۔ رات نے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر چلت گئی۔

رات کا دوسرا پہر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ چوہدری جلال حویلی کے دالان میں بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ بشری بیگم نے اسے یوں دیکھا تو دھیرے قدموں سے اس کے پاس آئی تو چوہدری نے اس کی طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لیا۔

”آپ نے سونا نہیں۔ رات اتنی گہری ہو گئی ہے۔“ بشری بیگم نے پوچھا تو چوہدری جلال اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”بیگم! یہ جو تو نے کیر کی ضد بارے مجھے بتایا ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ماسٹر دین محمد کو ساری زندگی ہم نے دبا کر رکھا ہے اس کی بیٹی سہلی بارے کیر کی خواہش..... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

”میں نے اپنے طور پر معلوم کیا چوہدری صاحب! اپنا کیر۔ اس سہلی کے لئے اپنے دل میں محبت پال چکا ہے۔ جس کا اظہار وہ کرتا رہا ہے۔ ہم ہی غافل رہے ہیں۔“ بشری بیگم نے اس پر دامن نہ دیا تو چوہدری جلال نے چوتھے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب! یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ فضول ضد ہے کیر کی یہ۔ اسے یہیں ختم کرنا ہوگی یہ ضد۔ بتا دینا اسے میں ایسا بھی نہیں ہونے دوں گا۔“

”میں بھی نہیں چاہتی کہ کیر ایسی خواہش کرے لیکن اگر سختی سے روکیں گے تو ممکن ہے وہ ہماری بات نہ مانے اور....“ بشری بیگم نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولا۔

”وہ کچھ بھی کر لے۔ ایسا ممکن نہیں ہوگا۔“ پھر ایک دم سے خاموش ہو کر لمحہ بھر کے لئے سوچا اور بولا: ”بیگم! تم نے یہ معلوم نہیں کیا کہ اس لڑکی سہلی نے ہی کیر پر زور سے ڈالے ہوں؟“

”وہ کیر سے نفرت کرتی ہے۔“ بشری بیگم نے بولے سے کہا تو چوہدری جلال سمجھتے ہوئے بولا۔  
 ”تو پھر وہ ایسا صرف اپنی ضد اور انا کے لئے کرتا چاہتا ہے۔ اسے سمجھا دو وہ ایسی فضولیات میں نہ پڑے۔ بلکہ اس جاگیر کو سنبھالنے کے لئے خود کو تیار کرے۔ اگر میں نہ رہا تو وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔“

”اللہ نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہی بتاتا چاہ رہی کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اسے آہستہ آہستہ منالوں گی۔ اس کے ذہن سے سہلی نکال دوں گی۔ آپ اس کے لئے جلدی دلہن دیکھ لیں۔ پھر وہ سب بھول جائے گا۔“ بشری بیگم نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی کرنا ہوگا۔ بس یہ نذیر والے معاملے کی دھول کم ہو جائے۔ پھر اس کی شادی کر دیتے ہیں۔“

چوہدری جلال نے حتمی انداز میں کہا تو بشری بیگم بولی۔  
 ”یہی بہتر رہے گا۔ آپ آئیں۔ آرام کریں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“

”چلو۔“

چوہدری جلال اٹھ گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اپنے

## مناقت

☆ انسان اپنی غلطی پر اچھا "دکیل" بن جاتا ہے اور دوسروں کی غلطی پر سخت "جج" بن جاتا ہے۔  
☆ اگر اپنے رزق اور مسائل کے فیصلے اللہ پر چھوڑے ہیں تو پریشان کیوں ہو؟ اور اگر لوگوں پر چھوڑے ہیں تو پھر حیران کیوں ہو؟

☆ دنیا سے ایسا تعلق رکھو جیسا کہ تم آگ سے رکھتے ہو۔ اس سے اپنے آپ کو بچاتے بھی ہو اور نفع بھی حاصل کرتے ہو۔ (حکیم محمود - سایہ وال)

چھاکے، ہم لوگوں کے کہنے پر نہ جا، اپنے اندر سچ بولنے کی اہمیت پیدا کر۔ وہی سچ کہنے کا حوصلہ کر جو اصل حقیقت ہے۔ چوہدری زیادہ سے زیادہ جان سے مراد دے گا، اس سے آگے وہ کیا کر سکتا ہے، یہ سوچ لے۔ "یہ کہہ کر فہد چھاکے کے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "یہ جو کہتا ہے وہ کر۔" "نہیں فہد! میں نے فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ میں نے تو وہی کہنا ہے جو حقیقت ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔" چھاکے نے صاف لہجے میں کہا تو سراج بولا۔ "تو پھر کیا غم ہے۔ یہ روئی صورت کو ختم کر۔"

"میں پریشان اس لئے نہیں ہوں کہ انہوں نے مجھے دھمکی دی یا وہ میرے کسی فیصلے پر اثر انداز ہوں گے۔ میں پریشان اس لئے ہوں کہ اگر میری وجہ سے کئے چوہدری کو سزا ہوتی ہوئی نظر آتی تو وہ مجھے مارنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس طرح صنیہ کو انصاف تو نہیں مل سکے گا۔" چھاکے نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تو فہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب وہ وقت ختم ہو چکا ہے چھاکے۔ کبیر جس طرح پہلے اس علاقے میں بد معاشی کر رہا تھا اب دیا

کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح کی نماز کے بعد فہد اور سراج چھل قدمی کے بعد کمرے کے محن میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ باتیں کر رہے تھے کہ چھاکا آگیا، اس نے آہستہ سے سلام کیا اور محن کی طرف جانے لگا۔ سراج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوشگوار مہوڑ میں پوچھا۔

"اوسے چھاکے! بڑا چپ چاپ ہے۔ خیر تو ہے کہ نے تو نہیں مارا؟"

"کیا ہوا ہے تجھے، کیوں پریشان ہے؟" فہد نے بھی اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھا تو چھاکا بولا۔

"پریشانی تو ہے، چوہدری کا خشی آیا تھا اپنے پاس دھمکی لگانے۔"

"کہیں وہ خدیر سے ڈالے کیس میں تو نہیں؟" سراج نے تیزی سے پوچھا

"ہاں! کہہ رہا تھا کہ میں اپنا بیان واپس لے لوں۔" چھاکے نے جواب دیا تو فہد نے کہا۔

"ہوں، یار انہوں نے تو ایسا کر رہی ہے اب، لگتا ہے چوہدری قانونی جنگ ہار کر بد معاشی پر اتر آئے ہیں۔"

"اوہ پہلے کون سا قانونی جنگ لڑتے ہیں۔ غلطہ گردی ہی تو کرتے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان سے خوف زدہ ہیں اور اس غلطہ گردی کے لئے انہوں نے بد معاشی پالے ہوئے ہیں۔ خیر چھاکے! وہ جو کچھ بھی کہیں ان کی پھوڑ انہوں نے تو کہا ہی ہے یہ جتاؤ اور تیرا کیا کہتے ہیں؟" فہد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، اپنے نے تو صرف مجھے بتایا ہے اور کوئی بات نہیں کی اور میں تو وہی کہوں گا جو آپ لوگ کہیں گے۔" چھاکے نے کہا تو فہد بولا۔

"کیوں دتم ہماری زبان کیوں بولو گے؟ نہیں،

اور دوسروں کو کچل کر اپنے مفادات حاصل کرنے ہی کو سیاست سمجھا جاتا ہے۔" فہد نے کہا۔

"ہمارا سیاسی کلچر ہی ایسی بن چکا ہے کہ دولت لگاؤ اور دولت کماؤ حلال حرام، قوی مفاد اور عوام کی خدمت ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سیاست بھی ایک کاروبار کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ سرمایہ لگا کر ایم پی اسے وایم این اے بن جاؤ، خوب کرپشن کرو، لوٹ مار کرو اور دولت بناؤ۔ فریب آدمی تو الیکشن کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔" شیخ آفتاب نے تہرہ کرتے ہوئے کہا تو فہد سکون سے بولا۔

"لیکن، بات تو دوث پر آ کر ختم ہوتی ہے نا شیخ صاحب! غریب اگر اپنے جیسے کسی بندے کو دوث دے دیں تو وہ ایم این اے بن جائے گا۔"

"مگر غریب کو دوث کی طاقت کا شعور نہیں۔ وہ بے چارہ ان سیاست دانوں کی غلامی میں پھنسا ہوا ہے۔" شیخ آفتاب نے حقیقت بتائی تو فہد حوصلہ افزا لہجے بولا۔

"اب غریب لکھے گا، کم از کم اس علاقے سے تو لکھے گا۔ خیر، ہم اپنی بات کریں۔"

"میرے پاس یہاں زمین نہیں تھی۔ ورنہ میں چوبدری کی پیدا کردہ رکاوٹیں ختم کر دیتا۔ خیر، اُسے چھوڑیں، آپ بتائیں یہ سارے معاملات طے کرنے کے لئے آپ کب آرہے ہیں ہمارے پاس؟" شیخ آفتاب نے پوچھا تو فہد نے کہا۔

"آپ جب چاہیں۔ ویسے تو ملک نعیم صاحب نے آپ سے بات کر لی ہوگی۔" فہد نے اپنا عندیہ دیا تو اس نے لمحہ بھر سوچا اور بولا۔

"میں تو کہتا ہوں آج ہی ملاقات ہو جائے، کچھ مضر کھمرے تو باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

"چلیں آج ہی سہی، آپ ملک صاحب کے ہاں

نہیں کر سکے گا۔ اسے اب ہم سے چسپ کر ہی رہا ہوگا۔" "تو حوصلہ کر چھاکے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا ہم نہیں ہیں۔ اور پھر تجھے کیا، تیری تو پورے علاقے میں دس بچھ ہوگی ہے۔" سراج نے خوشگوار انداز میں ہنستے ہوئے کہا تو وہ ہنسن ہنسن دیئے۔ بھی فہد نے کہا۔

"چل اب جلدی چائے ہی پلا دے۔ تیرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تیرے ہاتھ کی چائے کا تو چسکا ہی لگ گیا ہے۔"

"سید صاحب! ایشیانا میری جان، وہ تیرا شیخ آفتاب بھی تو آتا ہوگا۔" سراج نے یاد دلایا تو فہد نے کہا۔

"لو ہاں یار، کچھ کھانے کو دے دے۔ اس کے ساتھ پتہ نہیں کتنا وقت لگتا ہے۔"

"ابھی لو۔" چھاکے نے کہا اور کچن میں گھس گیا۔

فہد، سراج اور شیخ آفتاب کھیتوں کے درمیان پھرتے ہوئے زمین دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے

بھی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ زمین کا سروے کر رہے ہوں۔ وہ پلتے ہوئے سڑک کنارے آگئے، جہاں گاڑیاں کھڑی

تھیں اور ان کے پاس شیخ آفتاب کا ڈرائیور اور گن مین کمرے تھے۔ شیخ آفتاب نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"زمین تو میں نے دیکھ لی فہد صاحب! یہ لیکسروں کے لئے انتہائی مناسب جگہ ہے۔ میں ایسی ہی جگہ چاہتا

تھا اور چوبدری جلال میری راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔"

"یہ چاہے عمر حیات کی زمین تھی جو میں نے خریدی ہے۔ چوبدری جلال میری بھی راہ میں آیا تھا۔ مگر

اب نہیں اب آپ یقین رکھیں۔ وہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتے گا۔" فہد نے اسے یقین دلایا تو شیخ آفتاب بولا۔

"فہد صاحب، ان سیاست دانوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے، ہمارے ہاں سیاست کسے

کہتے ہیں؟"

"جانتا ہوں شیخ صاحب! دھوکا دینا، جھوٹ بولنا

کر علاقے پر بہت احسان کیا ہے۔ اب یہ بند نہیں ہونے دیں گے۔ میں نے خود گنگے والوں سے بات کی ہے۔ ملک نعیم نے کہا۔

"تو پھر طے ہو گیا۔ آپ جیسے چاہیں پہرہ بولیں۔ مجھے منظور ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے شیخ آفتاب نے فہد کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ فہد نے ہاتھ ملایا تو ملک نعیم اور سراج کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

صفیہ اپنے گھر میں چار پائی پریشی والی رختی رہی تھی کہ نعمت علی گھر میں آگیا۔ وہ اسے گھر میں دیکھ کر مسکرا دیا۔ صفیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ قریب پڑی چار پائی پریشی سے بولے

"مجھے معلوم تھا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ تیرا ہمارے سوا ہے کون؟ اچھا کیا؟ میری بات مان لی۔ اب تو چاہے تو یہ گھر اپنے ام کو کھولیں۔ چوہدری ہمیں یہ گھر دے دیں گے۔"

"بابا ایہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تمہارے سوا ہمارا ہے کون گھر میں یہاں اس لئے نہیں ہوں کہ میں نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو معاف کر دیا ہے۔" صفیہ نے واشگاف انداز میں کہا تو بابا نعمت علی کی تیور یوں پر مل پڑ گئے۔ دو دن سے میں بولا۔

"تو پھر تو یہاں کیوں ہے۔ میں نے تمہیں یہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔"

"چلی جاؤں گی اور اگر چلی مٹی تو پلٹ کر بھی واپس نہیں آؤں گی۔" صفیہ نے کہا۔

"دیکھو صفیہ! تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو چوہدریوں کی بات مان لے اور یہاں پر سکون زندگی گزار دیا پھر دوبارہ کی ضرورت نہیں کھانے کے لئے چلی جا۔ میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ میں چوہدریوں کے سامنے بھانے بنایا کر تھک چکا ہوں۔" بابا نعمت علی نے ہار مانتے

پہنچیں، میں بھی وہیں آ جاتا ہوں۔"

"میں دو گھنٹے بعد آپ کا وہیں انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر شیخ آفتاب نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو دونوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا۔ وہ بھی، گمن میں بھی اور ہاتھ ملاتے چلے گئے۔ فہد اور سراج نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

ملک نعیم کے گھر میں فہد شیخ آفتاب، ملک نعیم اور سراج بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ شیخ آفتاب کہہ رہا تھا۔ "یہ تو طے ہے ملک صاحب کہ اس علاقے میں فیکٹریاں لگانی ہیں۔ چوہدری جلال نے ہمیشہ مخالفت کی ورنہ میں تو سرمایہ لگانے کو بالکل تیار بیٹھا ہوں۔"

"شیخ صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ آپ سرمایہ اپنے منافع کے لئے لگا رہے ہیں۔ لیکن یہ اس علاقے کے لئے ضروری بھی ہے۔ کیونکہ یہاں غربت ہے، بے روزگاری ہے، ہسپتال نہیں، کوئی بڑا سکول نہیں۔ فیکٹریاں لگانے کے ساتھ آپ کو یہ سہولیات دینا ہوں گی۔" فہد نے کہا تو ملک نعیم بولا۔

"بے شک۔ ابھی تو پہلی ترجیح ہے۔ سرمایہ دار کا منافع عوام میں سے ہو کر آتا ہے۔"

"میں نے سوچا ہے کہ میں نے وہاں سے کئی برس تک منافع نہیں کمانا سیدھی بات ہے میں نے اپنی ضد پوری کرنی ہے۔ میری زندگی میں صرف چوہدری جلال ہی ایسا شخص آیا ہے جس نے میری راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ خیر! آپ جو بھی اور جیسی بھی شرائط رکھیں جو طے کرنا چاہیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" شیخ آفتاب نے واشگاف انداز میں کہہ دیا تو فہد بولا۔

"میری صرف ایک شرط ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی خوشحالی، اور بس۔"

"ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں۔ آپ نے سکول کھول

دیا ہے۔ وہ رزق دینے والا ہے، وہی دے گا۔ تو بیٹہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"میرے لئے چھت کا بندوبست؟" صفیہ نے حیرت سے پوچھا تو سہلی نے بتایا۔

"ہاں، وہ چاہے عمر حیات والا گھر خالی ہے نا، تو اپنا سامان ادھر ہی رکھ لینا۔ ادھر رہتا چاہو تو بھی ہمیں پریشانی نہیں۔ بس اب تم نے ان باتوں کو نہیں سوچنا۔ تو بیٹہ میں ان بچوں کے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

صفیہ نے تشکر بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا اور وہیں ایک چارپائی پر بچوں کو لے کر بیٹھ گئی۔

اس وقت سہلی والاں میں میز پر کافی سارے کاغذ پھیلائے بیٹھی تھی۔ صفیہ اس کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب فہد گھر میں آیا۔ اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا اور خوشگوار موڈ میں پوچھا

"کیا ہو رہا ہے۔ یہ اتنا بڑا دفتر کیوں لگایا ہوا ہے۔"

"آپ بیٹھیں تو میں آپ کو بتاؤں۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ فہد قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کے بولا۔

"بیٹھ گیا اب بولا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ صفیہ اپنا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اپنے پاس آ گئی ہے۔ میں نے اسے سب سمجھا دیا۔ جدھر چاہے رہے۔"

"ٹھیک ہے اور دوسری بات؟" فہد نے پوچھا۔

"میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ پہلے میں گاؤں کے ان غریب لوگوں کی لسٹ بنا رہی ہوں جو کسی نہ کسی حوالے سے مدد کے مستحق ہیں۔ بعد میں یہ فیصلہ کریں گے کہ انہیں اپنے ہاتھوں پر کیسے کھرا کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ اپنی کمائیں اور خود کھائیں۔" سہلی نے بتایا تو فہد

ہوئے کہا تو صفیہ بولی۔

"تو مجبور نہ ہو بابا! میں چلی جاتی ہوں۔"

"تو پھر چلی کیوں نہیں جاتی ہو، یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ تم اب میری ذمہ داری نہیں ہو۔" بالاعت علی نے چیخ کر کہا۔ آخری لفظ کہتے ہوئے بابا کا گھار بندھ گیا۔ صفیہ نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اٹھ کر باہر کی جانب ہلا گیا۔ صفیہ نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا پھر دکھ اور حسرت سے بولی۔

"چلو بیٹا! اب ہم یہاں سے چلیں۔ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

اس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کئے اور اپنے بچوں کو لے کر باہر نکل گئی۔ وہ سیدھی سہلی کے گھر جا پہنچی۔ اس وقت ماسٹر دین محمد محسن میں بیٹھا ہوا تھا جب دروازے میں صفیہ آن کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ بچے تھے۔ ماسٹر دین محمد کی نگاہ اس کی طرف اٹھی تو بولا۔

"آ جاؤ بیٹی، آؤ۔ آ جاؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو۔" یہ کہا پھر سہلی کو آواز دی، "سہلی آؤ پتر سہلی۔"

دروازے کی طرف سے صفیہ آ گئی تو اندر کی جانب سے سہلی وہاں آ گئی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے صفیہ نے کہا۔

"میں آ گئی ہوں سہلی۔ ہمیشہ کے لئے وہ گھر چھوڑ کر آ گئی ہوں۔"

"میں تو نہیں کہتی کہ تم نے اچھا کیا یا برا لیکن یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آؤ بیٹھو۔" سہلی نے کہا

"میں محنت مزدوری کروں گی۔ اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں میں کوشش کروں گی کہ جلدی....." اس نے کہا چاہا تو ماسٹر دین محمد نے قہقہے سے کہا۔

"اؤ بیٹی! تو بیٹھ کچھ کھانی لے، پھر یہ باتیں سوچتی رہنا۔ اللہ نے تیرے لئے چھت کا بندوبست بھی کر

ساتھ مقامی لوگ ہوں گے تو میری ہی قوت میں اضافہ ہو گا۔" مچ سے اسی کے ساتھ تھا۔ اب بات آئی سمجھ میں۔  
"جی سمجھ گئی۔" سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تو فہد لٹ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

حویلی کے ڈرائنگ روم میں بشری بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔ رانی اس کے لئے چائے کاگ لا آئی تو رانی نے وہ گلاسے چھاتے ہوئے کہا۔  
"یہ لیں بیگم صاحبہ!"

"کیہر کہاں ہے؟ ابھی تیار نہیں ہوا؟" بشری بیگم نے گک پکڑتے ہوئے پوچھا تو رانی بولی۔  
"وہ جی، تیار ہو کر ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ چوہدری کبیر اندر سے وہیں آ گیا۔ بشری بیگم نے چائے کا سپ لے کر گک دیکھ دیا اور کبیر کی طرف دیکھ کر بولی، "کدھر جا رہے ہو؟"  
"ڈیرے پر۔" اس نے کہا اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھ کر بولا، "کیوں خیر ہے ماں، جو آپ ایسے پوچھ رہی ہیں آج؟"

"میں نے تم سے بات کرنی ہے۔ بیٹھو۔"  
"کہیں؟" یہ کہہ کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تو بشری بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تیرے بابا سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ تمہاری اس سلمیٰ کا نام بھی نہیں سننا چاہتے۔ وہ جانتے ہیں کہ تم صرف ضد میں آ کر اسے اپنی دلہن بنانا چاہتے ہو۔ اس لئے....." بشری بیگم نے کہنا چاہا تو چوہدری کبیر مسکراتے ہوئے ہولے سے بولا۔

"ماں! میں نے ضد کی ہے یا خواہش، میری دلہن سلمیٰ ہی بنے گی، کوئی دوسری نہیں۔"

"تم کون ہوتے ہو اکیلے فیصلہ کرنے والے؟ جو فیصلہ چوہدری صاحب کریں گے وہی ہوگا۔" بشری بیگم

بولی۔

"یہ تو بہت اچھا ہے، جب تک ہم خود انحصار نہیں ہوں گے۔ ان جاگیرداروں کے چگل سے تو نہیں نکل سکتے۔"

"مسئلہ بھی تو یہیں ہے نا۔ ان کے چگل سے نکل کر خود انحصاری تک کے درمیان سہارے کی ضرورت ہے، اس پر ہمیں سوچنا ہے اور ان کے لئے کچھ کرنا ہے۔"  
سلمیٰ نے کبیر کی سنجیدگی سے کہا تو منہ نے پوچھا۔  
"میں چائے بناؤں آپ کے لئے؟"

"ہاں بناؤ لیکن ذرا جلدی۔ میں نے ابھی نور پور کے لئے نکلنا ہے۔ یہ استاد جی کدھر ہیں؟"

"ساتھ والے گاؤں، اپنے کسی دوست کے پاس گئے ہیں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے؟" سلمیٰ نے پوچھا تو منہ ان کے پاس سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔  
"جیسا کام تم کر رہی ہو، ویسا ہی میں کر رہا ہوں۔"

دیکھو میں نے چاہے عمر حیات کی زمین اس لئے خریدی ہے کہ اس پر فیکٹری لگاؤں۔ تاکہ لوگوں کو روزگار ملے اور وہ خود انحصار ہو کر چوہدریوں کے چگل سے نکل آئیں۔ فہد نے کہا تو سلمیٰ بولی۔

"فیکٹری لگانا کوئی معمولی بات ہے، اس کے لئے بڑا سرمایہ چاہئے؟"

"میرے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ایک کی بجائے دس فیکٹریاں، ہاں لگا لوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے لوگ بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں۔"

فہد نے جواب دیا تو سلمیٰ نے جلدی سے پوچھا۔  
"وہ کیوں؟"

"شیخ آفتاب نے بہت کوشش کی فیکٹری لگانے کی مگر چوہدری نے اس کی چلنے نہیں دی۔ وہ سرمایہ اٹھا کر پھر تارہا لیکن کسی نے زمین نہ دی۔ اب میں نے زمین خریدی ہے تو وہ میرے ساتھ پارٹنر بننا چاہتا ہے۔ میرے

ہے۔ یہ ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔" چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"جی بات تو یہ ہے چوہدری صاحب! آپ نے شروع ہی سے فہد کے بارے میں لفظ اندازہ لگایا۔ لگا چوہدری ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہاں پیر جمانے ہی نہ دینا چاہئے تھے۔ وہ کھلے عام لوگوں کو آپ کے بارے میں ہمز کار رہا ہے۔ اس کا وجود ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے چوہدری صاحب!" منشی نے اسے باور کرایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ہمیں ہر طرح سے زچ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اب سمجھا ہوں کہ وہ ہم سے کس طرح انتقام لینا چاہتا ہے۔ اب اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔" چوہدری جلال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو ہمز جتنی جلدی ہو سکے اس کا کام ہو جانا چاہئے ورنہ مشکل پیدا کرتا چلا جائے گا، وہ ہمارے لئے منشی نے بڑی خطرناک صلاح دی تو چوہدری جلال اس کی ہاں میں ہاں ملا تا ہوا بولا۔

"ہاں! اب اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا اس پر ایسے ہاتھ ڈالنا ہے کہ وہ ہمز نہ سکے۔"

"لیکن آپ پہلے کے چوہدری والا معاملہ دیکھ لیں۔" منشی نے یاد دلایا تو چوہدری جلال کو یاد آ گیا۔ "وہ نعمت علی سے پوچھو، اگر اس کی بہو نہیں مانتی تو۔۔۔"

"میں سمجھ گیا، ان کا بھی مل ہے لیکن اگر میں کہوں کہ فہد ہی ہے جو اس مسئلے کی جڑ ہے۔ تو۔۔۔" منشی نے سوالیہ نشان چھوڑ دیا تو چوہدری جلال لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔

"اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن حریہ ہیں۔ ہاں، ذرا تیرے سے کہو گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔"

منشی نے غم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر

نے غصے میں پوچھا تو چوہدری کبیر سکون سے بولا۔ "ماں تو بہت بھولی ہے، شادی اس سے میں نے کرنی ہے فیصلہ بھی میرا ہی ہوگا۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ جو میں کہہ رہی ہوں۔ تم اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو۔ کیوں فضول بحث کرتے ہو؟" وہ اکتاتے ہوئے بولی تو چوہدری کبیر نے جذباتی انداز میں کہا۔

"ماں آپ نہیں جانتی ہو۔ وہ میرے لئے کیا ہے۔"

"کیا ہے وہ تمہارے لئے، ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو میں اس۔۔۔" بشری بیگم نے حیرت سے پوچھا تو وہ حریہ کہنا چاہتی تھی تو اس نے انگلی کھڑی کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ حیرت اور غصے میں اسے دیکھتی رہی۔ چوہدری کبیر مسکراتا ہوا اٹھ کر بیرونی دروازہ عبور کر گیا۔ رانی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

دو پہر سے ذرا پہلے چوہدری جلال صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ چند لمحے بعد منشی فضل دین وہاں آ گیا۔ وہ چوہدری کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔

"چوہدری صاحب! آپ تک جو خبر پہنچی ہے وہ ٹھیک ہے۔ میں نے تصدیق کر لی ہے۔ سینہ آفتاب نے وہ جگہ اپنی فیکٹریوں کے لئے پسند کر لی ہے۔ جو فہد نے عمریات سے خریدی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے سینہ آفتاب اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے۔ وہ یہاں فیکٹریاں لگانا اب تک نہیں بھولا۔" چوہدری جلال نے حقارت سے کہا تو منشی بولا۔

"گنا تو یہی ہے۔ کیونکہ اس نے زمین پسند کر کے فہد سے بات کر لی ہے۔"

"منشی! جب تک یہ فہد یہاں نہیں آیا ان لوگوں کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ میری مرضی کے بغیر یہاں فیکٹریاں لگانے کا سوچ سکیں۔ اس فہد نے انہیں رستہ دے دیا

جانب چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر کے وقت چوہدری جلال اور بشری بیگم دونوں لان میں تھے۔ چوہدری کبیر دھیرے دھیرے چلا ہوا ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے چہرے پر تاثر یہی تھا کہ وہ اس سے کوئی اہم ترین بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لئے چوہدری کبیر نے پوچھا۔ "مٹی بابا! آپ نے مجھے بلایا۔ خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں، خیریت ہے اگر تم چاہو تو درنہ شاید نہ ہو سکے۔" چوہدری جلال نے کسی تاثر کے بغیر کہا۔

"کیا مطلب، ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟" چوہدری کبیر سکون سے بولا تو بشری بیگم نے کہا۔

"بات یہ ہے کبیر! وقت ایسا آگیا ہے جب ہمیں کچھ فیصلے کر لینے چاہئیں ورنہ حالات ہمارے ہاتھ سے ریت کی طرح نکل جائیں گے۔"

"ایسا کیا ہو گیا ہے بابا، آپ لوگ کیوں اتنے پریشان ہیں؟" چوہدری کبیر نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی بات کرنے تمہیں بلایا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ابھی تذییر کا معاملہ ختم نہیں ہوا اور تم نے ایک نئی ضد شروع کر دی ہے اور ایسی ضد جسے نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہماری خاندانی روایات۔" چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"تو میں کون سا اس ماسٹر کی بیٹی کو اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔ جس سے ہماری خاندانی روایت لوٹ جائے گی۔"

اس نے کہا تو دونوں میاں بیوی چومک گئے۔ جمی چوہدری جلال نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں تو فہد کو ذہنی لذیت چاہتا ہوں میں سلی کو اس حویلی میں نہیں لاؤں گا بلکہ نوکرائی بنا کر نوز پور میں رکھوں

گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی میرے خلاف تذییر کی بیوی کو بھڑکانے کی۔" چوہدری کبیر نے عذارت سے کہا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہوں، تو یہ سوچ ہے تمہاری؟"

"کیونکہ آپ فہد کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو صرف فہد کی وجہ سے اتنا حوصلہ ملا ہے کہ وہ ہمارے خلاف سر اٹھا سکیں۔ اور یہ جو حالات ہمارے خلاف ہو رہے ہیں۔ صرف اور صرف اسی وجہ سے ہیں۔" چوہدری کبیر نے اپنے ہاپ کو دلیل دی۔

"کبیر! تم نہیں سمجھتے ہو۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اسے راستے سے ہٹاتے ہیں نا تو پھر ہمارے پاس حالات سدھارنے کا بھی موقع نہیں رہ جاتا۔ شاید تم نہیں جانتے اس نے ہمیں سے لے کر اب تک ہمارے خلاف ہی قوت جمع کی ہے۔" چوہدری جلال نے کہا۔

"تو پھر فیصلہ کر لیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یوں حالات کو ہاتھ سے لگتے دیکھتے رہیں یا پھر ان پر قابو پا لیں۔" چوہدری کبیر نے پوچھا تو چوہدری جلال دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"ان حالات پر قابو پانا ہی ہو گا کبیر!"

"تو بس پھر، میں جو کرتا ہوں، مجھے کرنے دیں۔" چوہدری کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا تو بشری بیگم تیزی سے خول زدہ لہجے میں بولی۔

"خدا! کچھ ایسا نہ کرنا جو ہمارے لئے نئی مصیبت بن جائے میرے بیٹے، پہلے ہی ہم بہت اذیت سے گزر رہے ہیں بہت ہو چکا یہ خون خرابہ۔"

"ماں! فیصلہ ہو چکا ہے،" چوہدری کبیر نے حسی لہجے میں کہا اور اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ بشری بیگم کے چہرے پر اذیت بھرے جذبات ابھر آئے تھے، اسے یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نہوں کہ اب سیاست اور حالات کا رخ بدل گیا ہے، اب عوام کو شعور ہے۔ کامیاب دہائی ہو گا جو عوامی خدمت کرے گا، اسی کے ہاتھ میں سیاسی گرفت ہوگی۔"

"وکیل صاحب! میں آپ کی اسی بات سے اختلاف کرتا آیا ہوں۔ میں چاہوں تو ایک ہی دن میں پانسہ پلٹ کر رکھ دوں، بس چند بندوں کو قابو کرنے کی بات ہے۔ یہ نہ عوامی شعور سے ہو گا اور نہ عوامی خدمت سے۔ میرے خیال میں اصل معاملہ یہ ہے کہ مفاد پرست لوگ سیاسی بلک میلنگ پر اتر آئے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" یہ سن کر وکیل کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے قہر سے کہا۔ "آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن غلط میں بھی نہیں کہہ رہا۔ علاقے کی چھوٹی چھوٹی قوتوں کو ساتھ لے کر ہی چلنا ہو گا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے ملک نعیم یہ جو اپنے ہونے کا ناکام ثبوت دے رہا ہے، میں اس سے گھبرا جاؤں؟ آپ اپنا گروپ مضبوط کریں، میں علاقے کی سیاست کو خود دیکھتا ہوں۔" چوہدری جلال نے کہا تو وکیل بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی، میں آپ کو نور پور کی صورت حال بارے بتا دیتا ہوں، پھر جیسا آپ کہیں ویسا ہی ہو گا۔"

وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ وکیل چلا گیا تو چوہدری جلال نے بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اسے اپنی تمام تر مشکلات کی وجہ صرف اور صرف فہد ہی لگا۔ اس کے یہاں آنے ہی سے حالات اس کے قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل جائے، اس نے فہد ہی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی رات چوہدری جلال اپنے لایرے پر جا پہنچا۔ جیسے ہی اس کی گاڑی رکی اس کے پیچھے ہی ایک اور کار آن رکی۔ اس میں سے ایک نوجوان نکلا، جس نے جین اور لیڈر جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

اسی شام وکیل جمیل اختر حویلی کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ چوہدری جلال نے اسے بلوایا تھا کہ یہ اچانک ملک نعیم کیسے مراٹھانے لگا ہے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ فہد اور شیخ آفتاب جیسے لوگ بھی آن لے گئے؟ وہ اس سوال کا جواب چاہتا تھا کہ آٹھریا کیا ہو گیا ہے کہ وہ مضبوط ہو رہے ہیں۔ وہ قدرے غصے میں بات کر رہا تھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے وکیل صاحب! ہم بڑے کھوں سے یہاں پر سیاست کر رہے ہیں۔ آج تک علاقے میں ہماری اپنی مخالفت نہیں ہوئی، جتنی اب ہو رہی ہے؟ لوگ جگہ جگہ بیٹھ کر ہمارے ہی خلاف باتیں کر رہے ہیں۔"

"چوہدری صاحب! ایسا بھی ہوتا ہے جب کسی بھی سیاست دان کی اپنے علاقے میں سیاسی گرفت کمزور ہو جائے۔ مفاد پرست تو کچھ بھی نہ ہونے سے بہت کچھ بنا لیتے ہیں۔ دیکھنا یہی ہو گا کہ سیاسی گرفت کمزور کیوں ہو گئی؟" وکیل نے بڑے قہر سے کہا۔

"کیوں ہو گئی، آپ سب کا خیال کیا ہے؟" اس نے بھی کافی حد تک قہر سے پوچھا۔

"یہ لوگ آپ کو کیا بتائیں، انہوں نے تو وہی کیا ہے جو آپ نے کہا۔ ان کے پاس ووٹ تو ہیں لیکن وہ صلاحیت نہیں جس سے بدلتے ہوئے حالات کا رخ دیکھ سکیں۔ کیا آپ نے علاقے کے ان ہائر لوگوں سے رابطہ رکھا جو اپنے طور پر چھوٹی چھوٹی قوتیں ہیں؟" وکیل نے پوچھا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب! نور پور کے چھوٹے موٹے کاموں سے لے کر اسمبلی تک چھوٹے بڑے اداروں میں ان کے کام نکلوائے ہیں، سفارشیں کی ہیں، نوکریاں دلوائیں ہیں، جائز اور ناجائز سارے کام ہوتے ہیں۔۔۔ اور رابطہ کیسے ہوتا ہے؟" چوہدری جلال نے الجھتے ہوئے کہا تو وکیل بولا۔

"چوہدری صاحب! میں بار بار عرض کرتا رہا

میں بہت تھیلی آگئی تھی۔ اسے یہ تو کفر ہو گیا تھا کہ مائرو اس کے بلاوے سے زیادہ فہد کی کشش میں وہاں تک پہنچی چلی آئی ہے۔ وہ یہ سب جانتے ہوئے بھی مایوس نہیں تھا، اسے ہلکا سا دکھ ہو رہا تھا کہ جا کر اس نے فون بھی نہیں کیا تھا۔ تب اس نے سوچا اگر اس نے فون نہیں کیا تو وہ خود کر لے۔ یہ سوچ کر وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنا فون اٹھایا اور مائرو کے نمبر ڈائل کر دیے۔ فون میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے پوچھا۔

"کیسا لگا تمہیں فہد کا گاؤں؟" ناچاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے نکل گیا تو مائرو نے کچھ بھی محسوس نہ کرتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں جعفر کہ وہاں کچھ دن رہ کر زبردستی ریپورٹ بناؤں۔ ہم ترقی کی بات کرتے ہیں، لیکن کہاں ہے ترقی؟ میں اس علاقے کو مثال کے طور پر پیش کروں گی۔ وہاں انسان بستے ہیں، کیا جدید دنیا کی سہولتوں پر ان کا کوئی حق نہیں؟"

"تمہیں یاد ہے مائرو۔ مجھے تم نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی لیکن اس وقت تمہارے بچے میں یہ شدت نہیں تھی۔ ہانا میڈیا بھی ابھی تک خواب کے ان مسائل تک نہیں پہنچ سکا جس پر شعور دینا چاہئے۔ خیر، تم نے تجربہ نہیں کیا؟" جعفر نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو مائرو نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"جعفر! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے انسان سامنے بڑی ہوئی شے کو نہیں سمجھ پاتا، یونہی خواہ مخواہ الجھن کا شکار رہتا ہے، اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔"

"تم کہنا کیو چاہ رہی ہو، کیا الجھن ہے، کے سمجھ نہیں پاتی ہو؟" جعفر نے پوچھا۔

"بعض اوقات حالات ایسے بن جاتے ہیں۔ جس سے ہمارے اپنے ہی بدگمان ہو جاتے ہیں۔ نیچے یہ بتاؤ ہمیں انہوں کی بدگمانی دور کر دینی چاہیے؟" جواب

اس کا چہرہ کالی حد تک ڈھکا ہوا تھا۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف غیر جذباتی انداز میں دیکھا تو کاشی نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ چوہدری جلال نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔

"بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے کاشی!" آپ نے یاد ہی اتنے عرصے بعد کیا ہے۔ اس دوران آپ کو کام نہیں پڑا، آج کام پڑا تو آپ نے بلوا لیا۔" کاشی نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہاں تمہاری یادہ خیر معاملہ ہی کچھ ایسا آ پڑا ہے، میں تو سیدھے سیدھے اس کا حل کر لیتا لیکن یہ سیاست درمیان میں آگئی۔ دونوں کی فکر میں معاملہ ہاتھ سے لگا جا رہا ہے۔" چوہدری جلال نے اپنی الجھن بتائی تو کاشی سکون سے بولا۔

"ہم کس لئے ہیں چوہدری صاحب! ہم حاضر ہیں۔ بولیں، آپ کے مقابلے میں کوئی اور سیاست دان آگیا ہے کیا؟"

"ایک چھوٹا سا سیاست دان تو پہلے ہی تھا لیکن اس کے علاوہ ایک غیر اہم سا بندہ ہے جسے شروع میں نہیں نے اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ اب وہ دردمن بن گیا ہے۔" چوہدری نے کہا تو کاشی لا پرواہی سے بولا۔ "اب میں آگیا ہوں نا، سکون ہو جائے گا۔ کہیں تو آج رات ہی اس کا کام کر دیتا ہوں۔"

"نہیں اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ تم آؤ نا، سکون سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ معاملہ یہاں کا ہی نہیں نور پور کا بھی ہے۔ میں تمہیں تفصیل سے سمجھا دیتا ہوں۔ آؤ۔" چوہدری جلال نے کہا اور کاشی کو لے کر اندر کی جانب بڑھ گیا

☆.....☆.....☆

جعفر اپنے آفس میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب سے مائرو یہاں سے ہو کر گئی ہے، اس کی اپنی ذات

جعفر بے بسی سے اس کی طرف سے رونے کی آواز سنتا رہا۔ اچانک فون بند ہو گیا۔ اس نے فون کو بے بسی سے دیکھا پھر ایک طرف اچھال دیا۔ وہ بہت مایوس ہو گیا تھا۔ رات گہری ہوئی چل جا رہی تھی۔ دیکھی روشنی میں مارہ اپنے بیڈ روم میں سو جاتی چلی جا رہی تھی۔ اسے جعفر کا جذباتی پن یاد آ رہا تھا۔

"ہاں مارہ! میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔۔۔۔۔ مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی الگ سے دنیا بنالی ہے۔۔۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولتا اور پھر تم سے تو غلط بیانی کر رہی ہوں۔ میں تمہیں یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو۔"

مارہ نے اذیت سے اپنے بالوں میں انگلیاں بھیریں اور بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

"یہ تم کیا سوچ رہے ہو جعفر! مجھے تو فہد کا انتظار کرنا ہے اور مجھے یقین ہے وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔"

"اگر نہ آیا تو؟"

جعفر کی بات ٹھیک ہوئی تو کیا میں جعفر جیسا دوست بھی گواہیوں کی... یا خدا! میں کس دور رہے پر آن کھڑی ہوئی ہوں، مجھے کیا کرنا چاہئے، کیا مجھے اپنا آپ حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہئے؟ مجھے کوئی نہ کوئی تو فیصلہ کرنا ہو گا۔ میں فہد کو چاہتی ہوں اور جعفر مجھے... میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا اور پھر بے بسی ہی ہو کر اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

جعفر اپنی سرکاری رہائش گاہ میں اپنے بیڈ پر پڑا سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ تو پتہ تھا کہ مارہ ناراض ہو گئی ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا اب رد عمل کیا ہو گا۔ وہ یہ سوچ کر ہی کرب سے گزر جاتا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اس نے کئی بار

بے بسی کی بجائے اس نے سوال کر دیا جس پر جعفر بولا۔  
"بالکل، کیوں نہیں، اپنوں کے درمیان اب کھین نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی بھی تعلق ہو اس میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہئے، اسے صاف ہونا چاہئے۔"

"میرا اور تمہارا تعلق کیا ہے۔ تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں اور... مارہ نے کہنا چاہا تو جعفر تیزی سے بات کاٹ کر فکڑ بھرے لہجے میں بولا۔

"نہیں مارہ ہم فقط دوست ہی نہیں کچھ اور بھی ہیں۔ یہ بات تمہیں اب تک سمجھ آ جانی چاہئے تھی۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ اظہار ہی کیا جائے۔"

"کیوں، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان کچھ اور تعلق ہے، اظہار مطلب؟" مارہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مارہ! میں تمہیں چاہتا ہوں اور میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" جعفر نے ہمت کر کے اظہار کر دیا تو مارہ نے چونک کر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جعفر! تم یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو کیا! تمہیں نہیں معلوم کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں، اسے چاہتی ہوں؟"

"مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی الگ سے دنیا بنالی ہے۔ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو۔" جعفر نے اسے بتایا تو وہ غصے میں بولی۔

"نہیں جعفر! تم فہد کی بات نہیں اپنی بات کہو، میں تو تمہیں ایک دوست سمجھتی تھی اور تم کیا سوچتے رہے، تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا۔ تم وہ جعفر نہیں ہو، اب تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ میں..."

وہ کہہ نہیں پائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نئی سوچ چاہتے ہیں، نئی قیادت چاہتے ہیں۔  
 ”وہ اس لئے ملک صاحب کہ نسل نئی آگئی ہے،  
 انہیں وقت کی تہدیلی کا شعور ہے، وہ اپنے ارد گرد بھی  
 تہدیلی چاہتے ہیں۔“ جعفر نے تبصرہ کیا تو ملک نعیم  
 بولا۔ ”اصل میں یہ وقت ہی تو ہے جو سب کچھ بدل دیتا  
 ہے لوگ کب تک ان کرپٹ سیاست دانوں کو مقدس  
 گائے بنا کر رکھیں جب وہ عوام کے لئے کچھ نہیں کریں  
 گے تو عوام بھی انہیں ووٹ نہیں دیں گے۔“  
 ”یہ تہدیلی تو ایک نظری عمل ہے۔“ وہ بولا۔

”بس اب تو انکسٹن کا انتظار ہے مجھے یقین ہے کہ  
 اس سے پہلے سب ٹھیک کر لوں گا۔“ ملک نعیم نے کہا۔  
 ”میرے لائق جو بھی ہو تو مجھے بتائیے گا۔ اچھا اب  
 اجازت۔ اللہ حافظ!“ جعفر نے اچانک کہا۔

”ضرور بتاؤں گا۔ اللہ حافظ“ ملک نے کہا تو جعفر  
 نے فون بند کر دیا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ کچھ دل بہل  
 جائے گا مگر وہاں باتیں ہی دوسری شروع ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔  
 اسے بہت سارے خیال آ رہے تھے۔ اسے فہد کی بات یاد  
 آرہی تھی کہ مائرہ کا بہت خیال رکھنا، میرے جانے کے  
 بعد سب کچھ اطمینان سے بتا دینا کہ میرا گاؤں جانا کتنا  
 ضروری ہے۔ بس وعدہ کرو، جو تمہیں کہا ہے وہی کرو  
 گے۔ پھر اسے مائرہ کی بات یاد آئی جو اسے بہت دکھ دے  
 رہی تھی کہ تم یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم  
 کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں اسے چاہتی ہوں۔ وہ  
 اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

”مائرہ سے اپنے من کی بات کہہ کر، اپنے جذبات  
 کا اظہار کر کے، میں نے کہیں غلطی تو نہیں کی؟ وہ کیا  
 سوچے گی۔ یہی کہ میں نے اس کی دوستی کا غلط مطلب  
 لیا۔ میں جو اس کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اس کی چاہت  
 کو اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں، کیا میں غلط ہوں یا فہد کی

بہن بھی ملائے لیکن ہر بار رک گیا۔ تبھی اسے کچھ نہ سمجھا تو  
 اس نے ملک نعیم کے بہن ملائے۔ رابطہ ہو جانے پر جعفر  
 نے پوچھا۔

”سنائیے کیا حال ہے، کیسے چل رہی ہے آپ کی  
 سیاست اور کیا کہتا ہے آپ کا علاقہ؟“

”سب ٹھیک ہے اور بہت اچھا ہے۔ چوہدری کے  
 خلاف جو نفرت ہے۔ لوگ اسی وجہ سے میرے قریب  
 آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں انہیں اپنے قریب  
 کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ ملک نعیم نے خوش ہونے  
 ہوئے کہا تو جعفر بولا۔

”ہاں یہ جو جاگیر داری سسٹم میں لوگ ہیں، یہ  
 فقط چند لوگوں کو نواز کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ دراصل وہ  
 حاکمیت چاہتے ہیں۔ ایسی حاکمیت جس میں کم از کم عوام  
 کی بھلائی نہیں ہوتی۔ آپ کا علاقہ تو زیادہ تر دیہاتی  
 ہے۔“

”ہاں، زیادہ دیہاتی ہے، میں کام کر رہا ہوں وہاں  
 پر فہد کی وجہ سے میں جلدی کامیابی حاصل کر لوں گا۔“  
 ملک نعیم نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تو جعفر بولا۔

”اس کی وجہ سے کیسے، وہ کیسے؟“

”اس نے بڑی تیزی سے اپنے گاؤں قسمت پور  
 اور پھر ارد گرد کے علاقے میں اپنا اثر و سونخ بٹایا ہے۔ گو  
 چوہدری نے جو اپنا خوف برسوں سے لوگوں پر مسلط کیا  
 ہے۔ اسے ختم کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ وہ جو یہاں  
 میرے حامی اور سپورٹر تھے۔ اس کے لئے بھی وہ بہت  
 اہم ثابت ہو رہا ہے۔“ ملک نعیم نے بتایا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے میں نے کہا تھا نا کہ وہ  
 آپ کے لئے بہت اہم ہو گا۔“ جعفر نے کہا تو ملک نعیم  
 بولا۔

”اصل میں یہ ایک نئی لہر کی وجہ سے بھی ہے لوگ  
 مابقتہ چہروں کو ان کے کاموں کو دیکھ کر اکتا چکے ہیں، وہ

درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے۔“ جعفر نے سنجیدگی سے کہا۔

”جعفر! میں تم سے آج طے نہیں کروں گی۔ بلکہ کبھی بھی نہیں طے نہیں کروں گی۔ ہم اسے وقت پر چھوڑ دیتے ہیں پلیز.....“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو جعفر سکون سے بولا۔

”اوکے، اب یہ طے ہے کہ ہم نے کبھی آپس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ اور شاید کیسی ہو؟“

”اب میں پڑ سکون ہوں اور سکون سے سو پاؤں گی۔ ہاٹی باتیں صبح کریں گے۔“ مائرہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جعفر نے فون ایک طرف رکھا اور ہیڈ پر جالینا۔ بات کر کے وہ اچھا محسوس کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی نماز کے بعد ماسٹر دین محمد گلی میں چلا آ رہا تھا۔ ایسے میں سامنے سے ایک عورت آگئی۔ وہ قریب آ کر رکی جیسے وہ اس سے بات کرنا چاہ رہی ہو۔ ماسٹر دین محمد رک گیا تو وہ عورت بولی۔

”ماسٹر جی۔ کیا حال ہے آپ کا؟“

”میں ٹھیک ہوں بہن! تو سنا گھر میں سب ٹھیک ہیں نا؟“ ماسٹر دین محمد نے سکون سے پوچھا تو وہ عورت بولی۔

”سب ٹھیک ہیں۔ ویسے ماسٹر جی۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کی طرف آؤں۔ میں نے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“

”خیر تو ہے نا بہن۔ ایسی کیا بات کرنا تھی۔“ اس نے پوچھا تو وہ عورت شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔

”دیکھیں نا۔ میں تو دہائی کہوں گی۔ جو آپ کے فائدے کی بات ہو۔ گاؤں میں لوگ بڑی باتیں ہمارے ہیں۔ ایسا کچھ کہتے ہیں کہ بس تو بہ ہی بھلی۔“

”ایسا کیا کہتے ہیں؟“ ماسٹر دین محمد نے حیرت

چہرے میں ڈوبی مائرہ کا انتظار کرتے ہوئے وقت ضائع کر رہا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے یا پھر خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہیے۔“

اس نے گلی سے آنکھیں موند کر صوفے سے لپک لگا لی۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو چکا تھا۔

جعفر صوفے پر نیم دراز نہ جانے کب سو گیا تھا۔ اس کے منہ پر کتاب تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اس کے فون کی بیل بجی۔ اس نے بے زاری سے فون اٹھا کر اسکرین دیکھا تو یوں چٹکا کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کال ریسیڈ کر کے جلدی سے بولا۔

”لیس مائرہ، تم، اس وقت؟“

”ہاں، میں اور کیا اس وقت میں تمہیں فون نہیں کر سکتی؟“ مائرہ نے عام سے لہجے میں کہا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس وہ تم بھی جانتی ہو۔“ اس نے الجھتے ہوئے جواب دیا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

”دیکھو! ہم بہت اچھے دوست ہیں اور دوستوں میں غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اچھے دوست تو وہی ہوتے ہیں نا۔ اپنی غلط فہمیاں دور کر لیں۔ اس میں کوئی شرمندگی والی بات نہیں ہے۔“

”کیا چاہتی ہو تم؟“ جعفر نے اسی الجھن میں پوچھا تو مائرہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ ہم دونوں نے جو اپنے دل میں چھپا چھپا کر باتیں رکھی ہوئی ہیں، وہ ہمیں ایک دوسرے سے کہہ دینی چاہئیں۔ ہمارے درمیان کوئی نیا تعلق بننا ہے یا نہیں۔ اہمیت اس کی نہیں بلکہ ہمارے لئے اہم یہ ہونا چاہیے کہ ہماری دوستی پہ کوئی حرف نہ آئے۔“

”اگر تم ایسا سوچتی ہو تو پھر میرے ضمیر پر جو اتنا بوجھ ہے دو اترا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیں یہ طے کرنا ہو گا کہ آخر ہمارے

”بہت برا کہہ رہے ہیں لوگ۔“ ماسٹر دین محمد نے

کہا۔

”بالکل ہی، جب وہ اسٹے گاؤں میں اس کے اصرار  
اصرار میں پھریں گے ساتھ ساتھ دکھائی دیں گے تو یہی  
سوچیں گے تاکہ ان میں کوئی خاص ہی تعلق ہے۔“ اس  
حادثے نے ماسٹر کے بدلتے چہرے کو دیکھا اور پھر جلدی  
سے بولی، ”خیر اس وقت تو مجھے جلدی ہے میں پھر آؤں  
کی گھر جب تفصیل سے بات کروں گی۔ اللہ حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ماسٹر چند لمحے وہیں من  
کھڑا رہا پھر قدم بڑھاتا ہوا چل دیا۔ اس کی چال میں  
قلقلہ تھا تو نہیں رہا تھا۔

ماسٹر دین محمد صحن میں آکر چار پانی پر ڈھے جانے  
والے انداز میں بیٹھا۔ سسکی مچن میں تھی، وہ پانی کا گلاس  
لے کر آئی اور وہ اسے تھمتے ہوئے پوچھا۔

”ابا جی! ناشتہ لادو، آپ کے لئے؟“

”نہیں پتر! تو بس میرے لئے ایک چائے کی  
پتی لے آ۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سسکی نے گہری  
نگاہوں سے دیکھا اور پھر دھیرے سے اپنے چوپ کے  
پاس بیٹھ کر پوچھا۔

”ابا جی! کیا بات ہے، آپ نے ٹھیک طرح سے  
بات نہیں کی، آپ کا لہجہ آپ کا ساتھ نہیں دے رہا، کیا  
ہوا؟“

”کچھ نہیں پتر۔ بعض اوقات انسان ایسے موڑ پر  
آن کھڑا ہوتا ہے جہاں پر لفظ گنگ ہو کر رہ جاتے  
ہیں۔ کہنے والی بات بھی کہی نہیں جاسکتی۔“ ماسٹر دین محمد  
نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو سسکی بولی۔

”ابا جی! الکی کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے بھی  
کہہ نہیں پا رہے ہیں؟ مجھے نہیں یاد پہلے بھی ایسا وقت ہم  
پر آیا ہو کہ ہم بات ہی نہ کر سکیں۔“

”یہ بات ہی ایسی ہے پتر! بتانا بھی چاہتا ہوں

سے پوچھا تو اس عورت نے انتہائی طعنیہ لہجے میں کہا۔

”بھئی کہ ایک جہان جہان لڑکا آپ کے گھر میں  
رہتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور اگر اسے رکھنا آپ کی  
مجبوری ہے کہ وہ آپ باپ بیٹی کو کھانا پلاتا ہے، روپیہ  
پیر دیتا ہے تو پھر آپ کیوں نہیں فہد کی شادی سسکی سے کر  
دیتے؟“

یہ سن کر ماسٹر دین محمد چونک گیا۔ اس نے خود پر قابو  
رکھا اور بڑے تحمل سے پوچھا۔

”ایسا کون کہتا ہے؟“

”سارے گاؤں والے۔ کسی کی زبان تو نہیں روکی  
جاسکتی۔ ویسے آپ کو پریشان ہونا بھی نہیں چاہیے، یہ  
صلاح ہے بھی ٹھیک۔ نہ ہنگ گئے نہ پھگری، رنگ بھی  
چو کھا آئے۔ کوئی خرچہ نہیں اور بیٹی بیاہ دو۔ فہد گھر خرابی  
بھی رہے گا۔“ اس عورت کے لہجے میں طعنیہ کے ساتھ  
حقارت بھی تھی۔ سسکی ماسٹر دین محمد نے تحمل سے جواب  
دیا۔

”یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں بالکل غلط کہہ رہے  
ہیں۔“

”دیکھیں نا ماسٹر جی آپ سیالے بندے ہیں، بھلا  
بتائیں جو ان جہان لڑکی گھر میں ہے تو پھر جب ایک  
جوان جہان لڑکا گھر میں جب چاہے آئے، جب چاہے  
جائے کوئی روک ٹوک نہیں تو پھر اس پر اگر لوگ باتیں  
بتائیں، وہ کیسے غلط ہو گئیں بھلا؟“

”فہد میرے بیٹوں کی طرح ہے۔“ ماسٹر دین محمد  
نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا حالانکہ اسے شدید غصہ آ رہا  
تھا بھی وہ عورت تنک کر بولی۔

”ہوگا، پر سگا تو نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا، اس کا  
کون سا اپنا گھر نہیں ہے پھر کیوں دن رات آپ کے  
گھر میں پڑا رہتا ہے؟ اب یہ مت کہئے گا کہ وہ سسکی پر اپنی  
دوست نہیں دار رہا۔“

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور یہ تم اس اجنبی لہجے میں مجھ سے بات کر رہی ہو؟“ فہد نے چونک کر پوچھا تو سہلی نے اسی کمر در سے لہجے میں جواب دیا۔  
”فہد! میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن جب بات میری عزت تک آئے گی تو وہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ صاف لفظوں میں کہو۔“ فہد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو سہلی بولی۔  
”یہی کہ آپ اب اس گھر میں مت آیا کریں۔“  
اس نے بڑی مشکل سے کہا جس پر فہد نے اسے غور سے دیکھا اور بڑے قہر سے کہا۔

”سہلی! میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں؟ گھر تمہارا ہے تم کہہ رہی ہو لیکن بس مجھے اتنا بتا دو کیا استاد جی بھی ایسا ہی چاہتے ہیں؟“

”ہاں، وہ بھی چاہتے ہیں۔“ اس نے بہ مشکل کہا تو فہد چند لمحے خاموشی کے بعد پوچھا۔

”سہلی! میں سمجھ لوں کہ وہ جنگ جو ہم لڑ رہے تھے، کیا اب مجھے وہ تہاڑا ہو گیا؟“

”نہیں، میں آپ کے ساتھ برابر کھڑی ہوں۔ اس وقت تک جب تک ہمیں کامیابی نہیں مل جاتی یا پھر میرا وجود ختم ہو جائے گا۔“

”میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ میں جانتا ہوں تعلق کے لئے ملنا ضروری تو نہیں ہوتا۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ اس نے لمحہ بھر کو اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور مڑ کر چلا گیا۔ سہلی نے ایک بار ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا لیکن پھر خود پر قابو پا کر رک گئی۔ فہد بڑھتا ہوا دروازہ پار کر گیا تو سہلی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جبکہ فہد سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔

فہد اپنے گھر میں بستر پر لیٹا بہت اندر دگی سے

نہیں کہہ نہیں پار ہا ہوں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”آپ کہہ دیں اور آپ کو یہ بات کہنا ہوگی۔ کیا میں آپ کے کرب کا اندازہ نہیں کر سکتی؟“ سہلی نے دگی لہجے میں کہا تو ماسٹر دین محمد بہت مشکل سے بولا۔

”تو پھر سنو!“ یہ کہہ کر اس نے عورت والی بات سہلی سے کہہ دی۔ سہلی نے بڑے قہر سے بات سن کر کہا۔

”اباجی! جب سے فہد آیا ہے مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ آپ فہد سے کچھ نہیں کہیں گے، میں خود اس سے بات کر لوں گی۔“

”کیا کہو گی اس سے؟“ مجھے اس کی ناراضگی کا ڈر نہیں لیکن ان حالات میں اس کا دل نہیں ٹوٹنا چاہیے۔  
ہمارے سوا اس کا ہے کون، یہاں پر؟ وہ دشمنوں سے ہمدرد آ رہا ہے اس وقت۔“ ماسٹر دین محمد نے سسکتے ہوئے کہا تو سہلی نے اسے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

”میں سمجھتی ہوں اباجی! مجھے کیا کرنا۔ میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔“ سہلی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی اور ماسٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ ان کے لئے ایک نیا امتحان تھا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ ملک نعیم کے ہاں سے واپسی پر فہد ماسٹر دین محمد کو خوشخبری دینا چاہتا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو سندان گھر وید کر ایک لمحے کو ٹھکا۔ وہ انگلی میں کار کی چابی گھمایا رہا تھا اسے روک کر اس نے سندان والا کو دیکھا۔ ابھی ابھی چہرہ لئے سہلی اندر سے والاں میں آئی۔ فہد طویل سانس لے کر والاں میں چلا گیا پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ آج معمول سے ہٹ کر اتنی خاموشی کیوں ہے۔“ استاد جی کہہ رہے ہیں؟“

”آگئے آپ؟“ سہلی نے اجنبی لہجے میں پوچھا۔

اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے تمہارے یہاں آ کر چلے جانے کو بہت مس کیا۔ فہد نے کہا تو مائرہ ایک دم سے ٹھٹھکتے ہوئے بولی۔

”واؤ! جی فہد! ایسے مجھے بھی بڑی تشنگی محسوس ہوئی۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔ تمہارے پاس آئی بھی اور تم سے اتنی ڈیڑھ ساری باتیں بھی نہ کر سکی۔ اپنی ہاؤ کیسے ہو تم؟“

”مائرہ! کیا تم کسی ایسے انسان کے احساسات کا تعین کر سکتی ہو جیسے صرف اپنی ذات کو منوانا ہو بلکہ اسے اپنوں کے وقار کو بھی تسلیم کرنا ہو۔ شاید تم اسے دماغی خلل قرار دو۔ مگر سچ یہی ہے۔ من کی دنیا کے تقاضے عجیب ہوتے ہیں ہے نا، میں بس ایسا ہی ہوں۔“ فہد نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو مائرہ بولی۔

”پہلے تو نہیں لیکن اب سمجھ رہی ہوں۔ تم نے خود اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ تو اس کی ایک معقول وجہ ہے تمہارے پاس۔ میں سمجھتی ہوں۔“

”تم سمجھ گئی ہو مائرہ! میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ میں ایسے حالات میں گھرا ہوا ہوں، یہ تو طے ہے کہ میں جنگ ہار کر یہاں سے بھاگنے والا نہیں ہوں۔ بلکہ خود کو فنا کر دینے تک سب سے پہلے گھرا ہوا ہوں۔“ فہد کے لہجے میں وہی عزم تھا، جسے وہ پہلے بھی محسوس کر چکی تھی۔ اس لئے سکون سے پوچھا۔

”کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”ہاں، بہت کچھ اتنا کہ جتنا کوئی بھی نہ کر سکے۔ بس تم اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔“ فہد نے خلوص سے کہا تو وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

”فہد! میں نے ایک پلان بنایا ہے۔ وہ میں نے جعفر سے بھی ڈسکس کیا ہے۔ اس بارے میں چند دن بعد میں تمہیں بتاؤں گی۔“ اس نے جذباتی انداز میں

سوچتا چلا جا رہا تھا کہ یہ سلی کو کیا ہوا؟ اس کا لہجہ اس قدر جھنجھی کیوں ہو گیا تھا۔ کسی نے سازش کی ہے یا کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے؟ کیا ہوا اس کو، کم از کم مجھے بتانا تو چاہئے تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہا۔ کوئی بات ہوئی؟ معلوم تو ہونا چاہئے۔ اس کے خیالات کا تانا بانا چھاکے کے آ جانے سے ٹوٹ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی بولا۔

”او فہد! یاد رکھو اپنا فون چلا کر، وہ موبائل فون چالو ہو گیا ہے ہمارے علاقے میں۔“

”اچھا کب؟“ فہد نے کہا اور قریب پڑا فون اٹھا کر اسے آن کر دیا۔ سگنل آرہے تھے۔ اس دوران چھاکا بتاتا چلا گیا۔

”ابھی میں آ رہا تھا تو لوگ ہاتھیں کر رہے تھے۔ ٹارو والے اسے چلا گئے ہیں۔ یاد رکھئے بھی چلانا سکھا دے۔“

”ہاں یاد آ گئے ہیں سگنل۔ چل ٹو جائے بنا بھر میں تجھے بتاتا ہوں، یہ کیسے چلتا ہے۔“ فہد نے کہا تو چھاکا کمرے سے چلا گیا۔ فہد نے ایک لمبے کے لئے سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے نمبر پیش کرنے لگا۔

اس وقت مائرہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی سوچوں میں گم تھی۔ اس کا فون بجا تو اس نے دیکھا پھر چونک کر فون ریسیو کر لیا۔

”ہیلو، فہد! تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟“

”اپنے گاؤں قسمت مگر سے مائرہ! میرے گاؤں سے نکل کر ہوا میں سرسرا نے والی پہلی آواز تمہارے نام ہے۔“ فہد نے خوشگوار موڈ میں کہا تو مائرہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اوہ! فون سروں شروع ہو گئی، وہاں۔ اچھا لگا، مجھے بہت اچھا لگا، تم نے مجھے کال کی۔“

”کچھ ایسی ہی خوشی میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔“

"پھر تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور ماسٹر دین محمد یا سہلی وہ کہاں مانیں گے۔" رانی نے گھبراتے ہوئے کہا۔  
 "وہ نہ بھی مانیں لیکن بات جب ضد کی آ جائے تو یہ چوہدری تلخ نقصان نہیں دیکھتے۔" بشری بیگم نے ایسے لہجے میں کہا جسے اسے بہت افسوس ہو رہا ہو۔

"ہاں ایسے تو ہے، پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ ٹکا چوہدری تو اپنی ضد کا پکا ہے۔" رانی نے کہا۔  
 "بہت کچھ ہو سکتا ہے رانی، بہت کچھ، جب تک فہد ہے۔ سہلی پر کوئی آج نہیں آئے گا۔ یہ میں جانتی ہوں۔ ہاں اگر فہد نہ رہا تو شاید حالات بدل جائیں۔ اس لئے فہد کی سلامتی بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری۔" بشری بیگم نے حتمی لہجے میں کہا تو رانی بولی۔

"آپ کو پتہ ہے چوہدرانی جی، وہ فہد حویلی والوں کے کتنا خلاف ہو رہا ہے اور پھر بھی آپ؟"  
 "ہاں پھر بھی، اب ہمیں ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ تو میرا ایک کام کر۔" بشری بیگم نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو رانی بولی۔  
 "جی چوہدرانی جی! بولیں۔"

"کسی ڈر پیچے سے کسی طرح میری ملاقات فہد سے کروا دے، میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" بشری بیگم نے کہا تو رانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔  
 "چوہدرانی جی! آپ کہتی ہیں تو میں کچھ کرتی ہوں۔"

بشری بیگم نے گہرا سانس لیا اور پھر باہر دیکھنے لگی۔ حیرت زدہ ہی رانی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

رانی اسی دوپہر سراج کے ڈیرے پر جا پہنچی۔ سراج اور رانی دونوں کھیت کی منڈ حیر پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ (جاری ہے)

یوں کہا جیسے رودے گی۔ پھر خود پر ٹکا بو پا کر بولی، "اچھا میں اب فون بند کرتی ہوں میں بعد میں کدوں گی۔" اس نے ایک دم سے فون بند کر دیا تھا۔ فہد نے حیرت سے سیل فون کو دیکھا پھر دھیرے سے مسکرا کر فون ایک جانب رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

بشری بیگم حویلی میں ایک کھڑکی کے پاس کھڑی، دیکھ کر تو باہر رہی تھی لیکن گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے رانی کے آنے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ جبکہ رانی اسے یوں ساکت دیکھ کر چونک گئی۔ وہ کچھ اور ہی تھی، اس لئے تیزی سے بولی۔

"چوہدرانی جی، چوہدرانی جی چوہدرانی جی۔"  
 اس کے یوں خوف زدہ لہجے پر بشری بیگم نے چونکتے ہوئے رانی کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"آں ہاں..... کیا بات ہے؟"

"چوہدرانی جی! خیر تو ہے ناں؟ میں نے پہلے کبھی آپ کو اتنا پریشان نہیں دیکھا۔ کہیں کے چوہدری کی وجہ سے تو..... پر یہ کون سا نئی بات ہے۔ وڈھے چوہدری سب سنبھال لیں گے۔" رانی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔  
 "نہیں، بات وہ نہیں جو تم سمجھتی ہو۔ میں تو اس کی اس ضد کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جو اس نے ماسٹر دین محمد کی بیٹی کے لئے کی ہے۔ وہ نہیں جانتا۔ یہ ضد اس کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔" بشری بیگم نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو رانی بولی۔

"میں نے تو سنا ہے چوہدرانی جی۔ ٹکا چوہدری اس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں، بڑی پرانی بات ہے۔"

"محبت ہی تو نہیں کرتا وہ اس سے۔ اگر محبت کرتا ہوتا تو حالات ایسے نہ بنتے۔ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔" بشری بیگم نے دکھ سے کہا۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپیوٹر سڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

